قرآنی سورتوں کا
پسِ منظر اور تعارف

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

قرآنی سورتوں کا
پسِ منظر اور تعارف

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

بار اوّل ——— ستمبر ۱۹۸۲ء ——— ۲۰۰۰

قیمت : =/۳۰ روپے

مطبوعہ
جمال آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

اِن گزارشوں کے عنوان میں لفظ "مقدّمہ" دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدّمہ لکھ رہا ہوں۔ یہ قرآن کا نہیں، تفہیم القرآن کا مقدّمہ ہے اور اس کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر دو مقصد ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کا مُطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک عام ناظر اُن باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کو ابتداء ہی میں سمجھ لینے سے فہمِ قرآن کی راہ آسان ہو جاتی ہے، ورنہ یہ باتیں دورانِ مطالعہ بار بار کھٹکتی ہیں اور بسا اوقات محض اِن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں تک معانیِ قرآن کی سطح ہی پر گھومتا رہتا ہے، گہرائی میں اُترنے کا راستہ اُسے نہیں ملتا۔

دوم یہ کہ ان سوالات کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے جو قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت بالعموم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ میں اِس مقدّمہ میں صرف اُن سوالات کا جواب دوں گا جو خود میرے ذہن میں اوّل اوّل پیدا ہوئے تھے، یا جن سے بعد میں مجھ کو سابقہ پیش آیا۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سوالات بھی جواب طلب باقی رہ گئے ہوں تو ان سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اُن کا جواب انشاء اللہ آئندہ اشاعت کے موقع پر اس مقدّمہ میں بڑھا دیا جائے گا۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح

پہلے موضوع کا تعین ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فصلوں میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی، اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے، بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان تک نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ و ما بعد الطبیعیات ہیں تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں۔ انسان اور موجوداتِ عالم کا ذکر ہے تو علومِ طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدّن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے، تو علومِ عمران کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اصولِ قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف۔ اخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اُس کا انداز جدا۔ یہ سب اپنے سابق کتابی تصوّر کے خلاف پاکر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مرتب، غیر مربوط، منتشر کلام ہے جو اوّل سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شذرات پر مشتمل ہے، مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے اور موافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقے سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی "نظریۂ شذرات" کو قبول کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنی آفرینیوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے جو قائل کے منشاء کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدّعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں ان میں یہ چیزیں

بہ آسانی مل جاتی ہیں اس لیے اُن کے مضامین کی تہہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دوسری کتابوں میں انہیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیت لے کر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کتاب کے موضوع، مدعا اور مرکزی مضمون کا سُراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اُسے کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے اور اکثر مقامات پر اُس کی عبارت کا پس منظر بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی رُوح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نکات و فوائد پر قناعت کرلینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کرکے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انہیں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاقِ عبارت میں بالکل بے جوڑ محسوس ہوتی ہیں، متعدد مقامات پر تعبیرات اور اسلوبِ بیان کی ناواقفیت انہیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے نزول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا موضوعِ گفتگو کیا ہے؟ اس کی ساری بحث کس مدعا کے لیے ہے؟ کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرزِ استدلال اور کیا طرزِ بیان اس نے اپنے مدعا کے لیے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی دوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پاکر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان مبادی سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کرتا ہے کہ وہ "مذہب کے موضوع پر ایک کتاب" پڑھنے چلا ہے۔ "مذہب کا موضوع" اور "کتاب" ان دونوں کا تصور اس کے ذہن میں وہی ہے جو بالعموم "مذہب" اور "کتاب" کے متعلق ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر جب وہاں اسے اپنے ذہنی تصور سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کرسکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی تصنیف دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل

مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمہارے ذہن کا وہ "کتابی" سانچہ جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمہاری مدد نہ کرے گا بلکا الٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خصوصیات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہوجانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے:۔

۱۔ خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اِس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں، بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی، تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری Autonomy دے کر اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲۔ اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کردی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو، جو ہدایت میں بھیجوں اِس کے مطابق دنیا میں کام کرو اور دُنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کروگے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن واطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤگے تو میں تمہیں ابدی راحت ومسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے رویّہ پر چلوگے جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزہ چکھنا ہوگا اور دُنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤگے، تو ابدی رنج ومصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤگے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳۔ یہ فہمائش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اوّلین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ

اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔ ان کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیعِ خدا (مسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رویّوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مسخ بھی کر ڈالا، انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیے ہوئے علم حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انہوں نے خدا کے مقرّر کیے ہوئے عادلانہ اُصولِ اخلاق و تمدّن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴۔ خدا نے جو محدود خود اختیاری انسان کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مُطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رویّہ کی طرف موڑ دیتا اور اپنے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مہلت اس نوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرّر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ جو کام ابتدائے آفرینش سے اس نے اپنے ذمّہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی مُہلتِ عمل کے دَوران میں اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا چنانچہ اپنی خود عائد کردہ ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمائندہ بنایا، اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے، اُن کو علمِ حقیقت بخشا، انہیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا اور انہیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵۔ یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزارہا برس تک اُن کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رویّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدّن کے وہ ازلی و ابدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کو منظم کر کے ایک ایسی امّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جد و جہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اس

مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنھوں نے اُسے قبول کر کے اُمّتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی، وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

۶۔ آخر کار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ اُن کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح رویّہ کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت وہدایت کو قبول کر لیں انہیں ایک ایسی اُمّت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے ــــ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی تھی۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مدعا کیا ہے۔

اس کا **موضوع** انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظِ حقیقتِ نفس الامری اُس کی فلاح اور اُس کا خسران کس چیز میں ہے۔

اس کا **مرکزی مضمون** یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور دنیوی زندگی کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں، اور اُن نظریات کی بنا پر جو رویّے اختیار کر لیے ہیں وہ سب حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویّہ درست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم "صحیح رویّہ" کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کا **مدعا** انسان کو اس صحیح رویّہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

ان تین بنیادی اُمور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط ومنسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی

ساخت پر، انسان کی خلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گذری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے۔ مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح کرتا ہے، اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفس الامری کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلافِ حقیقت رویّہ کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے، اور اس رویّہ کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اُس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدّعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ اِن چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ "دعوت" کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرزِ بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس کی کیفیتِ نزول کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بیک وقت اسے لکھ کر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اسے شائع کر کے ایک خاص رویّۂ زندگی کی طرف بلائیں۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنّفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اُسلوب۔ دراصل اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عرب کے شہر مکّہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں۔

ایک یہ کہ پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردوپیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے اُن کا رویّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رویّہ کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اُصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں، نہایت پُراثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے

مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی تاکہ دلوں میں یہ بول تیرو نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنّم کی وجہ سے ان کی طرف متوجّہ ہوں، اور زبانیں ان کے حُسنِ تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جارہی تھیں عالم گیر صداقتیں مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انہی کی تاریخ، انہی کی روایات، انہی کے روزمرّہ مشاہدہ میں آنے والے آثار اور انہی کی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا، اور اس مرحلے میں نبی کریمؐ کی تبلیغ کا ردِّ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا:۔

۱۔ چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے امّتِ مُسلمہ بننے کے لیے تیّار ہو گئے۔

۲۔ ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقے کی محبّت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

۳۔ مکّہ اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اِس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اس تحریک اور پُرانی جاہلیت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کش مکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّہ میں، نہ صرف قبیلہ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تل گئے۔ انہوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام النّاس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم ڈھائے، ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور ہوئے اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدّت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی بھتیجے، بیٹے بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ جو لوگ پرانی جاہلیت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نوخیز تحریک کی طرف آرہے تھے وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد تو وہ اتنے نیک، اتنے راست باز اور

اتنے پاکیزہ اخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دُنیا اِس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انہیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اِس طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالےٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی اِن خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی، اِن کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدو جہد کرنے پر ابھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جس کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گذر ہوتا تھا۔ توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں انکی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خود اختیاری اور انکارِ آخرت اور تقلید آبائی کی غلطیاں، ایسے بیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شبہہ کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک الجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دوسروں کو الجھانے کی کوشش کرتے تھے صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیت کو اتنا تنگ پکڑا گیا کہ عقل و خرد کی دنیا میں اس کے لیے ٹھیرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا اُن کے بُرے اخلاق اور غلط طریقِ زندگی اور جاہلانہ رسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انہیں ملامت کی گئی، اور اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اُصول اُن کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدو جہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوع بڑھتا گیا ــــ یہ ہے قرآن مجید کی مکی زندگی کا پس منظر۔

مکے میں اِس تحریک کو اپنا کام کرتے ہوئے تیرہ سال گذر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ گیا جہاں اس کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ عرب کے تمام حصّوں سے اپنے پیرووں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کر لے۔ چنانچہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور بیشتر متبعین اسلام ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ اِس طرح یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا، اُمّتِ مسلمہ باقاعدہ ایک ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے مسلح مقابلہ شروع ہوا۔ پچھلے انبیاءؑ کی اُمّتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود اُمّتِ مُسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھُس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور دس سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ تحریک کامیابی کی اِس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیرِ نگیں ہو گیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھُل گئے۔ اس مرحلے کی بھی مختلف منزلیں تھیں اور ہر منزل میں اِس تحریک کی مخصوص ضرورتیں تھیں۔ اِن ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تدریس کا، اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور مدنیتِ صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شعبوں کو کن اصول و ضوابط پر قائم کیا جائے، منافقین سے کیا سلوک ہو، ذمّی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہلِ کتاب سے تعلقات کی کیا نوعیت رہے، برسرِ جنگ دشمنوں اور مُعاہد قوموں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، اور منظم اہلِ ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوندِ عالم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپکو کس طرح تیار کرے۔ ان تقریروں میں ایک طرف مسلمان کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہہ کی جاتی تھی، ان کو راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر ابھارا جاتا تھا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا، اور انہیں اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کو جو دائرہ ایمان سے باہر تھے، اہلِ کتاب، منافقین و کفّار و مشرکین، سب کو انکی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ ان پر حجت تمام کر دی جائے۔

یہ ہے قرآن مجید کی مَدَنی سورتوں کا پس منظر۔

اِس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تیئیس سال کی مدّت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گذرتی رہی، ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصّے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصّے نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے، اِس لیے ان کا اسلوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اُسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے، ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم ابھارنا، دشمنوں کو دوست اور منکروں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور اُن کی اخلاقی طاقت کا استیصال کر دینا، غرض اُسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کے لیے ضروری ہے۔ اِس لیے اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں ان کا طرزِ خطاب وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسبِ حال ہوتا ہے، ان میں کالج کے لیکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی اس قدر تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اُس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں۔ اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا اعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جاتا رہے تو کان انہیں سنتے سنتے تھک جاتے ہیں اور طبیعتیں اکتانے لگتی ہیں۔ اِس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انہیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اسلوب اور نئی آن بان سے کہا جائے تاکہ نہایت خوش گوار طریقے سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی

بنیاد جن عقائد اور اصولوں پر ہوا انہیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کا اعادہ بہرحال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان سب میں بالعموم ایک ہی قسم کے مضامین، الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور اس کی باز پرس اور جزا و سزا، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکل اور اسی قسم کے دوسرے بنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی اِن سے غفلت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بنیادی تصوّرات اگر ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو اسلام کی یہ تحریک اپنی روح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مرتب کر دیا جس کے ساتھ وہ نازل ہوا تھا۔

اُوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تیئیس سال تک قرآن کا نزول اس ترتیب سے ہوتا رہا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا ارتقاء ہوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دعوت کی تکمیل کے بعد ان نازل شدہ اجزاء کے لیے وہ ترتیب کسی طرح درست نہ ہو سکتی تھی جو صرف اِرتقاءِ دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اب تو اُن کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ ابتدا میں اس کے مخاطبِ اوّل وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے، اِس لیے اس وقت بالکل نقطۂ آغاز سے تعلیم و تلقین شروع کی گئی۔ مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اُس کے مخاطبِ اوّل وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لاکر ایک امت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمّہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبر نے نظریے اور عمل دونوں حیثیتوں سے مکمل کر کے ان کے حوالے کیا تھا۔ اب لامحالہ مقدم چیز یہ ہو گئی کہ پہلے یہ لوگ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے اور اُن فتنوں سے جو پچھلے پیغمبروں کی اُمتوں میں رُونما ہوتے رہے ہیں اچھی طرح واقف ہو لیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

علاوہ بریں قرآن مجید جس طرز کی کتاب ہے اسے اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اس پر خود ہی یہ حقیقت مُنکشف ہو جائے گی کہ ایک ایک طرح کے مضامین کو ایک ایک جگہ جمع کر ان کتاب کے مزاج ہی سے مُطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے مزاج کا تو تقاضا یہی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے سامنے مدنی مرحلے کی باتیں مکّی دورِ والی تعلیم کے درمیان، اور مکّی مرحلے کی باتیں مدنی دورِ والی

تقریروں کے درمیان، اور ابتدائی گفتگوئیں آخر کی تلقینات کے بیچ میں بھی آخری دور کی ہدایات آغازِ کار کی تعلیمات کے پہلو میں بار بار آتی چلی جائیں، تاکہ اسلام کا پورا منظر اور جامع نقشہ اسکی نگاہ میں رہے اور کسی وقت بھی وہ یک رُخا نہ ہونے پائے۔

پھر اگر قرآن کو اس کی نزولی ترتیب پر مرتب کیا بھی جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لیے صرف اسی صورت میں بامعنی ہو سکتی تھی جبکہ قرآن کے ساتھ اس کی "تاریخ نزول" اور اس کے ایک ایک جزء کی کیفیتِ نزول و شانِ نزول لکھ کر لگادی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہ بات اس مقصد کے خلاف تھی جس کے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے کلام کا مجموعہ مرتب اور محفوظ کرایا تھا۔ وہاں تو پیشِ نظر چیز ہی یہ تھی کہ خالص کلامِ الٰہی، بغیر کسی دوسرے کلام کی آمیزش یا شمول کے اپنی مختصر صورت میں مرتب ہو جسے بچے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہر حالت میں پڑھیں، اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اُس کا خدا اُس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد فوت ہو جاتا اگر اس مجموعۂ کلام کے ساتھ ایک لمبی چوڑی تاریخ بھی لگی ہوئی ہوتی اور اس کی تلاوت بھی لازم کر دی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں وہ اس کتاب کے مقصد و مدعا سے صرف نابلد ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ یہ کتاب محض علمِ تاریخ اور فلسفۂ عمران کے طلبہ ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ترتیبِ قرآن کے سلسلے میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہوئی نہیں ہے بلکہ خود اللہ تعالےٰ کی ہدایت کے تحت نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہی نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تو آپ اسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلم بند کرانے کے لیے ہدایت فرما دیتے کہ یہ سورۃ فلاں سورۃ کے بعد اور فلاں سورۃ سے پہلے رکھی جائے۔ اسی طرح اگر قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا جس کو مستقل سورۃ بنانا پیشِ نظر نہ ہوتا تو آپ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں مقام پر درج کیا جائے۔ پھر اسی ترتیب سے آپ خود بھی نمازمیں اور دوسرے مواقع پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق صحابۂ کرام بھی اس کو یاد کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا نزول جس روز مکمل ہوا اسی روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہو گئی۔ جو اس کا نازل کرنے والا تھا وہی اس کا مرتب کرنے والا تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا اسی کے ہاتھوں اسے مرتب بھی کرایا گیا۔ کسی دوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرے۔

چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمانوں پر فرض [1] تھی۔ اور تلاوتِ قرآن کو ایک ضروری جزء قرار دیا گیا تھا، اسلیے نزولِ قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری ہوگیا اور جیسے جیسے قرآن اترتا گیا مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف کھجور کے اُن پتوں اور ہڈی اور جھلّی کے ان ٹکڑوں ہی پر نہ تھا جن پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبوں سے اس کو قلم بند کرایا کرتے تھے، بلکہ وہ اترتے ہی بیسیوں، پھر سینکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہوجاتا تھا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان ہی نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ بھی ردّوبدل کرسکے۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور اس کو فرو کرنے کے لیے صحابہ کرام ؓ کو سخت خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں تو ان معرکوں میں ایسے صحابہ ؓ کی ایک کثیر تعداد شہید ہوگئی جن کو پورا قرآن حفظ تھا۔ اس سے حضرت عمر ؓ کو خیال پیدا ہوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعہ پر اعتماد کرلینا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ الواحِ قلب کے ساتھ ساتھ صفحاتِ قرطاس پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کرلینا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کی ضرورت انہوں نے حضرت ابوبکر ؓ پر واضح کی اور انہوں نے کچھ تامّل کے بعد اس سے اتفاق کرکے حضرت زید بن ثابت انصاری ؓ کو جو نبی ؐ کے کاتب (سکریٹری) رہ چکے تھے اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ تمام لکھے ہوئے اجزاء فراہم کرلیے جائیں جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں، دوسری طرف صحابۂ کرام ؓ میں سے بھی جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصّہ لکھا ہوا ملے، وہ ان سے لے لیا جائے، [2] اور پھر حفاظِ قرآن سے بھی مدد لی جائے اور ان تینوں ذرائع کی متفقہ شہادت پر کامل صحت کا اطمینان کرنے کے بعد قرآن کا ایک ایک لفظ مصحف میں ثبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآن مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کرکے اُمّ المومنین حضرت حفصہ ؓ کے ہاں رکھوا دیا گیا اور لوگوں کو عام اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کرے اور جو چاہے اس سے مقابلہ کرکے اپنے نسخے کی تصحیح کرے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں ویسے ہی فرق پائے جاتے تھے جیسے ہمارے ملک میں شہر شہر کی بولی اور ضلع ضلع کی بولی میں فرق ہے، حالانکہ زبان سب کی وہی ایک اُردو یا پنجابی یا بنگالی وغیرہ ہے۔ قرآن مجید اگرچہ نازل اس زبان میں ہوا تھا جو مکّہ میں قریش کے لوگ بولتے تھے،

---

[1] واضح رہے کہ پنج وقتہ نماز تو بعثت کے کئی سال بعد فرض ہوئی، لیکن نماز بجائے خود اوّل روز ہی سے فرض تھی۔ اسلام کی کوئی ساعت کبھی ایسی نہیں گذری ہے جس میں نماز فرض نہ ہو۔ [2] معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ؐ کی زندگی میں متعدد صحابہ ؓ نے قرآن کو یا اس کے مختلف اجزاء کو اپنے پاس قلم بند کرکے رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرات عثمان ؓ، علی ؓ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، سالم مولیٰ حذیفہ، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، اُبی بن کعب، اور ابوزید قیس بن السکن رضی اللہ عنہم کے ناموں کی تصریح ملتی ہے۔

لیکن ابتداءً اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ دوسرے علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق اُسے پڑھ لیا کریں، کیونکہ اس طرح معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، صرف عبارت اُن کے لیے ملائم پڑجاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصّے کو فتح کر لیا اور دوسری قوموں کے لوگ بھی دائرۂ اسلام میں آنے لگے اور بڑے پیمانے پر عرب و عجم کے اختلاط سے عربی زبان متاثر ہونے لگی تو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر اب بھی دوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو غیر مانوس طریقے پر کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے سنے گا اور یہ سمجھ کر اس سے لڑ پڑے گا کہ وہ دانستہ کلام الٰہی میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ کہ یہ لفظی اختلافات رفتہ رفتہ واقعی تحریفات کا دروازہ کھول دیں گے۔ یا یہ کہ عرب و عجم کے اختلاط سے جن لوگوں کی زبان بگڑے گی وہ اپنی بگڑی ہوئی زبان کے مطابق قرآن میں تصرف کر کے اس کے حسنِ کلام کو بگاڑ دیں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عثمان رضؓ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام ممالکِ اسلام میں صرف اِس معیاری نسخہ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکر رضؓ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، اور باقی تمام دوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مصاحف کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ ٹھیک ٹھیک اسی مصحفِ صدیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمان رضؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام دیار و امصار میں بھجوائی تھیں اس وقت بھی دُنیا میں متعدد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ کسی کو اگر قرآن کی محفوظیت میں ذرہ برابر بھی شک ہو تو وہ اپنا اطمینان اِس طرح کر سکتا ہے کہ مغربی افریقہ میں کسی کتاب فروش سے قرآن کا ایک نسخہ خریدے اور جاوا میں کسی حافظ سے زبانی قرآن سُن کر اس کا مقابلہ کرے، اور پھر دُنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں حضرت عثمان رضؓ کے وقت سے لے کر آج تک مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے جو مصاحف رکھے ہیں ان سے اس کا تقابل کرے اگر کسی حرف یا شوشے کا فرق وہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ دنیا کو اس سب سے بڑے تاریخی انکشاف سے ضرور مطلع کرے۔ کوئی شک نواز قرآن کے مُنزّل مِنَ اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے یہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یہ تو ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی دُوسری چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس قدر قطعی الثبوت ہو، اگر کوئی شخص اُس کی صحت میں شک کرتا ہے تو وہ پھر اس میں بھی شک کر سکتا ہے کہ رومن امپائر نامی کوئی سلطنت دنیا میں رہ چکی ہے، اور کبھی مغل ہندوستان پر حکومت کر چکے ہیں، اور نپولین نام کا کوئی شخص بھی دنیا میں پایا گیا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حقائق پر شکوک کا اظہار کرنا علم کا نہیں، جہالت کا ثبوت ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف دنیا میں بے شمار انسان بے شمار مقاصد لے کر رجوع کرتے ہیں۔ ان سب کی ضروریات اور اغراض کو پیش نظر رکھ کر کوئی مشورہ دینا آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طالبوں کے اس ہجوم میں مجھ کو صرف ان لوگوں سے دلچسپی ہے جو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ یہ کتاب انسان کے مسائل زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں یہاں طریق مطالعۂ قرآن کے بارے میں کچھ مشورے دوں گا اور کچھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کروں گا جو بالعموم انسان کو اس معاملہ میں پیش آتی ہیں۔

کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہرحال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اوّلین کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات اور نظریات سے، اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کرے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں، قرآن کی ان کو ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ یہ طریق مطالعہ کسی کتاب کو پڑھنے کے لیے بھی صحیح نہیں ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ قرآن تو اس طرز کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے معانی کے دروازے کھولتا ہی نہیں۔

پھر جو شخص محض سرسری سی واقفیت بہم پہنچانا چاہتا ہو اس کے لیے تو شاید ایک دفعہ پڑھ لینا کافی ہو جائے، لیکن جو اس کی گہرائیوں میں اترنا چاہے اس کے لیے دو چار دفعہ کا پڑھنا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کو بار بار پڑھنا چاہیے، ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنا چاہیے اور ایک طالب علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہیے تاکہ ضروری نکات نوٹ کرتا جائے۔ اس طرح جو لوگ پڑھنے پر آمادہ ہوں ان کو کم از کم دو مرتبہ پورے قرآن کو صرف اس غرض کے لیے پڑھنا چاہیے کہ ان کے سامنے بحیثیت مجموعی وہ پورا نظام فکر و عمل آجائے جسے یہ کتاب پیش کرنا چاہتی ہے۔ اس ابتدائی مطالعہ کے دوران میں وہ قرآن کے پورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ یہ کتاب کیا بنیادی تصورات پیش کرتی ہے اور پھر ان تصورات پر کس قسم کا نظام زندگی تعمیر کرتی ہے۔ اس اثناء میں اگر کسی مقام پر کوئی سوال ذہن میں کھٹکے تو اس پر وہیں اسی وقت کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں، اسے نوٹ کر لیں اور صبر کے ساتھ آگے مطالعہ جاری رکھیں۔ اغلب یہ ہے کہ آگے کہیں نہ کہیں انہیں اس کا جواب مل جائے گا۔ اگر جواب مل جائے تو اپنے سوال کے ساتھ اسے نوٹ کر لیں۔ لیکن اگر پہلے مطالعہ کے دوران میں انہیں اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملے تو صبر کے ساتھ دوسری بار پڑھیں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ دوسری بار کے غائر مطالعہ میں شاذ و نادر ہی کوئی سوال جواب طلب باقی رہ جاتا ہے۔

اس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کر لینے کے بعد تفصیلی مطالعہ کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اس

سلسلے میں ناظر کو تعلیماتِ قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ مثلاً: وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسانیت کا کون سا نمونہ ہے جسے قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور کس نمونے کے انسان اس کے نزدیک مبغوض و مردود ہیں۔ اِس مضمون کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لانے کے لیے اس کو چاہیے کہ اپنی کاپی پر ایک طرف "پسندیدہ انسان" اور دوسری طرف "ناپسندہ انسان" کی خصوصیات آمنے سامنے نوٹ کرتا چلا جائے۔ یا مثلاً وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فلاح و نجات کا مدار کن امور پر ہے اور کیا چیزیں ہیں جن کو وہ انسان کے لیے نقصان اور ہلاکت اور بربادی کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس مضمون کو بھی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کاپی پر موجباتِ فلاح اور موجباتِ خسران کے دو عنوانات ایک دوسرے کے مقابل قائم کرے اور مطالعۂ قرآن کے دوران میں روزانہ دونوں قسم کی چیزوں کو نوٹ کرتا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس عقائد، اخلاق، حقوق، فرائض، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، قانون، نظمِ جماعت، صلح، جنگ، اور دوسرے مسائلِ زندگی میں سے ایک ایک کے متعلق قرآن کی ہدایت کو آدمی نوٹ کرتا چلا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ ان میں سے ہر ہر شعبے کی مجموعی شکل کیا بنتی ہے اور پھر ان سب کو ملا کر جوڑ دینے سے پورا نقشۂ زندگی کس قسم کا بنتا ہے۔

پھر جب آدمی کسی خاص مسئلۂ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے کہ قرآن کا نقطۂ نظر اسکے متعلق کیا ہے، تو اس کے لیے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اس مسئلے کے متعلق قدیم و جدید لٹریچر کا گہرا مطالعہ کر کے واضح طور پر یہ معلوم کرے کہ اس مسئلے کے بنیادی نکات کیا ہیں، انسان نے اب تک اس پر کیا کچھ سوچا اور سمجھا ہے، کیا امور اس میں تصفیہ طلب ہیں اور کہاں جا کر انسانی فکر کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اسکے بعد انہی تصفیہ طلب مسائل کو نگاہ میں رکھ کر آدمی کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح جب آدمی کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسی ایسی آیتوں میں ___ اپنے سوالات کا جواب ملتا ہے جنہیں وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوتا ہے اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہاں یہ مضمون بھی چھپا ہوا ہے۔

لیکن فہمِ قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی رُوح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نِری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اِس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں جیسا کہ اس مقدمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عُزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علم برداران کفر و فسق و

ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے اِن سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اِس طویل و جاں گسل کشمکش کے دَوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو۔ اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت اِلی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقینِ اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں "سلوکِ قرآنی"، کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی و تمدّنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔

قرآن کے اس دعوے سے ہر کوئی واقف ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا روئے سخن زیادہ تر اپنے زمانۂ نزول کے اہلِ عرب کی طرف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بنی آدم اور عامۃ النّاس کو بھی پکارتا ہے، لیکن اکثر باتیں وہ ایسی کہتا ہے جو

عرب کے مذاق، عرب ہی کے ماحول عرب ہی کی تاریخ اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلق رکھتی ہیں ان چیزوں کو دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ جو چیز عام انسان کی ہدایت کے لیے اتاری گئی تھی اس میں وقتی اور مقامی اور قومی عنصر اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ چیز اصل میں تو اپنے ہم عصر اہلِ عرب ہی کی اصلاح کے لیے تھی لیکن بعد میں زبردستی کھینچ تان کر اسے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کتابِ ہدایت قرار دے دیا گیا۔

جو شخص یہ اعتراض محض اعتراض کی خاطر نہیں اٹھاتا بلکہ فی الواقع اسے سمجھنا چاہتا ہے اسے میں مشورہ دوں گا کہ وہ پہلے خود قرآن کو پڑھ کر ذرا ان مقامات پر نشان لگائے جہاں اس نے کوئی ایسا عقیدہ یا خیال یا تصور پیش کیا ہو، یا کوئی ایسا اخلاقی اصول یا عملی قاعدہ و ضابطہ بیان کیا ہو جو صرف عرب ہی کے لیے مخصوص ہو، اور جس کو وقت اور زمانے اور مقام نے فی الواقع محدود کر رکھا ہو، محض یہ بات کہ وہ ایک خاص مقام اور زمانے کے لوگوں کو خطاب کر کے ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم کی تردید کرتا ہے اور انہی کے گرد و پیش کی چیزوں کو موادِ استدلال کے طور پر لے کر توحید کے دلائل قائم کرتا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی دعوت اور اس کا اپیل بھی وقتی اور مقامی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شرک کی تردید میں جو کچھ وہ کہتا ہے کیا وہ دنیا کے ہر شرک پر اسی طرح چسپاں نہیں ہوتا جس طرح مشرکینِ عرب کے شرک پر چسپاں ہوتا ہے کیا انہی دلائل کو ہم ہر زمانے اور ہر ملک کے مشرکین کی اصلاحِ خیال کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟ اور کیا اثباتِ توحید کے لیے قرآن کے طرزِ استدلال کو تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر وقت، ہر جگہ کام میں نہیں لایا جا سکتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک عالمگیر تعلیم کو صرف اس بنا پر وقتی و مقامی قرار دیا جائے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص قوم کو خطاب کر کے وہ پیش کی گئی تھی۔ دنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظامِ زندگی اور کوئی مذہبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کی ساری باتیں از اوّل تا آخر تجریدی طرزِ بیان میں پیش کی گئی ہوں اور کسی متعین حالت یا صورت پر اس کو چسپاں کر کے ان کی توضیح نہ کی گئی ہو۔ ایسی مکمل تجرید اوّل تو ممکن نہیں ہے اور ممکن ہو بھی تو جو چیز اس طریقے پر پیش کی جائے گی وہ صرف صفحۂ کاغذی پر رہ جائے گی، انسانوں کی زندگی میں اس کا جذب ہو کر ایک عملی نظام میں تبدیل ہونا محال ہے۔

پھر کسی فکری و اخلاقی اور تمدنی تحریک کو اگر بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانا مقصود ہو تو اس کے لیے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مفید بھی نہیں ہے کہ شروع سے اس کو بالکل ہی بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جائے، درحقیقت اس کا صحیح عملی طریقہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن افکار اور نظریات اور اصولوں پر وہ تحریک انسانی زندگی کے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے، انہیں پوری قوت کے ساتھ خود اس ملک میں پیش کیا جائے جہاں سے اس کی دعوت اٹھی ہو، ان لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے جن کی زبان اور مزاج

اور عادات وخصائل سے اس تحریک کے داعی بخوبی واقف ہوں، اور پھر اپنے ہی ملک میں ان اصولوں کو عملاً برت کر اور ان پر ایک کامیاب نظام زندگی چلا کر دنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا جائے تبھی دوسروں قوموں میں اس کی طرف توجہ کریں گی اور ان کے ذہین آدمی خود آگے بڑھ کر اسے سمجھنے اور اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا محض یہ بات کہ کسی نظام فکر وعمل کو ابتداءً ایک ہی قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور استدلال کا سارا زور اسی کو سمجھانے اور مطمئن کرنے پر صرف کر دیا گیا تھا، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نظامِ فکر وعمل محض قومی ہے۔ فی الواقع جو خصوصیات ایک قومی نظام کو ایک بین الاقوامی نظام سے، اور ایک وقتی نظام کو ایک ابدی نظام سے ممیز کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قومی نظام یا تو ایک قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حقوق کا مدعی ہوتا ہے یا اپنے اندر کچھ ایسے اُصول اور نظریات رکھتا ہے جو دوسری اقوام میں نہیں چل سکتے۔ اس کے برعکس جو نظام بین الاقوامی ہوتا ہے وہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ اور برابر کے حقوق دینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور اس کے اصولوں میں بھی عالمگیریت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقتی نظام لازمی طور پر اپنی بنیاد کچھ ایسے اصولوں پر رکھتا ہے جو زمانے کی چند پلٹیوں کے بعد صریحاً ناقابلِ عمل ہو جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک ابدی نظام کے اصول تمام بدلتے ہوئے حالات پر منطبق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر کوئی شخص خود قرآن کو پڑھے اور ان چیزوں کو ذرا متعین کرنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر واقعی یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ قرآن کا پیش کردہ نظام وقتی اور قومی ہے۔

قرآن کے متعلق یہ بات بھی ایک عام ناظر کے کان میں پڑی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ایک مفصل ہدایت نامہ اور ایک کتابِ آئین ہے۔ مگر جب وہ اسے پڑھتا ہے تو اس میں معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت وغیرہ کے تفصیلی احکام وضوابط اس کو نہیں ملتے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے متعلق بھی، جن پر قرآن بار بار اس قدر زور دیتا ہے، اس نے کوئی ایسا ضابطہ تجویز نہیں کیا ہے جس میں تمام ضروری احکام کی تفصیل درج ہو۔ یہ چیز بھی آدمی کے ذہن میں خلجان پیدا کرتی ہے کہ آخر یہ کس معنی میں ہدایت نامہ ہے۔

اس معاملے میں ساری الجھن صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہ سے حقیقت کا ایک پہلو بالکل اوجھل رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اگر اصل اسکیم یہ ہو کہ بس ایک نقشۂ تعمیر لوگوں کو دے دیا جائے اور لوگ اس کے مطابق خود عمارت بنالیں، تو اس صورت میں بلاشبہ تعمیر کے ایک ایک جزء کی تفصیل ہم کو ملنی چاہیے۔ لیکن جب تعمیری ہدایات کے ساتھ ایک انجینئر بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دے تو پھر انجینئر اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو نظر انداز کر کے صرف نقشے ہی میں تمام جزئیات کی تفصیل تلاش کرنا اور پھر اُسے نہ پا کر نقشے کی ناتمامی کا شکوہ کرنا غلط ہے۔ قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اُصول اور کلیات کی کتاب ہے۔ اس کا اصل کام یہ ہے کہ نظامِ اسلامی کی فکری اور اخلاقی بنیادوں کو پوری

وضاحت کے ساتھ نہ صرف پیش کرے بلکہ عقلی استدلال اور جذباتی اپیل، دونوں کے ذریعے سے خوب مستحکم بھی کردے۔ اب رہی اسلامی زندگی کی عملی صورت، تو اس معاملے میں وہ انسان کی رہنمائی اس طریقے سے نہیں کرتا کہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتائے، بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حدودِ اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالٰی کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے۔ ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا، نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں مامور ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی سیرت و کردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھا دیں جو قرآن کے دیے ہوئے اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

ایک اور سوال جو بالعموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن اُن لوگوں کی انتہائی مذمّت کرتا ہے جو کتاب اللہ کے آجانے کے بعد تفرقے اور اختلاف میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں اور دوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر و تفسیر میں صرف متاخرین ہی نہیں، ائمہ اور تابعین اور خود صحابہؓ تک کے درمیان اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی احکامی آیت ایسی نہ ملے گی جس کی ایک تفسیر بالکل متفق علیہ ہو۔ کیا یہ سب لوگ اس مذمّت کے مصداق ہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہے؟ اگر نہیں تو پھر وہ کون سا تفرقہ و اختلاف ہے جس سے قرآن منع کرتا ہے؟

یہ ایک نہایت وسیع الاطراف مسئلہ ہے جس پر مفصّل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں قرآن کے ایک عامی طالبِ علم کی الجھن دُور کرنے کے لیے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ قرآن اُس صحت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظامِ جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمّت اس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاعِ باہمی تک نوبت پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دوسرے سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی رُوح ہے۔ وہ ہر اس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل و فکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو، اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہو سکتی ہے جو ذہین انسانوں سے نہیں بلکہ لکڑی کے کندوں سے مرکّب ہو۔ رہا دوسری قسم کا اختلاف تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اُٹھایا اس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رونما ہونا صحت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اور اس کے نتائج کبھی کسی اُمّت کے حق میں بھی مفید نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں قسم کے اختلافات کا فرق واضح طور پر یوں سمجھیے کہ :-

ایک صورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسول کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے، اور پھر دو عالم کسی جزوی مسئلے کی تحقیق میں یا دو قاضی کسی مقدمے کے فیصلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کریں، مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو اور اس میں اپنی رائے کو مدارِ دین بنائے اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کریں، اور یہ بات رائے عام پر یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظام جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے یہ کہ کوئی عالم مفتی یا صوفی یا متکلم یا لیڈر کسی ایسے مسئلے میں جس کو خدا اور رسول نے دین کا بنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا۔ ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو دین کا بنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اس سے اختلاف کرے اس کو خارج از دین و ملت قرار دے اور اپنے حامیوں کا ایک جتھا بنا کر کہے کہ اصل امتِ مسلمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنمی ہیں، اور ہانک پکار کر کہے کہ مسلم ہے تو بس اس جتھے میں آ جا ورنہ تو مسلم ہی نہیں ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے اس سے اس کی مراد یہ دوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف، تو اس کی متعدد مثالیں خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آ چکی ہیں، اور آپ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اسلیے کہ وہ اختلاف تو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جماعت میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس اور فہم و تفقّہ کی صلاحیتیں موجود ہیں، اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اس کے احکام سے دلچسپی ہے، اور ان کی ذہانتیں اپنے مسائلِ زندگی کا حل دین کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں، اور جماعت بحیثیت مجموعی اس زرّین قاعدے پر عامل ہے کہ اصول میں متفق رہ کر اپنی وحدت برقرار رکھے اور پھر اپنے اہلِ علم و فکر کو صحیح حُدود کے اندر تحقیق و اجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔

هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ط

اس مقدمے میں تمام ان مسائل کا استقصاء کرنا میرے پیشِ نظر نہیں ہے جو مطالعۂ قرآن کے دوران میں ایک ناظر کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوالات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی آیت یا سورۃ کے سامنے آنے پر ذہن کو کھٹکتا ہے، اور اس کا جواب تفہیم القرآن میں برسرِ موقع دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے سوالات کو چھوڑ کر میں نے یہاں صرف ان جامع مسائل سے بحث کی ہے جو بحیثیت مجموعی پورے قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرین کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدمے کو دیکھ کر ہی اس کے تشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کریں۔ بلکہ پوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں۔ یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔

الفاتِحَۃ

نام اِس کا نام " الفاتحہ " اِس کے مضمون کی مناسبت سے ہے۔ " فاتحہ " اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون یا کتاب یا کسی شے کا افتتاح ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ نام " دیباچہ " اور آغازِ کلام کا ہم معنی ہے۔

زمانۂ نزول یہ نبوّت محمدیؐ کے بالکل ابتدائی زمانہ کی سُورت ہے۔ بلکہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمل سُورت جو محمدؐ پر نازل ہوئی وہ یہی ہے۔ اِس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سورۂ علق، سورۂ مُزّمّل اور سُورۂ مدّثر وغیرہ میں شامل ہیں۔

مضمون دراصل یہ سُورہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہر اُس انسان کو سکھائی ہے جو اس کی کتاب کا مطالعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوند عالم سے یہ دعا کرو۔

انسان فطرۃً دُعا اُسی چیز کی کیا کرتا ہے جس کی طلب اور خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے۔ اور اُسی صورت میں کرتا ہے جبکہ اُسے یہ احساس ہو کہ اس کی مطلوب چیز اُس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دُعا کر رہا ہے۔ پس قرآن کی ابتدا میں اِس دُعا کی تعلیم دے کر گویا انسان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو راہِ راست کی جستجو کے لیے پڑھے، طالبِ حق کی سی ذہنیت لے کر پڑھے اور یہ جان لے کہ علم کا سرچشمہ خداوندِ عالم ہے، اس لیے اسی سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔

اِس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مقدمہ کا سا نہیں بلکہ دُعا اور جوابِ دُعا کا سا ہے۔ سُورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اُس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔

البقرۃ

نام اور وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام "بقرہ" اس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مالدار ہے، مگر بہرحال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سورۃ کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ "وہ سورۃ جس میں گائے کا ذکر آیا ہے۔"

زمانۂ نزول

اس سورۃ کا بیشتر حصّہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوا ہے، اور کمتر حصّہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبتِ مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا حتیٰ کہ سُود کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اُتری تھیں۔ سُورہ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اسی سُورۃ میں ضم کر دیا گیا ہے۔

شانِ نزول

اِس سُورۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے اِس کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکینِ عرب سے تھا جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے اُن کے نبی موسیٰ ؑ پر نازل ہوا تھا۔ اور اُصولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا[1]۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود توراۃ کو اُنہوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معنیً محفوظ تھا اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی رُوح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی، اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اِصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انہیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، مُوشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام "مسلم" تک بھول گئے تھے، محض "یہودی" بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں، چنانچہ سُورۂ بقرہ

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰ کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ نے سنہ ۱۲۷۲ قبل مسیح میں وفات پائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۶۱۰ بعد مسیح میں منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی اُمت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ صرف اُصُولِ دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا۔ مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اُصولی ہدایات دینی شروع کیں اور بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظامِ زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورۃ کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ انہی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسبِ ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے۔ مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینہ میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے اور انہوں نے ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم کر لی تو صورتِ حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دوسری طرف تمام عرب اس کا استیصال کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ اوّلاً وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً وہ مخالفین کا برسرِ باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرہن کر دے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں

شبہ نہ رہے گا۔ ثالثاً بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، بلکہ پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مسلح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے۔ اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمائش سے قبول نہ کریں، تو انہیں جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تامل نہ ہو۔ —— اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں ان پانچوں امور کے متعلق ابتدائی ہدایت دی ہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلہ میں ایک نیا عنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، اور یہ منافقین کا عنصر تھا۔ اگرچہ نفاق کے ابتدائی آثار مکہ کے آخری زمانہ میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہاں صرف اس قسم کے منافق پائے جاتے تھے جو اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی، اور اپنے دُنیوی تعلقات کا انقطاع اور اُن مصائب و شدائد کو بھی برداشت کر لیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ برپا کرنے کے لیے جماعت مسلمین میں داخل ہو جاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اسلامی جماعت کے دائرۂ اقتدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفینِ اسلام سے بھی ربط رکھیں تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے متمتع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردد تھے انہیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا، مگر چونکہ ان کے قبیلے یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے

اس لیے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امرِ حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے مگر جاہلیت کے طریقے اور اوہام اور رسمیں چھوڑنے اور اخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔

سورۂ بقرہ کے نزول کے وقت ان مختلف اقسام کے منافقین کے ظہور کی محض ابتدا تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں۔ بعد میں جتنی جتنی اِن کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں اُسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سُورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

آلِ عمران

نام

اس سورت میں ایک مقام پر "آلِ عمران" کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اور اجزائے مضمون

اس میں چار تقریریں شامل ہیں۔

پہلی تقریر آغازِ سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے اور وہ غالباً جنگِ بدر کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوئی ہے۔

دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ۹ھ میں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی۔

تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختمِ سورت تک جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔

خطاب اور مباحث

اِن مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے، وہ مقصد و مدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔ سورت کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) دوسرے وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۂ بقرہ میں شروع کیا گیا

تھا۔ اُن کی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بلا رہا ہے، جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاء دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرت اللہ کے مطابق ایک ہی دین حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستہ سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں، وہ خود اُن کتابوں کی رو سے بھی صحیح نہیں ہیں، جن کو تم کتبِ آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔

دوسرے گروہ کو، جواب بہترین اُمت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا۔ انہیں پچھلی اُمتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے بچیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہل کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے تھے انہیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر بھی متوجہ کیا گیا ہے، جن کا ظہور جنگ اُحد کے سلسلہ میں ہوا تھا۔

اس طرح یہ سورت نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزا میں مسلسل و مربوط ہے، بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مقام بقرہ سے متصل ہی ہے۔

شانِ نزول

سورت کا تاریخی پس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمائشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت متنبہ کر دیا گیا تھا، وہ پوری شدت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں۔ جنگِ بدر میں اگرچہ اہل ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی، لیکن یہ جنگ گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی ہم معنی تھی۔ اس اوّلین مسلح مقابلے نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا، جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینے کی یہ چھوٹی سی بستی، جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے، صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ ان حالات کا

مدینے کی معاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اوّل تو ایک چھوٹے سے قصبے میں جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آجانے ہی سے معاشی توازن بگڑ چکا تھا۔ اس پر مزید مصیبت اس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہوگئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دُوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دِلا دِلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نَضِیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کے ہمسایگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آرہے تھے، اُن کا پاس و لحاظ بھی انہوں نے اُٹھا دیا۔ آخر کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حد برداشت سے گزر گئیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قَیْنُقاع پر، جو ان یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور اُنہیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دُوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ انہوں نے مدینے کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ خود نبی ﷺ کی جان کے متعلق ہر طرف یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابہ کرام اس زمانے میں بالعموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شبخون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی ﷺ اگر تھوڑی دیر کے لیے کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابہ کرام گھبرا کر آپ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکّے سے تین ہزار کا لشکرِ جرار مدینے پر حملہ آور ہو گیا اور اُحد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی، جو جنگِ اُحد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینے سے نکلے تھے۔ مگر راستے میں سے

تین سو منافقین یکایک الگ ہو کر مدینے کی طرف پلٹ گئے۔ اور جو سات سو آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے، ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی، جس نے دَورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی، جس کی اخلاقی تربیت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دُوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس جنگ کی پوری سرگزشت پر ایک مفصّل تبصرہ کیا جائے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں، ان میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے، جو دُنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

النِّسَآء

زمانۂ نزول اور اجزاءِ مضمون

یہ سُورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ھ کے اواخر سے لے کر ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعیّن کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہوتی ہیں اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہداء کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں، اُن کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہوں گی۔

روایات میں صلوٰۃِ خوف (عین حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر ہمیں غزوۂ ذات الرِّقاع میں ملتا ہے جو ۴ھ ہجری میں ہُوا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانہ میں وہ خطبہ نازل ہُوا ہو گا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے (رکوع ۱۵)

مدینہ سے بنی نَضیر کا اخراج ربیع الاول ۴ھ میں ہُوا اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانہ ہی میں نازل ہُوا ہو گا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ "ایمان

لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔"

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوۂ بنی المُصطلِق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ھ میں ہوا اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمم کا ذکر ہے اسی سے متصل عہد کا سمجھنا چاہیے (رکوع ۷)

شانِ نزول اور مباحث

اس طرح بحیثیتِ مجموعی سُورہ کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ سورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد لی جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو کام تھا اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک اُس نئی منظم اسلامی سوسائٹی کا نشو و نما جس کی بنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پُرانے طریقوں کو مٹا کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تدبیرِ مملکت کے نئے اُصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دُوسرے اُس کشمکش کا مقابلہ جو مشرکینِ عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالفِ اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدت سے جاری تھی۔ تیسرے اسلام کی دعوت کو اِن مزاحم طاقتوں کے علی الرغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انہی تین شعبوں سے متعلق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سُورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائیٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سُورۂ نساء کے اِن خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریقے پر کس طرح درست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اُصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حقوق معین کیے گئے۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ معاشی معاملات کی درستی کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرزِ عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم و ضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ اہلِ کتاب کے اخلاقی و مذہبی رویّہ پر

تبصرہ کرکے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنی اِن پیش رو اُمتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرزِ عمل پر تنقید کرکے سچی ایمانداری کے مقتضیات واضح کیے گئے۔ اور ایمان و نفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کرکے رکھ دیا گیا۔

مخالفِ اصلاح طاقتوں سے جو کشمکش برپا تھی اُس نے جنگِ اُحد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و نواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں، اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں بہت بڑھادی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُرجوش خطبوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے اُبھارا، اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انہیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینہ میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کرلیں اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سریّوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو دونوں کے بجائے تیمم کرلیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو وہاں صلوٰۃِ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کُن تھا۔ اِس مسئلہ میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں۔ دُوسری طرف اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا تاکہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آجائیں۔

یہودیوں میں سے بنی نضیر کا رویہ خصوصیت کے ساتھ نہایت معاندانہ ہو گیا تھا اور وہ معاہدات کی صریح خلاف ورزی کرکے کھُلم کھُلا دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے اِن کی اس روش پر سخت گرفت کی گئی اور انہیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کردی گئی۔ اس کے بعد ہی مدینہ سے اُن کا اخراج عمل میں آیا۔

منافقین کے مختلف گروہ مختلف طرزِ عمل رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کے منافقوں کے متعلق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا چاہیے۔

غیر جانبدار معاہد قبائل کے ساتھ جو رویہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا اس کو بھی واضح کیا گیا۔

سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کیرکٹر بے داغ ہو کیونکہ اس کشمکش میں یہ مٹھی بھر جماعت اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاقِ فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کمزوری بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سُورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام جس اخلاقی و تمدنی اصلاح کی طرف دنیا کو بُلا رہا تھا، اس کی توضیح کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تصوّرات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سُورہ میں تنقید کر کے ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

المآئدة

نام اِس سُورہ کا نام پندرھویں رکوع کی آیت هَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّكَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کے لفظ "مائدہ" سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی بیشتر سُورتوں کے ناموں کی طرح اس نام کو بھی سُورۃ کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں، محض دوسری سُورتوں سے ممیز کرنے کے لیے اُسے علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سُورۃ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صُلحِ حُدَیبیہ کے بعد ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ مگر کفّارِ قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی ردّوکد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارتِ کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں تاکہ آئندہ سال عمرے کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے، اور دوسری طرف انہیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عمرہ سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں، اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبوضات سے گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انہیں زیارتِ کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ یہی تقریب ہے اُس تمہیدی تقریر کی جس سے اس سُورہ کا آغاز ہوا ہے۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلہ کو چھیڑا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودہ رکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مضامین

اس سُورہ میں ہم کو ملتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی دَور کے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سُورۃ ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس سُورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

شانِ نزول

سورۂ آلِ عمران اور سُورۂ نساء کے زمانۂ نزُول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ اُحُد کے صدمہ نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُر خطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آگیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دُوسری طرف حدودِ شام تک، تیسری طرف ساحلِ بحر احمر تک اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اُحُد میں جو زخم مسلمانوں نے کھایا تھا وہ ان کی ہمتیں توڑنے کے بجائے اُن کے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوُا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر کر اُٹھے اور تین سال کی مدّت میں انہوں نے نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان کی مسلسل جدوجہد اور سرفروشیوں کا ثمرہ یہ تھا کہ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔ مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے استیصال ہوگیا اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہل عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی یہ تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حُدُود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کرسکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرۂ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اُصول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق، معاشرت، تمدّن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیّز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز با جماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانینِ دیوانی و فوجداری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پُرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام، اور زنا و قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دُنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدّن بن چکا ہے، پھر کبھی اُن میں آ ملیں گے۔

صُلحِ حُدَیبیہ سے پہلے تک مسلمانوں کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ کفارِ قریش کے ساتھ ایک مسلسل کشمکش میں الجھے ہوئے تھے اور انہیں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کی مُہلت نہ ملتی تھی۔ اِس رُکاوٹ کو حُدَیبیہ کی ظاہری شکست اور حقیقی فتح نے دُور کر دیا۔ اس سے ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی ریاست کے حُدُود میں امن میسّر آ گیا، بلکہ اتنی مہلت بھی مل گئی کہ گرد و پیش کے علاقوں میں اسلام کی دعوت کو لے کر پھیل جائیں۔ چنانچہ اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، رُوم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور قوموں میں اسلام کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بُلانے کے لیے پھیل گئے۔

مباحث

یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سُورہ حسبِ ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدّنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اِس سلسلہ میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے گئے، شعائر اللہ کے احترام اور زائرینِ کعبہ سے عدم تعرّض کا

حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کے قطعی حُدُود قائم کیے گئے اور دورِ جاہلیت کی خودساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معیّن کی گئیں، شراب اور جوئے کو قطعی حرام کر دیا گیا، قسم توڑنے کا کفّارہ مقرر کیا گیا، اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت۔ اب چونکہ مسلمان ایک حکمراں گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی، جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دور خاتمہ پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمائش کے دَور میں وہ قدم رکھ رہے تھے۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رَو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انہوں نے کیا ہے اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصارٰی کی طرح اس کو توڑ کر اُس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کے پابند رہیں، اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئی تھیں۔ اِس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رویّہ پر متنبہ کیا گیا ہے اور انہیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز چونکہ صلح حُدَیبیہ کی وجہ سے عرب اور متصل ممالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غلطیاں بتائی گئی ہیں اور انہیں نبیِ عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمسایہ ممالک میں سے جو قومیں بُت پرست اور مجوسی تھیں ان کو براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ اُن کی ہدایت کے لیے وہ خطبات کافی تھے جو اُن کے ہم مسلک مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے مکّہ میں نازل ہو چکے تھے۔

الانعام

نام

اِس سورہ کے رکوع ۱۶ و ۱۷ میں بعض انعام (مویشیوں) کی حُرمت اور بعض کی حِلّت کے متعلق اہلِ عرب کے توہمات کی تردید کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "الانعام" رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

ابنِ عباس کی روایت ہے کہ یہ پوری سُورہ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت مُعاذ بن جَبَل کی چچازاد بہن اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ "جب یہ سُورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی تھی اس وقت آپ اُونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئی تھی اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔" روایات میں اس کی بھی تصریح ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات کو آپ نے اُسے قلم بند کرا دیا۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سُورۃ مکّی دَور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی۔ حضرت اسماء بنت یزید کی روایت بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوفہ انصار میں سے تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائیں۔ اگر قبولِ اسلام سے پہلے محض بر بناءِ عقیدت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکّہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپ کی مکّی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے اہلِ یثرب کے ساتھ آپ کے تعلقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

شانِ نزول

زمانۂ نزول متعیّن ہو جانے کے بعد ہم بآسانی اس پس منظر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ خطبہ ارشاد ہؤا ہے۔ اس وقت اللہ کے رسُول کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی اسلام

قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم وستم سے عاجز آکر ملک چھوڑ چکی تھی اور حبش میں مقیم تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے نہ ابوطالب باقی رہے تھے اور نہ حضرت خدیجہ، اس لیے ہر دُنیوی سہارے سے محروم ہو کر آپ شدید مزاحمتوں کے مقابلہ میں تبلیغِ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آپ کی تبلیغ کے اثر سے مکہ میں اور گرد و نواح کے قبائل میں بھی صالح افراد پے در پے اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، لیکن قوم بحیثیتِ مجموعی رد و انکار پر تُلی ہوئی تھی۔ جہاں کوئی شخص اسلام کی طرف ادنیٰ میلان بھی ظاہر کرتا تھا اسے طعن و ملامت، جسمانی اذیت اور معاشی و معاشرتی مقاطعہ کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں صرف ایک ہلکی سی شعاع یثرب کی طرف سے نمودار ہوئی تھی جہاں سے اوس اور خزرج کے بااثر لوگ آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور جہاں کسی اندرونی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس حقیر سی ابتدا میں مستقبل کے جو امکانات پوشیدہ تھے انہیں کوئی ظاہر بیں آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ بظاہر دیکھنے والوں کو جو کچھ نظر آتا تھا وہ بس یہ تھا کہ اسلام ایک کمزور سی تحریک ہے جس کی پشت پر کوئی مادّی طاقت نہیں، جس کا داعی اپنے خاندان کی ضعیف سی حمایت کے سوا کوئی زور نہیں رکھتا، اور جسے قبول کرنے والے چند مٹھی بھر بے بس اور منتشر افراد اپنی قوم کے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر اس طرح سوسائٹی سے نکال پھینکے گئے ہیں جیسے پتے اپنے درخت سے جھڑ کر زمین پر پھیل جائیں۔

مباحث

اِن حالات میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے اور اس کے مضامین کو سات بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شرک کا ابطال اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت

(۲) عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے،

(۳) جاہلیت کے اُن توہمات کی تردید جن میں لوگ مبتلا تھے،

(۴) اُن بڑے بڑے اُصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا تھا،

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب،

(۶) طویل جدوجہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام

مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس پر تسلی،

(۷) منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت و سرشاری اور نادانستہ خودکشی پر نصیحت، تنبیہ اور تہدید۔

لیکن خطبہ کا انداز یہ نہیں ہے کہ ایک ایک عنوان پر الگ الگ یکجا گفتگو کی گئی ہو۔ بلکہ خطبہ ایک دریا کی سی روانی کے ساتھ چلتا جاتا ہے اور اس کے دَوران میں یہ عنوانات مختلف طریقوں سے بار بار چھڑتے ہیں اور ہر بار ایک نئے انداز سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

مکی زندگی کے ادوار

یہاں چونکہ پہلی مرتبہ ناظرین کے سامنے ایک مفصل مکی سورہ آرہی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم مکی سورتوں کے تاریخی پس منظر کی ایک جامع تشریح کردیں، تاکہ آئندہ تمام مکی سورتوں کو، اور ان کی تفسیر کے سلسلہ میں ہمارے اشارات کو سمجھنا آسان ہو جائے:۔

جہاں تک مدنی سورتوں کا تعلق ہے، ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانۂ نزول معلوم ہے یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی تو بکثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے۔ لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصل ذرائع معلومات موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نزول اور موقعِ نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو۔ کیونکہ اُس زمانہ کی تاریخ اس قدر جزئی تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی ہے جیسی کہ مدنی دَور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکی سُورتوں کے معاملہ میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر اُن اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سُورتوں کے موضوع، مضمون اور اندازِ بیان میں، اور اپنے پس منظر کی طرف اُن کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس نوعیت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سُورۃ اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکی سُورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دُوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سُورۃ کس دَور سے تعلق رکھتی ہے۔

اِس طرزِ تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں

تو وہ دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہم کو چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے:

پہلا دَور، آغازِ بعثت سے لے کر اعلانِ نبوّت تک، تقریباً ۳ سال، جس میں دعوت خفیہ طریقہ سے خاص خاص آدمیوں کو دی جا رہی تھی اور عام اہلِ مکّہ کو اس کا علم نہ تھا۔

دوسرا دَور، اعلانِ نبوت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ Persecution کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی، پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تضحیک، استہزاء، الزامات، سبّ وشتم، جھوٹے پروپیگنڈا اور مخالفانہ جتھہ بندی تک نوبت پہنچی، اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں شروع ہو گئیں جو نسبتہً زیادہ غریب، کمزور اور بے یار ومددگار تھے۔

تیسرا دَور، آغازِ فتنہ (سنہ ۵ نبوی) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات (سنہ ۱۰ نبوی) تک تقریباً پانچ چھ سال۔ اس میں مخالفت انتہائی شدّت اختیار کرتی چلی گئی، بہت سے مسلمان کفارِ مکّہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر حبش کی طرف ہجرت کر گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا معاشی ومعاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور آپ اپنے حامیوں اور ساتھیوں سمیت شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیے گئے۔

چوتھا دَور، سنہ ۱۰ نبوی سے لے کر سنہ ۱۳ نبوی تک تقریباً ۳ سال۔ یہ نبیؐ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی ومصیبت کا زمانہ تھا۔ مکّہ میں آپ کے لیے زندگی دوبھر کر دی گئی تھی، طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی، حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلہ سے آپ اپیل کرتے رہے کہ وہ آپ کی دعوت قبول کرے اور آپ کا ساتھ دے مگر ہر طرف سے کورا جواب ہی ملتا رہا۔ اور ادھر اہلِ مکّہ بار بار یہ مشورے کرتے رہے کہ آپ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ آخر کار اللہ کے فضل سے انصار کے دل اسلام کے لیے کھل گئے اور ان کی دعوت پر آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ان میں سے ہر دَور میں قرآن مجید کی جو سورتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنے مضامین اور اندازِ بیان میں دوسرے دَور کی سورتوں سے مختلف ہیں۔ ان میں بکثرت مقامات پر ایسے اشارات بھی پائے جاتے ہیں جن سے پس منظر کے حالات اور واقعات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ ہر دَور کی خصوصیات کا اثر اُس دَور کے نازل شدہ کلام میں بہت بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ انہی علامات پر اعتماد کر کے ہم آئندہ ہر مکّی سورہ کے دیباچہ میں یہ بتائیں گے کہ وہ مکّہ کے کس دَور میں نازل ہوئی ہے۔

الاعراف

نام اس سورہ کا نام اعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے پانچویں رکوع میں ایک مقام پر اصحاب الاعراف کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے "سورۂ اعراف" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے۔"

زمانۂ نزول اس کے مضامین پر غور کرنے سے بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول تقریباً وہی ہے جو سورۂ انعام کا ہے۔ یہ بات تو یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہے یا وہ، مگر اندازِ تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہے یہ اُسی دَور سے متعلق۔ لہٰذا اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیباچہ پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا جو ہم نے سورۂ انعام پر لکھا ہے۔

مباحث اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدّعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے لیکن اس دعوت میں اِنذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہلِ مکّہ) انہیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو ان سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قبولِ رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان پر حجت تمام ہونے کے قریب

آگئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصّہ میں دعوت کا رُخ اُن سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دُنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دَور جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہوا کرتا ہے، خاتمہ پر آلگا ہے۔

دَورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رُخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اِس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنے، اور سمع وطاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حکمتِ تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور جبرہ دستیوں کے مقابلہ میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

الانفالُ

زمانۂ نزول

یہ سورہ ۲ھ میں جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں اسلام وکفر کی اس پہلی جنگ پر مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، غالباً یہ ایک ہی تقریر ہے جو بیک وقت نازل فرمائی گئی ہوگی، مگر ممکن ہے کہ اس کی بعض آیات جنگِ بدر ہی سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق بعد میں اتری ہوں اور پھر ان کو سلسلۂ تقریر میں مناسب جگہوں پر درج کر کے ایک مسلسل تقریر بنا دیا گیا ہو۔ بہرحال کلام میں کہیں کوئی ایسا جوڑ نظر نہیں آتا جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ یہ الگ الگ دو تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخی پس منظر

قبل اس کے کہ اس سورہ پر تبصرہ کیا جائے، جنگِ بدر اور اس سے تعلق رکھنے والے حالات پر ایک تاریخی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ابتدائی دس بارہ سال میں، جبکہ آپ مکہ معظمہ میں مقیم تھے، اس حیثیت سے اپنی پختگی واستواری ثابت کر چکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت، عالی ظرف اور دانشمند علمبردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرزِ عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اٹل ارادہ رکھتا ہے اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو انگیز کرنے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں خود ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور دماغوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اور جہالت و جاہلیت اور تعصبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے عرب کے پرانے نظامِ جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر، جو ابتداءً اس کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے، مکی دور کے آخری زمانہ میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا

زور اسے کچل دینے میں صرف کر دینا چاہتے تھے لیکن اس وقت تک چند حیثیات سے اِس دعوت میں بہت کچھ کسر باقی تھی :

اوّلاً، یہ بات ابھی پوری طرح ثابت نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ایسے پیرووں کی ایک کافی تعداد پہنچ گئی ہے جو صرف اس کے ماننے والے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے اصولوں کا سچا عشق بھی رکھتے ہیں، اس کو غالب و نافذ کرنے کی سعی میں اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایۂ زندگی کھپا دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لیے، دنیا بھر سے لڑ جانے کے لیے حتیٰ کہ اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی کاٹ پھینکنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگرچہ مکہ میں پیروانِ اسلام نے قریش کے ظلم و ستم برداشت کر کے اپنی صداقتِ ایمانی اور اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کی مضبوطی کا اچھا خاصا ثبوت دے دیا تھا، مگر ابھی یہ ثابت ہونے کے لیے بہت سی آزمائشیں باقی تھیں کہ دعوتِ اسلامی کو جانفروش پیرووں کا وہ گروہ میسّر آگیا ہے جو اپنے نصب العین کے مقابلہ میں کسی چیز کو بھی عزیز تر نہیں رکھتا۔

ثانیاً، اس دعوت کی آواز اگرچہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی، لیکن اس کے اثرات منتشر تھے اس کی فراہم کردہ قوت سارے ملک میں پراگندہ تھی، اس کو وہ اجتماعی طاقت بہم نہ پہنچی تھی جو پرانے جمے ہوئے نظامِ جاہلیت سے فیصلہ کن مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔

ثالثاً، اس دعوت نے زمین میں کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی بلکہ ابھی تک وہ صرف ہوا میں سرایت کر رہی تھی۔ ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ قدم جما کر اپنے موقف کو مضبوط کرتی اور پھر آگے بڑھنے کی سعی کرتی۔ اس وقت تک جو مسلمان جہاں بھی تھا اس کی حیثیت نظامِ کفر و شرک میں بالکل ایسی تھی جیسے خالی معدے میں کُنین کہ معدہ ہر وقت اسے اُگل دینے کے لیے زور لگا رہا ہو اور قرار پکڑنے کے لیے اس کو جگہ ہی نہ ملتی ہو۔

رابعاً، اس وقت تک اس دعوت کو عملی زندگی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ نہ یہ اپنا تمدن قائم کر سکی تھی، نہ اس نے اپنا نظامِ معیشت و معاشرت اور نظامِ سیاست مرتب کیا تھا اور نہ دوسری طاقتوں سے اس کے معاملاتِ صلح و جنگ پیش آئے تھے۔ اس لیے نہ تو ان اخلاقی اصولوں کا مظاہرہ ہو سکا تھا جن پر یہ دعوت زندگی کے پورے نظام کو قائم کرنا اور چلانا چاہتی تھی۔ اور نہ یہی بات آزمائش کی کسوٹی پر اچھی طرح نمایاں ہوئی تھی کہ اس دعوت کا پیغمبر اور

اس کے پیروؤں کا گروہ جس چیز کی طرف دنیا کو دعوت دے رہا ہے اس پر عمل کرنے میں وہ خود کس حد تک راستباز ہے۔

بعد کے واقعات نے وہ مواقع پیدا کر دیے جن سے یہ چاروں کمیاں پوری ہو گئیں۔

مکّی دَور کے آخری تین چار سالوں سے یثرب میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ متعدد وجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ آخر کار نبوّت کے بارھویں سال حج کے موقع پر ۷۵ نفوس کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اہلِ یثرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام و فرمانروا کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بلاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظم معاشرہ بنا لیں۔ اس طرح یثرب نے در اصل اپنے آپ کو "مدینۃ الاسلام" کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنا لیا۔

اس پیش کش کے معنی جو کچھ تھے اس سے اہلِ مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور معاشی و تمدّنی بائیکاٹ کے مقابلہ میں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر رات کی اُس مجلس میں اسلام کے ان اوّلین مددگاروں (انصار) نے اس نتیجہ کو خوب اچھی طرح جان بوجھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ عین اس وقت جبکہ بیعت ہو رہی تھی، یثربی وفد کے ایک نوجوان رکن اسعد بن زُرارہؓ نے، جو پورے وفد میں سب سے کم سن شخص تھے اٹھ کر کہا:

"رویدًا یا اھل یثرب! انا لم نضرب الیہ اکباد الابل الا و نحن نعلم انہ رسول اللہ، وان اخراجہ الیوم منا دأۃ للعرب کافۃ، وقتل خیارکم، وتعضکم

السیوف فاما انتم قوم تصبرون علی ذٰلك فخذوه واجره علی اللّٰه، واما انتم قوم تخافون من انفسکم خیفة فذروه فبینوا ذٰلك فهو اعذر لکم عند اللّٰه

"ٹھیرو اے اہل یثرب! ہم لوگ جو ان کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے اس کے نتیجہ میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔"

اسی بات کو وفد کے ایک دوسرے شخص عباس بن عُبادہ بن نضلہ نے دوہرایا:

اتعلمون علام تبایعون هذا الرجل؟ (قالوا نعم) قال، انکم تبایعونه علی حرب الاحمر والاسود من الناس۔ فان کنتم ترون انکم اذا نهکت اموالکم مصیبة واشرافکم قتلا اسلمتموه فمن الاٰن فدعوه فهو واللّٰه ان فعلتم خزی الدنیا والاٰخرة۔ وان کنتم ترون انکم وافون له بما دعوتموه الیه علی نهکة الاموال وقتل الاشراف فخذوه، فهو واللّٰه خیر الدنیا والاٰخرة۔

"جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ (آوازیں، ہاں، جانتے ہیں) تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔"

اس پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا فانا ناخذه علی مصیبة الاموال وقتل الاشراف

"ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔"

تب وہ مشہور بیعت واقع ہوئی جسے تاریخ میں بیعت عقبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلِ مکہ کے لیے یہ معاملہ جو معنیٰ رکھتا تھا وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ دراصل اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی قابلیتوں سے قریش کے لوگ واقف ہو چکے تھے، ایک ٹھکانا میسر آ رہا تھا اور ان کی قیادت و رہنمائی میں پیروانِ اسلام، جن کی عزیمت و استقامت اور فدائیت کو بھی قریش ایک حد تک آزما چکے تھے، ایک منظم جتھے کی صورت میں مجتمع ہوئے جاتے تھے۔ یہ پرانے نظام کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نیز مدینہ جیسے مقام پر مسلمانوں کی اس طاقت کے مجتمع ہونے سے قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ ساحل بحرِ احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی، جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا وہ مسلمانوں کی زد میں آ جاتی تھی، اور اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان نظامِ جاہلی کی زندگی دشوار کر سکتے تھے۔ صرف اہلِ مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ طائف اور دوسرے مقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔

قریش ان نتائج کو خوب سمجھتے تھے۔ جس رات بیعتِ عقبہ واقع ہوئی اسی رات اس معاملہ کی بھنک اہلِ مکہ کے کانوں میں پڑی اور پڑتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو انھوں نے اہلِ مدینہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑنے کی کوشش کی۔ پھر جب مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے اور قریش کو یقین ہو گیا کہ اب محمدؐ بھی وہاں منتقل ہو جائیں گے تو وہ اس خطرے کو روکنے کے لیے آخری چارۂ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہجرتِ نبویؐ سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی جس میں بڑی ردّ و کد کے بعد آخر کار یہ طے پا گیا کہ بنی ہاشم کے سوا تمام خانوادہ ہائے قریش کا ایک ایک آدمی چھانٹا جائے اور یہ سب لوگ مل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں تاکہ بنی ہاشم کے لیے تمام خاندانوں سے تنہا لڑنا مشکل ہو جائے اور وہ انتقام کے بجائے خونبہا قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں، لیکن خدا کے فضل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد علی اللہ اور حُسنِ تدبیر سے اُن کی یہ چال ناکام ہو گئی اور حضورؐ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ اس طرح جب قریش کو ہجرت کے روکنے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ کو (جسے ہجرت سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر حضورؐ کے مدینہ پہنچ جانے اور اوس و خزرج کی اکثریت کے مسلمان ہو جانے سے پانی پھر چکا تھا) خط لکھا کہ "تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے

لڑو یا اسے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمہارے مَردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔" عبداللہ بن ابی اس پر کچھ آمادۂ شر ہوا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شر کی روک تھام کر دی۔ پھر سعد بن معاذ رئیس مدینہ عُمرے کے لیے مکہ گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے اُن کو ٹوک کر کہا۔ الا اراك تطوف بمكة امنا وقد اويتم الصباة وزعمتم انكم تنصرونهم و تعينونهم؟ لولا انك مع ابی صفوان مارجعت الى اهلك سالما (تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دو اور ان کی امداد و اعانت کا دم بھرو اور ہم تمہیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں۔ اگر تم اُمیّہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ سعد نے جواب میں کہا۔ واللہ لئن منعتنی هذا لامنعنك ماهو اشد عليك منه، طريقك على المدينة (بخدا اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لیے اس سے زیادہ شدید تر ہے یعنی مدینہ پر سے تمہاری رہ گذر) یہ گویا اہلِ مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ زیارت بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے اور اس کا جواب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفینِ اسلام کے لیے پُرخطر ہے۔

اور فی الواقع اُس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ و مزاحمانہ پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوخیز اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم و نسق اور اطراف مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ منعطف فرمائی وہ اسی شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ میں حضورؐ نے دو اہم تدبیریں اختیار کیں۔

ایک یہ کہ مدینہ اور ساحل بحرِ احمر کے درمیان اسی شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرفداری کے معاہدے کر لیں۔ چنانچہ اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی۔ سب سے پہلے جُہَینَہ سے، جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقے میں ایک اہم قبیلہ تھا، معاہدۂ ناطرفداری طے ہوا۔ پھر ۲ھ ہجری کے آخر میں بنی ضَمْرہ سے جن کا علاقہ یَنْبُع اور ذُوالعُشَیرہ

سے متصل تھا۔ دفاعی معاونت Deffencive Alliance کی قرارداد ہوئی پھر ۲ سنہ ہجری کے وسط میں بنی مُدلج بھی اس قرارداد میں شریک ہو گئے کیونکہ وہ بنی ضَمرہ کے ہمسائے اور حلیف تھے۔ مزید براں تبلیغ اسلام نے ان قبائل میں اسلام کے حامیوں اور پیروؤں کا بھی ایک اچھا خاصا عنصر پیدا کر دیا۔

دوسری تدبیر آپؐ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لیے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کیے اور بعض دستوں کے ساتھ آپ خود بھی تشریف لے گئے۔ پہلے سال اس طرح کے چار دستے گئے جو مغازی کی کتابوں میں سریۂ حمزہ، سریۂ عُبیدہ بن حارث، سریۂ سعد بن ابی وقاص اور غزوۃ الاَبواء کے نام سے موسوم ہیںلہ۔ اور دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں دو مزید تاختیں اسی جانب کی گئیں جن کو اہلِ مغازی غزوۂ بُواط اور غزوۂ ذوالعُشیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام مہموں کی دو خصوصیتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے نہ تو کسی میں کشت وخون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رخ بتانا تھا دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی تاخت میں بھی حضورؐ نے اہلِ مدینہ کا کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے خالص مکی مہاجرین سے ہی مرتب فرماتے رہے تاکہ حتی الامکان یہ کش مکش قریش کے اپنے ہی گھروالوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں اُلجھنے سے آگ پھیل نہ جائے۔ اُدھر سے اہلِ مکہ بھی مدینہ کی طرف غارت گرد دستے بھیجتے رہے۔ چنانچہ انہی میں سے ایک دستے نے کُرز بن جابر الفِہری کی قیادت میں عین مدینہ کے قریب ڈاکہ مارا اور اہلِ مدینہ کے مویشی لوٹ لیے۔ قریش کی کوشش اس سلسلے میں یہ رہی کہ دوسرے قبیلوں کو بھی اس کش مکش میں اُلجھا دیں، نیز یہ کہ انہوں نے بات کو محض دھمکی تک محدود نہ رکھا بلکہ لوٹ مار تک نوبت پہنچا دی۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ شعبان ۲ سنہ ہجری (فروری یا مارچ ۶۲۳ سنہ ء) میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار اشرفی کا مال تھا اور تیس چالیس سے زیادہ محافظ نہ

لہ اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں سریہ اس مہم کو کہتے تھے جو نبی کسی صحابی کی قیادت میں بھیجا کرتے تھے اور غزوہ اس مہم کو کہتے تھے جس کی قیادت حضورؐ خود فرماتے تھے۔

تھے، شام سے مکہ کی طرف پلٹتے ہوئے اُس علاقہ میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا۔ چونکہ مال زیادہ تھا، محافظ کم تھے، اور سابق حالات کی بنا پر خطرہ قوی تھا کہ کہیں مسلمانوں کا کوئی طاقتور دستہ اس پر چھاپہ نہ مار دے، اِس لیے سردارِ قافلہ ابوسفیان نے اس پُرخطر علاقہ میں پہنچتے ہی ایک آدمی کو مکہ کی طرف دوڑا دیا، تاکہ وہاں سے مدد لے آئے۔ اُس شخص نے مکہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اونٹ کے کان کاٹے، ناک چیر دی، کجاوے کو اُلٹ کر رکھ دیا اور اپنا قمیص آگے پیچھے سے پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ یا معشر قریش! اللطیمہ اللطیمہ! اموالکم مع ابی سفیان قد عرض لھا محمدٌ فی اصحابہ، لا اری ان تدرکوھا، الغوث، الغوث (قریش والو! اپنے قافلۂ تجارت کی خبر لو، تمہارے مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں، محمدؐ اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہو گیا ہے، مجھے اُمید نہیں کہ تم انہیں پا سکو گے، دوڑو دوڑو مدد کے لیے) اس پر ہیجان بر پا ہو گیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک ہزار مردانِ جنگی جن میں سے ۶۰۰ زرہ پوش تھے اور جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا، پوری شان و شوکت کے ساتھ لڑنے کے لیے چلے۔ اُن کے پیشِ نظر صرف یہی کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچا لائیں بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور مدینہ میں یہ مخالف طاقت جو ابھی نئی نئی مجتمع ہونی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آئندہ کے لیے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے، محسوس فرمایا کہ فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے، اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جبکہ ایک جسورانہ اقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو تحریکِ اسلامی ہمیشہ کے لیے بے جان ہو جائے گی۔ بلکہ بعید نہیں کہ اس تحریک کے لیے سر اُٹھانے کا پھر کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ نئے دار الہجرت میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں، مہاجرین بے سروسامان، انصار ابھی ناآزمودہ، یہودی قبائل برسرِ مخالفت، خود مدینہ میں منافقین و مشرکین کا ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر موجود اور گرد و پیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی۔ ایسے حالات میں اگر قریش مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دبکے بیٹھے رہیں

تب بھی یک لخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اُکھڑے گی کہ عرب کا بچّہ بچّہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مدینہ کے یہودی اور منافقین و مشرکین علی الاعلان سر اُٹھائیں گے' اور دارالہجرت میں جینا مشکل کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب و اثر نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان و مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تامل ہو۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم فرمالیا کہ جو طاقت بھی اس وقت میسّر ہے اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل بوتا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔

اس فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کر کے آپؐ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ساری پوزیشن صاف صاف رکھ دی کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر چلا آ رہا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمہیں مل جائے گا۔ بتاؤ تم کس کے مقابلے پر چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر کچھ اور تھا اس لیے آپؐ نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے مقداد بن عمروؓ نے اٹھ کر کہا۔ یا رسول اللہ! امض لما امرك الله، فانا معك حيثما احببت، لا نقول لك كما بنو اسرائيل لموسٰى اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ولكن اذهب انت وربك فقاتلا انا معكما مقاتلون ما دامت عين منا تطرف "یا رسول اللہ! جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا اسی طرف چلیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔" مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی اور ان کے لیے یہ آزمائش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انہوں نے اوّل روز کیا تھا اسے وہ کہاں تک نباہنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے براہِ راست ان کو مخاطب کیے بغیر پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس پر سعد بن معاذؓ اُٹھے اور انہوں

نے عرض کیا، شاید حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ انہوں نے کہا۔ لقد آمنابك و صدقناك وشهدنا ان ما جئت به هو الحق واعطيناك عهودنا ومواثيقنا على السمع والطاعة۔ فامض یا رسول الله لما اردت۔ فوالذى بعثك بالحق لو استعرضت بنا هذا البحر فخضته لخضناه معك وما تخلف منا رجل واحد وما نكره تلقى بنا عدونا غدًا انا لنصبر عند الحرب صدق عند اللقاء ولعل الله يريك منا ما تقربه عينك فسر بنا على بركة الله " ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول! جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اُتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔"

ان تقریروں کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ قافلہ کے بجائے لشکرِ قریش ہی کے مقابلہ پر چلنا چاہیئے لیکن یہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا جو لوگ اس تنگ وقت میں لڑائی کے لیے اُٹھے تھے ان کی تعداد ۳ سو سے کچھ زائد تھی (۸۶ مہاجر، ۶۱ قبیلۂ اوس کے، اور ۱۷۰ قبیلہ خزرج کے) جن میں صرف دو تین کے پاس گھوڑے تھے اور باقی آدمیوں کے لیے ۷۰ اُونٹوں سے زیادہ نہ تھے۔ جن پر تین تین چار چار اشخاص باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ سامانِ جنگ بھی بالکل ناکافی تھا۔ صرف ۶۰ آدمیوں کے پاس زرہیں تھیں۔ اس لیے صرف چند سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر آدمی جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے دلوں میں سہم رہے تھے اور انہیں محسوس ہوتا تھا کہ جانتے بوجھتے موت کے منھ میں جا رہے ہیں۔ مصلحت پرست لوگ جو اگرچہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں جان و مال کا زیاں ہو۔ اس مہم کو دیوانگی سے تعبیر کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ دینی جذبے نے ان کو پاگل بنا دیا ہے، مگر نبیؐ اور مومنین صادقین یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ وقت جان کی بازی لگانے ہی

کا ہے اس لیے اللہ کے بھروسے پر وہ نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی جدھر سے قریش کا لشکر آرہا تھا۔ حالانکہ اگر ابتدا میں قافلے کو لوٹنا مقصود ہوتا تو شمال مغرب کی راہ لی جاتی۔ لہ

۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر فریقین کا مقابلہ ہوا۔ جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تین کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان ہے اور وہ بھی پوری طرح مسلح نہیں ہے تو خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے اور انتہائی خضوع و تضرع کے ساتھ عرض کرنا شروع کیا "اللّٰھم ھٰذہ قریش قد اتت بخیلائھا تحاول ان تکذب رسولک، اللّٰھم فنصرک الذی وعدتنی، اللّٰھم ان تھلک ھٰذہ العصابۃ الیوم لا تعبد" خدایا! یہ ہیں قریش، اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں، خداوندا! بس اب آجائے تیری وہ مدد جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اے خدا اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔"

اس معرکۂ کارزار میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرینِ مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آرہا تھا، اور اپنے ہاتھوں اور اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش سے صرف وہی لوگ گزر سکتے تھے جنہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تل گئے ہوں، اور انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔ اب

لہ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنگِ بدر کے بیان میں تاریخ و سیرت کے مصنفین نے ان روایات پر اعتماد کرلیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ بعض ایمان ہی کی بنا پر ہم جنگِ بدر کے متعلق قرآن کے بیان کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے پر مجبور نہیں ہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی آج اس جنگ کے متعلق اگر کوئی معتبر ترین بیان موجود ہے تو وہ یہی سورۂ انفال ہے، کیونکہ یہ لڑائی کے بعد ہی متصلاً نازل ہوئی تھی اور خود شرکائے جنگ اور مخالف و موافق سب نے اس کو سنا اور پڑھا تھا۔ معاذ اللہ اس میں کوئی ایک بات بھی خلافِ واقعہ ہوتی تو ہزاروں زبانیں اس کی تردید کر ڈالتیں۔

تک تو انہوں نے عرب کے طاقتور ترین قبیلے، قریش اور اس کے حلیف قبائل کی دشمنی صرف اسی حد تک مول لی تھی کہ ان کے علی الرغم مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دے دی تھی لیکن اب تو وہ اسلام کی حمایت میں ان کے خلاف لڑنے بھی جا رہے تھے جس کے معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹی سی بستی جس کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہے سارے ملک عرب سے لڑائی مول لے رہی ہے۔ یہ جسارت صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو کسی صداقت پر ایسا ایمان لے آئے ہوں کہ اس کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی انہیں ذرہ برابر پروا نہ رہی ہو۔ آخر کار ان لوگوں کی صداقتِ ایمانی خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، اور قریش اپنے سارے غرورِ طاقت کے باوجود ان بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کے ستر آدمی مارے گئے، ستر قید ہوئے اور ان کا سروسامان غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار جو اُن کے گلہائے سرسبد اور اسلام کی مخالف تحریک کے روحِ رواں تھے اس معرکے میں ختم ہو گئے اور اس فیصلہ کن فتح نے عرب میں اسلام کو ایک قابلِ لحاظ طاقت بنا دیا جیسا کہ ایک مغربی محقق نے لکھا ہے "بدر سے پہلے اسلام محض ایک مذہب اور ریاست تھا مگر بدر کے بعد وہ مذہبِ ریاست بلکہ خود ریاست بن گیا۔"

مباحث

یہ ہے وہ عظیم الشان معرکہ جس پر قرآن کی اس سورہ میں تبصرہ کیا گیا ہے مگر اس تبصرے کا انداز اُن تمام تبصروں سے مختلف ہے جو دنیوی بادشاہ اپنی فوجی کامیابی کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اُن خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو اخلاقی حیثیت سے ابھی مسلمانوں میں باقی تھیں تاکہ آئندہ اپنی مزید تکمیل کے لیے سعی کریں۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ اس فتح میں تائیدِ الٰہی کا کتنا بڑا حصہ تھا تاکہ وہ اپنی جرأت و شجاعت پر نہ پھولیں بلکہ خدا پر توکل اور خدا و رسول کی اطاعت کا سبق لیں۔

پھر اس اخلاقی مقصد کو واضح کیا گیا ہے جس کے لیے مسلمانوں کا یہ معرکۂ حق و باطل برپا کرنا ہے۔ اور ان اخلاقی صفات کی توضیح کی گئی ہے جن سے اس معرکے میں انھیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر مشرکین اور منافقین اور یہود اور ان لوگوں کو جو جنگ میں قید ہو کر آئے تھے، نہایت سبق آموز انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔

پھر اُن اموال کے متعلق، جو جنگ میں ہاتھ آئے تھے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ انہیں اپنا مال نہ سمجھیں بلکہ خدا کا مال سمجھیں، جو کچھ اللہ اس میں سے آپ کا حصہ مقرر کرے اسے خوشی کے ساتھ قبول کرلیں اور جو حصہ اللہ اپنے کام اور اپنے غریب بندوں کی امداد کے لیے مقرر کرے اس کو برضا و رغبت گوارا کرلیں۔

پھر قانونِ جنگ و صلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں جن کی توضیح اس مرحلے میں دعوتِ اسلامی کے داخل ہوجانے کے بعد ضروری تھی تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیت کے طریقوں سے بچیں اور دنیا پر ان کی اخلاقی برتری قائم ہو اور دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام اول روز سے اخلاق پر عملی زندگی کی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے اس کی تعبیر واقعی عملی زندگی میں کیا ہے۔

پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت اُن مسلمانوں سے الگ کردی گئی ہے جو دارالاسلام کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔

اَلتَّوْبَة

نام

یہ سورہ دو ناموں سے مشہور ہے۔ ایک التَّوبہ دوسرے اَلبرَاءۃ۔ توبہ اس لحاظ سے کہ اس میں ایک جگہ بعض اہلِ ایمان کے قصوروں کی معافی کا ذکر ہے، اور براءۃ اس لحاظ سے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بریُ الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ

اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی جاتی۔ اس کے متعدد وجوہ مفسرین نے بیان کیے ہیں جن میں بہت کچھ اختلاف ہے مگر صحیح بات وہی ہے جو امام رازی نے لکھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی۔ اس لیے صحابہ کرامؓ نے بھی نہیں لکھی اور بعد کے لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جوں کا توں لینے اور جیسا دیا گیا تھا ویسا ہی اس کو محفوظ رکھنے میں کس درجہ احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول و اجزاء سورہ

یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے :-

پہلی تقریر آغاز سورہ سے پانچویں رکوع کے آخر تک چلتی ہے، اس کا زمانۂ نزول ذی القعدہ ۹ھ یا اس کے لگ بھگ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سال حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحاج مقرر کر کے مکہ روانہ کر چکے تھے کہ یہ تقریر نازل ہوئی اور حضورؐ نے فوراً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ حج کے موقع پر تمام عرب کے نمائندہ اجتماع میں اسے سنائیں اور اس کے مطابق جو طرزِ عمل تجویز کیا گیا تھا اس کا اعلان کر دیں۔

دوسری تقریر رکوع ۶ کی ابتداء سے رکوع ۹ کے اختتام تک چلتی ہے اور یہ رجب ۹ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ اس میں اہلِ

ایمان کو جہاد پر اُکسایا گیا ہے اور ان لوگوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جو نفاق یا ضعفِ ایمان یا سستی و کاہلی کی وجہ سے راہِ خدا میں جان و مال کا زیاں برداشت کرنے سے جی چرا رہے تھے۔

تیسری تقریر رکوع ۶ سے شروع ہو کر سورہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں متعدد ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو انہی ایام میں مختلف مواقع پر اُترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ الٰہی سے ان سب کو یکجا کر کے ایک سلسلۂ تقریر میں منسلک کر دیا ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلۂ واقعات سے متعلق ہیں اس لیے ربطِ تقریر میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا۔ اس میں منافقین کی حرکات پر تنبیہ، غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر زجر و توبیخ اور اُن صادق الایمان لوگوں پر ملامت کے ساتھ معافی کا اعلان ہے جو اپنے ایمان میں سچے تو تھے مگر جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے سے باز رہے تھے۔

نزولی ترتیب کے لحاظ سے پہلی تقریر سب سے آخر میں آنی چاہیے تھی لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے وہی سب سے مقدم تھی۔ اس لیے مصحف کی ترتیب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہلے رکھا اور بقیہ دونوں تقریروں کو مؤخر کر دیا۔

تاریخی پس منظر

زمانۂ نزول کی تعیین کے بعد ہمیں اس سورہ کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ جس سلسلۂ واقعات سے اس سورہ کے مضامین کا تعلق ہے اس کی ابتدا صلح حدیبیہ سے ہوتی ہے۔ حدیبیہ تک چھ سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ اس شکل میں رونما ہو چکا تھا کہ عرب کے تقریباً ایک تہائی حصہ میں اسلام ایک منظم سوسائٹی کا دین، ایک مکمل تہذیب و تمدن اور ایک کامل با اختیار ریاست بن گیا تھا۔ حدیبیہ کی صلح جب واقع ہوئی تو اس دین کو یہ موقع بھی حاصل ہو گیا کہ اپنے اثرات نسبتاً زیادہ امن و اطمینان کے ماحول میں ہر چہار طرف پھیلا سکے۔ اس کے بعد واقعات کی رفتار نے دو بڑے راستے اختیار کیے جو آگے چل کر نہایت اہم نتائج پر منتہی ہوئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق عرب سے تھا اور دوسرے کا سلطنتِ روم سے۔

عرب کی تسخیر

عرب میں حدیبیہ کے بعد دعوت و تبلیغ اور استحکامِ قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام کا دائرۂ اثر اتنا

۵؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ سورۂ مائدہ۔

پھیل گیا اور اس کی طاقت اتنی زبردست ہوگئی کہ پرانی جاہلیت اس کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ آخر کار جب قریش کے زیادہ پرجوش عناصر نے بازی ہرتی دیکھی تو انہیں یارائے ضبط نہ رہا اور انہوں نے حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ ڈالا۔ وہ اس بندش سے آزاد ہو کر اسلام سے ایک آخری فیصلہ کن مقابلہ کرنا چاہتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عہد شکنی کے بعد ان کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا اور اچانک مکہ پر حملہ کر کے رمضان ۸ھ میں اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد قدیم جاہلی نظام نے آخری حرکتِ مذبوحی حُنین کے میدان میں کی، جہاں ہوازن، ثقیف، نضر، جُشَم اور بعض دوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت لاکر جھونک دی تاکہ اس اصلاحی انقلاب کو روکیں جو فتح مکہ کے بعد تکمیل کے مرحلے میں پہنچ چکا تھا۔ یہ حرکت بھی ناکام ہوئی اور حنین کی شکست کے ساتھ عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو گیا کہ اسے اب دارالاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعہ پر پورا ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا[1] اور نظامِ جاہلیت کے صرف چند پراگندہ عناصر ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے۔ اس نتیجہ کے حدِ کمال تک پہنچنے میں اُن واقعات سے اور زیادہ مدد ملی جو شمال میں سلطنت روم کی سرحد پر اُسی زمانہ میں پیش آرہے تھے وہاں جس جرأت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار کا زبردست لشکر لے کر گئے۔ اور رومیوں نے آپ کے مقابلہ پر آنے سے پہلو تہی کر کے جو کمزوری دکھائی اس نے تمام عرب پر آپ کی اور آپ کے دین کی دھاک بٹھا دی اور اس کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ تبوک سے واپس آتے ہی حضورؐ کے پاس عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہو گئے اور وہ اسلام و اطاعت کا اقرار کرنے لگے[2] چنانچہ اسی کیفیت کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ "جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوئی اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔"

---

[1] دیکھو سورۂ انفال، حاشیہ ۴۳

[2] محدثین نے اس موقع پر جن قبائل اور امراء و ملوک کے وفود کا ذکر کیا ہے ان کی مجموعی تعداد ۰۰ تک پہنچتی ہے جو عرب کے تمام شمال، جنوب، مشرق، مغرب ہر علاقے سے آئے تھے۔

غزوہ تبوک

رومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کی ابتدا فتحِ مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحدِ شام سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے۔ ان لوگوں نے ذات الطلح (یا ذات اطلاح) کے مقام پر اس وفد کے ۱۵ آدمیوں کا قتل کر دیا اور صرف رئیسِ وفد کعب بن عُمیر غفاری بچ کر واپس آئے۔ اسی زمانہ میں حضورؐ نے بُصریٰ کے رئیس شُرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوت اسلامی کا پیغام بھیجا تھا مگر اس نے آپ کے ایلچی حارث بن عُمیر کو قتل کر دیا۔ یہ رئیس بھی عیسائی تھا اور براہِ راست قیصرِ روم کے احکام کا تابع تھا۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحدِ شام کی طرف بھیجی تاکہ آئندہ کے لیے یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے پُرامن ہو جائے۔ اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جُرأت نہ کریں۔ یہ فوج جب مَعان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلے پر آرہا ہے۔ خود قیصرِ روم حمص کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی فوج مزید روانہ کی ہے لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود ۳ ہزار سرفروشوں کا یہ دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور مُوتہ کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس تہوّر کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجاہدینِ اسلام بالکل پس جاتے لیکن سارا عرب اور تمام مشرق قریب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلے میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو، بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی، جو کسریٰ کے زیرِ اثر تھے، اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سُلیم (جن کے سردار عباس بن مِرداس سُلمی تھے) اور اشجع اور غطفان اور ذُبیان اور فزارہ کے لوگ اسی زمانہ میں داخلِ اسلام ہوئے اور اسی زمانے میں سلطنتِ روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فَروَہ بن عَمرو الجذامی مسلمان ہوا جس نے اپنے ایمان کا ایسا ثبوت دیا کہ گرد و پیش کے سارے علاقے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ قیصر کو جب فَروَہ کے قبولِ اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے انہیں گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے کہا کہ دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کر لو۔ یا ترکِ اسلام جس کے نتیجے میں تم کو نہ صرف رہا کیا

جائے گا بلکہ تمہیں اپنے عہدے پر بھی بحال کر دیا جائے گا۔ یا اسلام جس کے نتیجہ میں تمہیں سزائے موت دی جائے گی۔ انہوں نے ٹھنڈے دل سے اسلام کو چن لیا اور راہ حق میں جان دے دی ۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے قیصر کو اُس "خطرے" کی حقیقی اہمیت محسوس کرائی جو عرب سے اُٹھ کر اس کی سلطنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوۂ مُوتہ کی سزا دینے کے لیے سرحدِ شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غسّانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپ ہر وقت ہر اُس چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی خبردار رہتے تھے جس کا اسلامی تحریک پر کچھ بھی موافق یا مخالف اثر پڑتا ہو۔ آپ نے ان تیاریوں کے معنیٰ فوراً سمجھ لیے اور بغیر کسی تامّل کے قیصر کی عظیم الشان سلطنت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دُم توڑتی ہوئی جاہلیت جس پر حنین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی، پھر جی اُٹھتی، دوسری طرف مدینہ کے منافقین جو ابو عامر راہب کے واسطے سے غسان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی سازباز رکھتے تھے اور جنہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر دین داری کا پردہ ڈالنے کے لیے مدینہ سے متصل ہی مسجدِ ضرار تعمیر کر رکھی تھی بغل میں چھرا گھونپ دیتے، سامنے سے قیصر، جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا حملہ آور ہو جاتا اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔ اس لیے باوجود اس کے کہ ملک میں قحط سالی تھی۔ گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا فصلیں پکنے کے قریب تھیں۔ سواریوں اور سروسامان کا انتظام سخت مشکل تھا۔ سرمایہ کی بہت کمی تھی اور دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ درپیش تھا۔ خدا کے نبی نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوتِ حق کے لیے زندگی و موت کے فیصلے کی گھڑی ہے۔ اسی حال میں تیاریِ جنگ کا اعلانِ عام کر دیا۔ پہلے تمام غزوات میں تو حضور کا قاعدہ تھا کہ آخر وقت تک کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کدھر جانا ہے اور کس سے مقابلہ درپیش ہے بلکہ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی منزلِ مقصود کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے لیکن اس موقع پر آپ نے پردہ بھی نہ رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

اِس موقع کی نزاکت کو عرب میں سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ جاہلیتِ قدیمہ کے بچے کھچے عاشقوں کے لیے یہ ایک آخری شعاعِ اُمید تھی اور روم و اسلام کی ٹکر کے نتیجہ پر وہ بے چینی کے ساتھ نگاہیں لگائے ہوئے تھے کیونکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر کہیں سے امید کی جھلک نہیں دکھائی دیتی ہے۔ منافقین نے بھی اپنی آخری بازی اسی پر لگادی تھی اور وہ اپنی مسجد ضرار بناکر اس انتظار میں تھے کہ شام کی جنگ میں اسلام کی قسمت کا پانسہ پلٹے تو ادھر اندرونِ ملک میں وہ اپنے فتنے کا علم بلند کریں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس مہم کو ناکام کرنے کے لیے تمام ممکن تدبیریں بھی استعمال کر ڈالیں۔ ادھر مومنین صادقین کو بھی پورا احساس تھا کہ جس تحریک کے لیے وہ ۲۲ سال سے سربکف رہے ہیں اس وقت اس کی قسمت ترازو میں ہے، اِس موقع پر جُراَت دکھانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس تحریک کے لیے ساری دنیا پر چھا جانے کا دروازہ کُھل جائے اور کمزوری دکھانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ عرب میں بھی اُس کی بساط اُلٹ جائے۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ ان فدایانِ حق نے انتہائی جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لاکر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کردی۔ غریب صحابیوں نے محنت مزدوری کرکرکے جو کچھ کمایا لاکر حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار اُتار کر دے دیئے۔ سرفروش والنٹیروں کے لشکر کے لشکر ہر طرف سے امنڈ امنڈ کر آنے شروع ہوئے اور انہوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ جن کو سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسولِ پاک کا دل بھر آتا تھا۔ یہ موقع عملاً ایمان اور نفاق کے امتیاز کی کسوٹی بن گیا تھا، حتیٰ کہ اس وقت پیچھے رہ جانے کے معنیٰ یہ تھے کہ اسلام کے ساتھ آدمی کے تعلق کی صداقت ہی مشتبہ ہوجائے، چنانچہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے دورانِ سفر میں جو جو شخص پیچھے رہ جاتا تھا صحابۂ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیتے تھے اور جواب میں حضور برجستہ فرماتے تھے کہ دعوہ فان یك فیہ خیر فسیلحقہ اللہ بکم و ان یك غیر ذالك فقد اراحکم اللہ منہ۔ "جانے دو اگر اس میں کچھ بھلائی ہے تو اللہ اسے پھر تمہارے ساتھ ملائے گا اور اگر کچھ دوسری حالت ہے تو شکر کرو کہ اللہ نے اس کی جھوٹی رفاقت سے تمہیں خلاصی بخشی،

رجب ۹ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے جن میں دس ہزار سوار تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت مستزاد۔ مگر جس عزم صادق کا ثبوت اس نازک موقع پر مسلمانوں نے دیا اس کا ثمرہ تبوک پہنچ کر انہیں نقد مل گیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ قیصر اور اس کے تابعین نے مقابلہ پر آنے کی بجائے اپنی فوجیں سرحد سے ہٹالی ہیں اور اب کوئی دشمن موجود نہیں ہے کہ جس سے جنگ کی جائے۔ سیرت نگار بالعموم اس واقعہ کو اس انداز سے لکھ جاتے ہیں کہ گویا وہ خبر ہی سرے سے غلط نکلی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رومی افواج کے اجتماع کے متعلق ملی تھی۔ حالانکہ در اصل واقعہ یہ تھا کہ قیصر نے اجتماعِ افواج شروع کیا تھا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ پر پہنچ گئے تو اس نے سرحد سے فوجیں ہٹا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا۔ غزوۂ موتہ میں تین ہزار اور ایک لاکھ کے مقابلہ کی جو شان وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود نبیؐ کی قیادت میں جہاں ۳۰ ہزار فوج آرہی ہو وہاں وہ لاکھ دو لاکھ آدمی لے کر میدان میں آجاتا۔

قیصر کے یوں طرح دے جانے سے جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور بجائے اس کے تبوک سے آگے بڑھ کر سرحد شام میں داخل ہوتے، آپؐ نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس فتح سے انتہائی ممکن سیاسی و حربی فوائد حاصل کر لیں۔ چنانچہ آپؐ نے تبوک میں ۲۰ دن ٹھہر کر ان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنتِ روم اور دار الاسلام کے درمیان واقع تھیں اور اب تک رومیوں کے زیرِ اثر رہی تھیں، فوجی دباؤ سے سلطنتِ اسلامی کے باجگذار اور تابع امر بنا لیا۔ اس سلسلہ میں دُومۃُ الجندل کے عیسائی رئیس اُکیدِر بن عبدالملک کِندی، اَیلہ کے عیسائی رئیس یوحنا بن رُؤبہ، اور اسی طرح مقنا، جَربا اور اَذرُح کے نصرانی رؤسا نے بھی جزیہ ادا کر کے مدینہ کی تابعیت قبول کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حدودِ اقتدار براہِ راست رومی سلطنت کی سرحد تک پہنچ گئے اور جن قبائل کو قیاصرۂ روم اب تک عرب کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے اب ان کا بیشتر حصہ رومیوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کا معاون بن گیا۔ پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سلطنتِ روم کے ساتھ ایک طویل کشمکش میں اُلجھ جانے سے پہلے اسلام کو عرب پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے کا پورا موقع مل گیا۔ تبوک کی اس فتح بلا جنگ نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب

تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے، خواہ وہ علانیہ مشرک ہوں یا اسلام کے پردہ میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمتِ ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم ازکم ان کی آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد جو ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی، وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اُس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی جس کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا تھا۔

مسائل و مباحث

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھنے کے بعد ہم بآسانی اُن بڑے بڑے مسائل کا احصاء کر سکتے ہیں جو اس وقت درپیش تھے اور جن سے سورۂ توبہ میں تعرض کیا گیا ہے:

(۱) اب چونکہ عرب کا نظم و نسق بالکلیہ اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آگیا تھا اور تمام مزاحم طاقتیں بے بس ہو چکی تھیں، اس لیے وہ پالیسی واضح طور پر سامنے آجانی چاہیے تھی جو عرب کو مکمل دارالاسلام بنانے کے لیے اختیار کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ وہ حسبِ ذیل صورت میں پیش کی گئی۔

الف۔ عرب سے شرک کو قطعاً مٹایا جائے اور قدیم مشرکانہ نظام کا کلی استیصال کر ڈالا جائے تاکہ مرکزِ اسلام ہمیشہ کے لیے خالص اسلامی مرکز ہو جائے اور کوئی دوسرا عنصر اس کے اسلامی مزاج میں نہ تو خلل انداز ہو سکے اور نہ کسی خطرے کے موقع پر اندرونی فتنہ کا موجب بن سکے۔ اسی غرض کے لیے مشرکین سے براءت اور ان کے ساتھ معاہدوں کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

ب۔ کعبہ کا انتظام اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آجانے کے بعد یہ بالکل نامناسب تھا کہ جو گھر خالص خدا کی پرستش کے لیے وقف کیا گیا تھا اس میں بدستور شرک ہوتا رہے اور اس کی تولیت بھی مشرکین کے قبضہ میں رہے، اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ کعبہ کی تولیت بھی اہلِ توحید کے قبضہ میں رہنی چاہیے اور بیت اللہ کے حدود میں شرک و جاہلیت کی تمام رسمیں بھی بزور بند کر دینی چاہئیں، بلکہ اب مشرکین اس گھر کے قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں تاکہ اس بنائے ابراہیمی کے آلودۂ شرک ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ج۔ عرب کی تمدنی زندگی میں رسوم جاہلیت کے جو آثار ابھی تک باقی تھے۔ ان کا جدید

اسلامی دور میں جاری رہنا کسی طرح درست نہ تھا۔ اس لیے ان کے استیصال کی طرف توجہ دلائی گئی۔ نسئی کا قاعدہ ان رسوم میں سب سے زیادہ بد نما تھا۔ اس لیے اس پر براہِ راست ضرب لگائی گئی اور اسی ضرب سے مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ بقیہ آثارِ جاہلیت کے ساتھ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

۲۔ عرب میں اسلام کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر دینِ حق کا دائرۂ اثر پھیلایا جائے۔ اس معاملہ میں روم و ایران کی سیاسی قوت سب سے بڑی سدِّ راہ تھی اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہوتے ہی اس سے تصادم ہو۔ نیز آگے چل کر دوسرے غیر مسلم سیاسی و تمدنی نظاموں سے بھی اسی طرح سابقہ پیش آنا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ عرب کے باہر جو لوگ دینِ حق کے پیرو نہیں ہیں ان کی خود مختارانہ فرماں روائی کو بزورِ شمشیر ختم کر دو، تا آنکہ وہ اسلامی اقتدار کے تابع ہو کر رہنا قبول کر لیں۔ جہاں تک دینِ حق پر ایمان لانے کا تعلق ہے ان کو اختیار ہے کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر اپنا حکم جاری کریں اور انسانی سوسائٹیوں کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گمراہیوں کو خلقِ خدا پر اور ان کی آنے والی نسلوں پر زبردستی مسلط کرتے رہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس آزادی کے استعمال کا انھیں اختیار دیا جا سکتا ہے وہ بس اسی حد تک ہے کہ خود اگر گمراہ رہنا چاہتے ہیں تو رہیں، بشرطیکہ جزیہ دے کر اسلامی اقتدار کے مطیع بنے رہیں۔

(۳) تیسرا اہم مسئلہ منافقین کا تھا جن کے ساتھ اب تک وقتی مصالح کے لحاظ سے چشم پوشی و درگذر کا معاملہ کیا جا رہا تھا۔ اب چونکہ بیرونی خطرات کا دباؤ کم ہو گیا تھا بلکہ گویا نہیں رہا تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے اور وہی سخت برتاؤ ان چھپے ہوئے منکرینِ حق کے ساتھ بھی ہو جو کھلے منکرینِ حق کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی پالیسی تھی جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں سُوَیلِم کے گھر میں آگ لگوادی جہاں منافقین کا ایک گروہ اس غرض سے جمع ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو شرکتِ جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرے، اور اسی پالیسی کے تحت تبوک سے واپس تشریف لاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ مسجدِ ضرار کو ڈھانے اور جلا دینے کا حکم دے دیا۔

(۴) مومنین صادقین میں اب تک جو تھوڑا بہت ضعفِ عزم باقی تھا اس کا علاج بھی ضروری

تھا، کیونکہ اسلام عالمگیر جدّوجُہد کے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا اور اس مرحلہ میں جبکہ اکیلے مُسلم عرب کو پوری غیر مسلم دنیا سے ٹکرانا تھا۔ ضعفِ ایمان سے بڑھ کر کوئی اندرونی خطرہ اسلامی جماعت کے لیے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقع پر سستی اور کمزوری دکھائی تھی ان کو نہایت شدت کے ساتھ ملامت کی گئی۔ پیچھے رہ جانے والوں کے اس فعل کو کہ وہ بلا عذرِ معقول پیچھے رہ گئے، بجائے خود ایک منافقانہ طرزِ عمل، اور ایمان میں ان کے ناراست ہونے کا ایک بیّن ثبوت قرار دیا گیا۔ اور آئندہ کے لیے پوری صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کر دی گئی کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدّوجُہد اور کفر و اسلام کی کش مکش ہی وہ اصلی کسوٹی ہے جس پر مومن کا دعویٰ ایمان پرکھا جائے گا۔ جو اس آویزش میں اسلام کے لیے جان و مال اور وقت و محنت صرف کرنے سے جی چرائے گا اس کا ایمان معتبر ہی نہ ہوگا اور اس پہلو کی کسر کسی دوسرے مذہبی عمل سے پوری نہ ہو سکے گی۔

ان امور کو نظر میں رکھ کر سُورۂ توبہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے تمام مضامین بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

یُونُس

نام اِس سورہ کا نام حسبِ دستور محض علامت کے طور پر آیت ۹۸ سے لیا گیا ہے جس میں اشارۃً حضرت یونس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا موضوع بحث حضرت یونس کا قصہ نہیں ہے۔

مقامِ نزول روایات سے معلوم ہوتا ہے اور نفس مضمون سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پوری سورۃ مکے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کی بعض آیتیں مدنی دَور کی ہیں لیکن یہ محض ایک سطحی قیاس ہے، سلسلہ کلام پر غور کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ مختلف مواقع پر اُتری ہوئی آیتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی مربوط تقریر ہے جو بیک وقت نازل ہوئی ہوگی اور مضمونِ کلام اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ یہ مکّی دَور کا کلام ہے۔

زمانۂ نزول زمانۂ نزول کے متعلق کوئی روایت ہمیں نہیں ملی لیکن مضمون سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں نازل ہوئی ہوگی کیونکہ اس کے اندازِ کلام سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مخالفینِ دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے۔ وہ نبی اور پیروانِ نبی کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان سے اب یہ امید باقی نہیں رہی ہے کہ تفہیم و تلقین سے راہِ راست پر آجائیں گے اور اب انھیں اُس انجام سے خبردار کرنے کا موقع آگیا ہے جو نبی کو آخری اور قطعی طور پر رد کر دینے کی صورت میں انہیں لازماً دیکھنا ہوگا۔ مضمون کی یہی خصوصیات ہمیں بتاتی ہیں کہ کونسی سورتیں مکہ کے آخری دَور سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس سورہ میں ہجرت کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس لیے اس کا زمانہ اُن سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیئے جن میں کوئی نہ کوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلق ملتا ہے۔

زمانہ کی اس تعیین کے بعد تاریخی پس منظر بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس دور کا تاریخی پس منظر سورۂ انعام اور سورۂ اعراف کے دیباچوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔

موضوع

موضوعِ تقریر دعوت، فہمائش اور تنبیہ ہے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ:- لوگ ایک انسان کے پیغامِ نبوت پیش کرنے پر حیران ہیں اور اسے خواہ مخواہ ساحری کا الزام دے رہے ہیں، حالانکہ جو بات وہ پیش کر رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی نہ تو عجیب ہی ہے اور نہ سحر و کہانت ہی سے کوئی تعلق رکھتی ہے۔ وہ تو دو اہم حقیقتوں سے تم کو آگاہ کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ جو خدا اس کائنات کا خالق ہے اور اس کا انتظام عملاً چلا رہا ہے صرف وہی تمہارا مالک و آقا ہے اور تنہا اسی کا یہ حق ہے کہ تم اس کی بندگی کرو۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دنیوی زندگی کے بعد زندگی کا ایک اور دور آنے والا ہے جس میں تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے۔ اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دو گے اور اس بنیادی سوال پر جزا یا سزا پاؤ گے کہ تم نے اسی خدا کو اپنا آقا مان کر اس کے منشا کے مطابق نیک رویہ اختیار کیا یا اس کے خلاف عمل کرتے رہے۔ یہ دونوں حقیقتیں جو وہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے بجائے خود امرِ واقعی ہیں خواہ تم مانو یا نہ مانو۔ وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تم انھیں مان لو اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنا لو۔ اس کی یہ دعوت اگر تم قبول کرو گے تو تمہارا اپنا انجام بہتر ہوگا ورنہ خود ہی برا نتیجہ دیکھو گے۔

مباحث

اس تمہید کے بعد حسبِ ذیل مباحث ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:-

(۱) وہ دلائل جو توحیدِ ربوبیت اور حیاتِ اُخروی کے باب میں ایسے لوگوں کو عقل و ضمیر کا اطمینان بخش سکتے ہیں جو جاہلانہ تعصب میں مبتلا نہ ہوں اور جنہیں بحث کی ہار جیت کے بجائے اصل فکر اس بات کی ہو کہ خود غلط بینی اور اس کے برے نتائج سے بچیں۔

(۲) ان غلط فہمیوں کا ازالہ اور اُن غفلتوں پر تنبیہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہی تھیں (اور ہمیشہ ہوا کرتی ہیں)

(۳) اُن شبہات اور اعتراضات کا جواب جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں پیش کیے جاتے تھے۔

(۴) دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی پیشگی خبر، تاکہ انسان اس سے ہوشیار ہو کر اپنے آج کے طرزِ عمل کو درست کر لے اور بعد میں پچھتانے کی نوبت نہ آئے۔

(۵) اس امر پر تنبیہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی زندگی ہے اور اس امتحان کے لیے تمہارے پاس بس اتنی ہی مہلت ہے جب تک تم اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ اس وقت کو اگر تم نے ضائع کر دیا اور نبی کی ہدایت قبول کر کے امتحان کی کامیابی کا سامان نہ کیا تو پھر کوئی دوسرا موقع تمہیں ملنا نہیں ہے۔ اس نبی کا آنا اور اس قرآن کے ذریعہ تم کو علمِ حقیقت کا بہم پہنچایا جانا وہ بہترین اور ایک ہی موقع ہے جو تمہیں مل رہا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو بعد کی ابدی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ پچھتاؤ گے۔

(۶) اُن کھُلی کھُلی جہالتوں اور ضلالتوں پر اشارہ جو لوگوں کی زندگی میں صرف اس وجہ سے پائی جا رہی تھیں کہ وہ خدائی ہدایت کے بغیر جی رہے تھے۔

اس سلسلہ میں نوح علیہ السلام کا قصہ مختصراً اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے چار باتیں ذہن نشین کرنی مطلوب ہیں۔ اوّل یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ تم لوگ کر رہے ہو وہ اس سے ملتا جلتا ہے جو نوح اور موسیٰ علیہما السلام کے ساتھ تمہارے پیش رو کر چکے ہیں اور یقین رکھو کہ اس طرزِ عمل کا جو انجام وہ دیکھ چکے ہیں وہی تمہیں بھی دیکھنا پڑے گا۔ دوم یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو آج جس بے بسی و کمزوری کے حال میں تم دیکھ رہے ہو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ صورتِ حال ہمیشہ یہی رہے گی۔ تمہیں خبر نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر وہی خدا ہے جو موسیٰ و ہارون کی پشت پر تھا اور وہ ایسے طریقے سے حالات کی بساط اُلٹ دیتا ہے جس تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ سوم یہ کہ سنبھلنے کے لیے جو مہلت خدا تمہیں دے رہا ہے اسے اگر تم نے ضائع کر دیا اور پھر فرعون کی طرح خدا کی پکڑ میں آ جانے کے بعد عین آخری لمحہ پر توبہ کی تو معاف نہیں کیے جاؤ گے۔ چہارم یہ کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے وہ مخالف ماحول کی انتہائی شدت اور اس کے مقابلہ میں اپنی بے چارگی دیکھ کر مایوس نہ ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ ان حالات میں ان کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز وہ اس امر پر بھی متنبہ ہو جائیں کہ جب

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اس حالت سے نکال دے تو کہیں وہ اس روش پر چل پڑیں جو بنی اسرائیل نے مصر سے نجات پاکر اختیار کی۔

آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ مسلک ہے جس پر چلنے کی اللہ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی ہے، اس میں قطعاً کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ جو اسے قبول کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا، اور جو اس کو چھوڑ کر غلط راہوں میں بھٹکے گا وہ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔

ہُوْد

زمانۂ نزول

اس سورے کے مضمون پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسی دَور میں نازل ہوئی ہوگی جس میں سورۂ یونس" نازل ہوئی تھی۔ بعید نہیں کہ یہ اس کے ساتھ متصلاً ہی نازل ہوئی ہو، کیونکہ موضوعِ تقریر وہی ہے مگر تنبیہ کا انداز اس سے زیادہ سخت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟" جواب میں حضورؐ نے فرمایا:۔ شَیَّبَتْنِیْ هُوْدُ وَاَخَوَاتُهَا۔" مجھ کو سورۂ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہ زمانہ کیسا سخت ہوگا جب کہ ایک طرف کفارِ قریش اپنے تمام ہتھیاروں سے اس دعوتِ حق کو کچل دینے کی کوشش کر رہے تھے، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں آپ کو ہر وقت یہ اندیشہ گھلائے دیتا ہوگا کہ کہیں اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم ہو جائے اور وہ آخری ساعت نہ آجائے جبکہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب میں پکڑ لینے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ فی الواقع اس سورہ کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک سیلاب کا بند ٹوٹنے کو ہے اور اس غافل آبادی کو، جو اس سیلاب کی زد میں آنے والی ہے، آخری تنبیہ کی جا رہی ہے۔

موضوع اور مباحث

موضوعِ تقریر، جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے وہی ہے جو سورۂ یونس کا تھا، یعنی دعوت، فہمائش اور تنبیہ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورۂ یونس کی بہ نسبت یہاں دعوت مختصر ہے، فہمائش میں استدلال کم اور وعظ و نصیحت زیادہ ہے،

اور تنبیہ مفصّل اور پرزور ہے۔

دعوت یہ ہے کہ پیغمبر کی بات مانو، شرک سے باز آجاؤ۔ سب کی بندگی چھوڑ کر اللہ کے بندے بنو اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا نظام آخرت کی جواب دہی کے احساس پر قائم کرو۔

فہمائش یہ ہے کہ حیاتِ دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر کے جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا ہے وہ اس سے پہلے نہایت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ اب کیا ضرور ہے کہ تم بھی اسی راہ پر چلو جسے تاریخ کے مسلسل تجربات قطعی طور پر تباہی کی راہ ثابت کر چکے ہیں۔

تنبیہ یہ ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے یہ دراصل ایک مہلت ہے جو اللہ اپنے فضل سے تمہیں عطا کر رہا ہے اس مہلت کے اندر اگر تم نہ سنبھلے تو وہ عذاب آئے گا جو کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا اور اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمہاری ساری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے براہِ راست خطاب کی بہ نسبت قوم نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط، اصحابِ مَدیَن اور قومِ فرعون کے قصّوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ان قصّوں میں خاص طور پر جو بات نمایاں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا جب فیصلہ چکانے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لاگ طریقے سے چکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرّہ برابر رعایت نہیں ہوتی۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس کا بیٹا اور کس کا عزیز ہے۔ رحمت صرف اس کے حصّہ میں آتی ہے جو راہِ راست پر آگیا ہو، ورنہ خدا کے غضب سے نہ کسی پیغمبر کا بیٹا بچتا ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بیوی۔ یہی نہیں بلکہ جب ایمان و کفر کا دوٹوک فیصلہ ہو رہا ہو تو دین کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ خود مومن بھی باپ اور بیٹے اور شوہر اور بیوی کے رشتوں کو بھول جائے اور خدا کی شمشیرِ عدل کی طرح بالکل بے لاگ ہو کر ایک رشتۂ حق کے سوا ہر دوسرے رشتہ کو کاٹ پھینکے۔ ایسے موقع پر خون اور نسب کی رشتہ داریوں کا ذرّہ برابر بھی لحاظ کر جانا اسلام کی رُوح کے خلاف ہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا پورا پورا مظاہرہ تین چار سال بعد مکّہ کے مہاجر مسلمانوں نے جنگِ بدر میں کر کے دکھا دیا۔

یُوسُف

زمانۂ نزول وسببِ نزول

اس سورے کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانۂ قیامِ مکّہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی جبکہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں، یا جلاوطن کریں یا قید کر دیں۔ اس زمانہ میں بعض کفارِ مکہ نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہوا، چونکہ اہلِ عرب اس قصہ سے ناواقف تھے۔ اس کا نام ونشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی پہلے کبھی ان کا ذکر نہ سنا گیا تھا، اس لیے انہیں توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح اُن کا بھرم کھُل جائے گا لیکن اس امتحان میں انھیں اُلٹی منہ کی کھانی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ فوراً اُسی وقت یوسف علیہ السّلام کا یہ پورا قصہ آپؐ کی زبان پر جاری کر دیا، بلکہ مزید برآں اس قصے کو قریش کے اس معاملہ پر چسپاں بھی کر دیا جو وہ برادرانِ یوسف کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر رہے تھے۔

مقاصدِ نزول

اس طرح یہ قصہ دو اہم مقاصد کے لیے نازل فرمایا گیا:۔

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا ثبوت اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور اُن کے خود تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ آپ سُنی سنائی باتیں بیان نہیں کرتے، بلکہ فی الواقع آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم ہوتا ہے۔ اس مقصد کو سورہ کی تمہید میں بھی صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے اور خاتمۂ کلام پر بھی پورے

زور کے ساتھ اس کی تصریح کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ سردارانِ قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اُس وقت جو معاملہ چل رہا تھا اس پر برادرانِ یوسف اور یوسف علیہ السّلام کے قصّے کو چسپاں کرتے ہوئے قریش والوں کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسف کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا، مگر جس طرح وہ خدا کی مشیّت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخرکار اُسی بھائی کے قدموں میں آرہے جس کو انہوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنویں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمہاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے گی اور ایک دن تمہیں بھی اپنے اسی بھائی سے رحم و کرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تُلے ہوئے ہو۔ یہ مقصد بھی سورہ کے آغاز میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔ "یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصّے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السّلام کے قصّے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے قرآن مجید نے گویا ایک صریح پیش گوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس سورہ کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ قریش والوں نے برادرانِ یوسف کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی اور آپ کو مجبوراً ان سے جان بچا کر مکّہ سے نکلنا پڑا۔ پھر اُن کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو بھی جلا وطنی میں ویسا ہی عروج و اقتدار نصیب ہوا جیسا یوسف علیہ السّلام کو ہوا تھا۔ پھر فتح مکّہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آیا جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کو پیش آیا تھا۔ وہاں جب برادرانِ یوسف انتہائی عجز و درماندگی کی حالت میں ان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ۔ "ہم پر صدقہ کیجیے اللہ صدقہ کرنے والوں کو نیک جزا دیتا ہے۔" تو یوسف علیہ السّلام نے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود انہیں معاف کر دیا اور فرمایا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۔ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب رحم

کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔" اسی طرح یہاں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے اور آنحضرت ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپ نے اُن سے پوچھا" تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟" انہوں نے عرض کیا اخ کریمٌ وابن اخ کریم۔" آپ ایک عالی ظرف بھائی ہیں اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔" آپ نے فرمایا۔ فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوتہٖ لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء" میں تمہیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تمہیں معاف کیا۔"

مباحث و مسائل

یہ دو پہلو تو اس سورہ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس قصے کو بھی قرآن مجید محض قصہ گوئی و تاریخ نگاری کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق وہ اسے اپنی اصل دعوت کی تبلیغ میں استعمال کرتا ہے۔

وہ اس پوری داستان میں یہ بات بھی نمایاں طور پر بیان کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیم حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کا دین وہی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی چیز کی طرف وہ بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے کردار اور دوسری طرف برادرانِ یوسف، قافلۂ تجار، عزیزِ مصر، اس کی بیوی، بیگماتِ مصر، حکامِ مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے اور محض اپنے اندازِ بیان سے سامعین اور ناظرین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام یعنی خدا کی بندگی اور حسابِ آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت اور دنیا پرستی اور خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتے ہیں۔ اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں کس نمونے کو پسند کرتا ہے۔

" پھر اس قصے سے قرآنِ حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اُس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ بسا اوقات انسان ایک

کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا مگر نتیجہ میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لیا ہے جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو کنویں میں پھینک رہے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔ مگر فی الواقع انہوں نے یوسف ؑ کو اس بامِ عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا اور اپنی اس حرکت سے انہوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسفؑ کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے، انہیں ندامت، و شرم ساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ عزیز مصر کی بیوی یوسفؑ کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو اُن سے انتقام لے رہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تختِ سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے ملک کی مُربیّہ کہلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں گرا سکتی، بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے۔ اللہ اسی تدبیر میں اُس کے اُٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور ان لوگوں کے حصہ میں رُسوائی کے سوا اور کچھ نہیں آتا جنہوں نے اسے گرانا چاہا تھا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس خدا جسے گرانا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں اُلٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو مُنھ کی کھانی پڑتی ہے۔

اس حقیقتِ حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدابیر دونوں میں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانونِ الٰہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی و ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا وہ اگر ناکام بھی ہوا تو بہر حال ذلت و رسوائی سے دو چار نہ ہوگا اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا وہ آخرت میں تو یقیناً رسوا ہوگا ہی مگر دنیا میں بھی اس کے لیے

رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔ دوسرا اہم سبق اس سے توکّل علی اللہ اور تفویض علی اللہ کا ملتا ہے جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دنیا انہیں مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہو وہ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو انہیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہوگی اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دیے چلے جائیں گے۔

مگر سب سے بڑا سبق جو اس سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بہرہ یاب ہو، تو وہ محض اپنے اخلاق کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو دیکھیے۔ ۱۷ برس کی عمر، تن تنہا، بے سر و سامان، اجنبی ملک، اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں۔ تاریخ کے اُس دَور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا جس کی میعادِ سزا بھی کوئی نہ تھی۔ اس حالت تک گرا دیے جانے کے بعد وہ محض اپنے اخلاق کے بل پر اُٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو مسخر کر لیتے ہیں۔

تاریخی و جغرافی حالات

اِس قصّے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اِس کے متعلق کچھ تاریخی و جغرافی معلومات بھی پیشِ نظر رہیں۔

حضرت یوسف علیہ السّلام، حضرت یعقوب علیہ السّلام کے بیٹے، حضرت اسحاقؑ کے پوتے اور حضرت ابراہیمؑ کے پرپوتے تھے۔ بائیبل کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوبؑ کی جائے قیام حبرُون (موجودہ الخلیل) کی وادی میں تھی جہاں حضرت اسحاق اور ان سے پہلے حضرت ابراہیمؑ رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرتِ یعقوبؑ کی کچھ زمین سِکم (موجودہ نابلس) میں بھی تھی۔

بائیبل کے علماء کی تحقیق اگر دُرست مانی جائے تو حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ سنہ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس

قصہ کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنوئیں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ برس کی تھی۔ جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے وہ بائیبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سِکم کے شمال میں دُوتن (موجودہ کوتان) کے قریب واقع تھا اور جس قافلے نے انھیں کنوئیں سے نکالا وہ جِلعاد (شرق اُردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف جا رہا تھا۔ (جِلعاد کے کھنڈر اب بھی دریائے اردن کے مشرق میں وادی الیابس کے کنارے واقع ہیں)

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں Hyksos Kings کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین و شام سے مصر جا کر ۲ ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں سلطنتِ مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مورخین اور مفسرینِ قرآن نے ان کے لیے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انھیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسفؑ کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ملک کے بہترین زرخیز علاقے آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ اسی دَور کی طرف سورۂ مائدہ کے رکوع کے آغاز آیت ۲۰ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا۔ اس کے بعد ملک میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھی جس نے ہِکسوس اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ ڈھائی لاکھ کی تعداد میں عمالقہ ملک سے نکال دیئے گئے۔ ایک نہایت متعصب قبطی النسل خاندان برسرِ اقتدار آ گیا اور اس نے عمالقہ کے زمانے کی یادگاروں کو چن چن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پر ان مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰ کے قصے میں آتا ہے۔

مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو "فرعون" کے نام سے

یاد نہیں کرتا، کیونکہ "فرعون" مصر کی مذہبی اصطلاح تھی۔ اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بائیبل میں غلطی سے اس کو بھی "فرعون" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتّب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ "فراعنہ" ہی تھے۔

موجودہ زمانے کے محققین جنہوں نے بائیبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرماں روا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس Apaphis ملتا ہے، وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالسلطنت اُسی زمانہ میں ممفس (منف) تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیزِ مصر کے گھر رہے۔ آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔ ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرماں روا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلا شرکت غیرے تمام مملکتِ مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرتِ یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دِمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام "جُشَن" یا "گوشن" بتایا گیا ہے۔ حضرت موسٰی کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔

یوسف علیہ السّلام کے قصّے کی جو تفصیلات بائیبل اور تَلمُودْ میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، مگر قصّے کے اہم اجزا میں تینوں متفق ہیں۔ ہم اپنے حواشی میں حسبِ ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔

الرّعد

نام آیت ۱۳ کے فقرے وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهٖ کے لفظ الرعد کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس نام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سورۃ میں بادل کی گرج کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے بلکہ یہ صرف علامت کے طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ الرّعد آیا ہے، یا جس میں رعد کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول رکوع ۴ اور رکوع ۶ کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی اسی دور کی ہے جس میں سورۂ یونس، ہود اور اعراف نازل ہوئی ہیں یعنی زمانۂ قیامِ مکّہ کا آخری دور۔ اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ایک مدّتِ دراز گزر چکی ہے، مخالفین آپؐ کو زک دینے اور آپؐ کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلتے رہتے ہیں۔ مومنین بار بار تمنائیں کر رہے ہیں کہ کاش کوئی معجزہ دکھا کر ہی ان لوگوں کو راہِ راست پر لایا جائے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی راہ دکھانے کا یہ طریقہ ہمارے ہاں رائج نہیں ہے اور اگر دشمنانِ حق کی رسّی دراز کی جا رہی ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے تم گھبرا اُٹھو۔ پھر آیت ۳۱ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بار بار کفار کی ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ ہو چکا ہے جس کے بعد یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اگر قبروں سے مُردے بھی اُٹھ کر آجائیں تو یہ لوگ نہ مانیں گے بلکہ اس واقعہ کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالیں گے۔ ان سب باتوں سے یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکّہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون سورۃ کا مدّعا پہلی ہی آیت میں پیش کر دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے، مگر یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اسے

نہیں مانتے۔ ساری تقریر اسی مرکزی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ اس سلسلہ میں بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے۔ ان پر ایمان لانے کے اخلاقی و روحانی فوائد سمجھائے گئے ہیں، ان کو نہ ماننے کے نقصانات بتائے گئے ہیں اور یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ کفر سراسر ایک حماقت اور جہالت ہے۔ پھر چونکہ اس سارے بیان کا مقصد محض دماغوں کو مطمئن کرنا ہی نہیں ہے، دلوں کو ایمان کی طرف کھینچنا بھی ہے، اس لیے بڑے منطقی استدلال سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ایک دلیل اور ایک شہادت کو پیش کرنے کے بعد ٹھیر کر طرح طرح سے تخویف، ترہیب، ترغیب اور مشفقانہ تلقین کی گئی ہے تاکہ نادان لوگ اپنی گمراہانہ ہٹ دھرمی سے باز آجائیں۔

دوران تقریر میں جگہ جگہ مخالفین کے اعتراضات کا ذکر کیے بغیر ان کے جوابات دیئے گئے ہیں، اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے تھے یا مخالفین کی طرف سے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ اہلِ ایمان کو بھی جو کئی برس کی طویل اور سخت جدّ و جہد کی وجہ سے تھکے جا رہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے، تسلی دی گئی ہے۔

اِبْرٰھِیْم

نام

آیت ۳۵ کے فقرے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے بلکہ یہ بھی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول

عام اندازِ بیان مکہ کے آخری دَور کی سورتوں کا سا ہے۔ سورۂ رعد سے قریب زمانہ ہی کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً آیت ۱۳ کے الفاظ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِرُسُلِھِمْ لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا (انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے) کا صاف اشارہ اسی طرف ہے کہ اُس وقت مکہ میں مسلمانوں پر ظلم وستم انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اہلِ مکہ پچھلی کافر قوموں کی طرح اپنے ہاں کے اہلِ ایمان کو خارج البلد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو وہ دھمکی سنائی گئی جو اُن کے سے رویہ پر چلنے والی پچھلی قوموں کو دی گئی تھی کہ لَنُھْلِکَنَّ الظّٰلِمِیْنَ (ہم ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے) اور اہلِ ایمان کو وہی تسلی دی گئی جو اُن کے پیش روؤں کو دی جاتی رہی ہے کہ لَنُسْکِنَنَّکُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ (ہم ان ظالموں کو ختم کرنے کے بعد تم ہی کو اس سرزمین میں آباد کریں گے)

اسی طرح آخری رکوع کے تیور بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ کے آخری دَور سے تعلق رکھتی ہے۔

مرکزی مضمون اور مُدّعا

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے

تھے اور آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بد تر سے بد تر چالیں چل رہے تھے ان کو فہمائش اور تنبیہ ۔ لیکن فہمائش کی بہ نسبت اس سورہ میں تنبیہ اور ملامت اور زجر و توبیخ کا انداز زیادہ تیز ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفہیم کا حق اس سے پہلے کی سورتوں میں بخوبی ادا کیا جا چکا تھا اور اس کے باوجود کفار قریش کی ہٹ دھرمی، عناد، مزاحمت، شرارت اور ظلم و جور میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اَلْحِجْر

نام آیت ۸۰ کے فقرے كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول سورۂ ابراہیم سے متصل ہے۔ اس کے پس منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دینے کی ایک مُدّت گزر چکی ہے اور مخاطب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزاء، مزاحمت اور ظلم وستم کی حد ہوگئی ہے جس کے بعد اب تفہیم کا موقع کم اور تنبیہ و اِنذار کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و جحود اور مزاحمت کے پہاڑ توڑتے توڑتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپ پر طاری ہو رہی ہے جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپؐ کو تسلّی دے رہا ہے اور آپ کی ہمّت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون یہی دو مضمون اس سورے میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ اُن لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کا مذاق اُڑا رہے اور آپ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے اور تسلّی و ہمّت افزائی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورہ تفہیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مجرد تنبیہ، یا خالص زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور مَلامتوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں اور دوسری طرف قصّۂ آدم و ابلیس سنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

النَّحل

نام آیت ۶۸ کے فقرے وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی محض علامت ہے نہ کہ موضوع بحث کا عنوان۔

زمانۂ نزول متعدد اندرونی شہادتوں سے اس کے زمانۂ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:
آیت ۴۱ کے فقرے وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہجرتِ حبشہ واقع ہو چکی تھی۔

آیت ۱۰۶ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖٓ الآیۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ظلم وستم پوری شدّت کے ساتھ ہو رہا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ناقابلِ برداشت اذیت سے مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

آیات ۱۱۲، ۱۱۴ کے الفاظ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً ..... اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں جو زبردست قحط رونما ہوا تھا وہ اس سورے کے نزول کے وقت ختم ہو چکا تھا۔

اس سورے میں ایک آیت ۱۱۵ ایسی ہے جس کا حوالہ سورۂ انعام آیت ۱۱۹ میں دیا گیا ہے، اور دوسری آیت ۱۱۸ ایسی ہے جس میں سورہ انعام کی آیت ۱۴۶ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں سورتوں کا نزول قریب العہد ہے۔

اِن شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول بھی مکے کا آخری دور ہی ہے، اور اس کی تائید سورے کے عام اندازِ بیان سے بھی ہوتی ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، دعوتِ پیغمبر کو نہ ماننے کے

بُرے نتائج پر تنبیہ و فہمائش اور حق کی مخالفت و مزاحمت پر زجر و توبیخ۔

مباحث سورہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے یک لخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔ کفارِ مکہ بار بار کہتے تھے کہ "جب ہم تمہیں جھٹلا چکے ہیں اور کھلم کھلا تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو آخر وہ خدا کا عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔" اس بات کو وہ بالکل تکیۂ کلام کی طرح اس لیے دہراتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر نہ ہونے کا سب سے زیادہ صریح ثبوت تھا۔ اس پر فرمایا کہ بیوقوفو، خدا کا عذاب تو تمہارے سر پر تُلا کھڑا ہے اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لیے جلدی نہ مچاؤ بلکہ جو ذرا سی مہلت باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد فوراً ہی تفہیم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے اور حسبِ ذیل مضامین بار بار یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں۔

(۱) دل لگتے دلائل اور آفاق و انفس کے آثار کی کھلی کھلی شہادتوں سے سمجھایا جاتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے۔

(۲) منکرین کے اعتراضات، شکوک، حجتوں اور حیلوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

(۳) باطل پر اصرار اور حق کے مقابلہ میں استکبار کے بُرے نتائج سے ڈرایا جاتا ہے۔

(۴) اُن اخلاقی اور عملی تغیرات کو مجمل مگر دل نشین انداز سے بیان کیا جاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین انسانی زندگی میں لانا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں مشرکین کو بتایا جاتا ہے کہ خدا کو رب ماننا، جس کا انہیں دعویٰ تھا، محض خالی خولی مان لینا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے جو عقائد، اخلاق اور عملی زندگی میں نمودار ہونے چاہئیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کفار کی مزاحمتوں اور جفاکاریوں کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡل

نام پہلے رکوع کی آیت ۴ کے فقرے وَقَضَیۡنَآ اِلٰی بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ سے ماخوذ ہے مگر اس میں موضوعِ بحث بنی اسرائیل نہیں ہیں بلکہ یہ نام بھی اکثر قرآنی سورتوں کی طرح صرف علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول پہلی آیت ہی اس بات کی نشان دہی کر دیتی ہے کہ یہ سورت معراج کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ معراج کا واقعہ حدیث اور سیرت کی اکثر روایات کے مطابق ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا اس لیے یہ سورت بھی انہی سورتوں میں سے ہے جو مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئیں۔

پس منظر اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ آپؐ کے مخالفین آپ کا راستہ روکنے کے لیے سارے جتن کر چکے تھے مگر ان کی تمام مزاحمتوں کے باوجود آپ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا تھا جس میں دو چار آدمی آپ کی دعوت سے متأثر نہ ہو چکے ہوں۔ خود مکے میں ایسے مخلص لوگوں کا ایک مختصر جتھا بن چکا تھا جو ہر خطرے کو اس دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے انگیز کرنے کو تیار تھے۔ مدینے میں اوس اور خزرج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد آپ کی حامی بن چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آلگا تھا جب آپ کو مکے سے مدینے کی طرف منتقل ہو جانے اور منتشر مسلمانوں کو سمیٹ کر اسلام کے اصولوں پر ایک ریاست قائم کر دینے کا موقع ملنے والا تھا۔

ان حالات میں معراج پیش آئی اور واپسی پر یہ پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو سنایا۔

موضوع اور مضمون اس سورت میں تنبیہ، تفہیم اور تعلیم تینوں ایک متناسب انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔

تنبیہ کفارِ مکہ کو کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے انجام سے سبق لو اور خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر، جس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آلگا ہے، سنبھل جاؤ اور اس دعوت کو قبول کر لو جسے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ مٹا دیئے جاؤ گے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگ زمین پر بسا دیئے جائیں گے۔ نیز ضمناً بنی اسرائیل کو بھی، جو ہجرت کے بعد عنقریب زبانِ وحی کے مخاطب ہونے والے تھے، یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلے جو سزائیں تمہیں مل چکی ہیں اُن سے عبرت حاصل کرو اور اب جو موقع تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے مل رہا ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ، یہ آخری موقع بھی اگر تم نے کھو دیا اور پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو دردناک انجام سے دوچار ہوگے۔

تفہیم کے پہلو میں بڑے دل نشین طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ انسانی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کا مدار دراصل کن چیزوں پر ہے۔ توحید، معاد، نبوت اور قرآن کے برحق ہونے کی دلیلیں دی گئی ہیں۔ اُن شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو ان بنیادی حقیقتوں کے بارے میں کفارِ مکہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے اور استدلال کے ساتھ بیچ بیچ میں منکرین کی جہالتوں پر زجر و توبیخ بھی کی گئی ہے۔

تعلیم کے پہلو میں اخلاق اور تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوت محمدیؐ کے پیشِ نظر تھا۔ یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہلِ عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ خاکہ ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کی اور پھر پوری انسانیت کی زندگی کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان سب باتوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ مشکلات کے اس طوفان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہیں اور کفر کے ساتھ مصالحت کا خیال تک نہ کریں۔ نیز مسلمانوں کو جو کبھی کبھی کفار کے ظلم و ستم اور ان کی کج بحثیوں اور ان کے طوفانِ کذب و افترا پر بے ساختہ جھنجھلا اٹھتے تھے تلقین کی گئی ہے کہ پورے صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہیں اور تبلیغ و اصلاح کے کام میں اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ اس سلسلہ میں اصلاح نفس اور تزکیۂ نفس کے لیے اُن کو نماز کا نسخہ بتایا گیا ہے کہ یہ چیز ہے جو تم کو اُن صفاتِ عالیہ سے متصف کرے گی جن سے راہِ حق کے مجاہدوں کو آراستہ ہونا چاہیئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب پنج وقتہ نماز پابندیٔ وقت کے ساتھ مسلمانوں پر فرض کی گئی۔

الکہف

نام اس سورہ کا نام پہلے رکوع کی نویں آیت اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ سے ماخوذ ہے۔
اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں کہف کا لفظ آیا ہے۔

زمانۂ نزول یہاں سے اُن سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جو مکّی زندگی کے تیسرے دَور میں نازل ہوئی ہیں۔ مکّی زندگی کو ہم نے چار بڑے بڑے دَوروں میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل سورۂ انعام کے دیباچے میں گزر چکی ہے۔ اِس تقسیم کے لحاظ سے تیسرا دَور تقریباً ۵ھ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر قریب قریب ۱۰ھ نبوی تک چلتا رہا۔ اس دَور کو جو چیز دوسرے دَور سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے دَور میں تو قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تحریک اور جماعت کو دبانے کے لیے زیادہ تر تضحیک، اِستہزاء، اعتراضات، الزامات، تخویف، اِطماع اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر اعتماد کر رکھا تھا مگر اس تیسرے دَور میں انہوں نے ظلم و ستم مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار پوری سختی کے ساتھ استعمال کیے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک چھوڑ کر حبش کی طرف نکل جانا پڑا اور باقی ماندہ مسلمانوں کو اور ان کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر کے ان کا مکمل معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کر دیا گیا۔ تاہم اس دَور میں دو شخصیتیں ـــ ابوطالب اور اُم المومنین حضرت خدیجہؓ ـــ ایسی تھیں جن کے ذاتی اثر کی وجہ سے قریش کے دو بڑے خاندان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ۱۰ھ نبوی میں ان دونوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ دَور ختم ہو گیا اور چوتھا دَور شروع ہوا جس میں مسلمانوں پر مکّے کی زندگی تنگ کر دی گئی یہاں تک کہ آخر کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام مسلمانوں کو مکّہ سے نکل جانا پڑا۔

سورۂ کہف کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسرے دَور کے آغاز

میں نازل ہوئی ہوگی، جبکہ ظلم وستم اور مزاحمت نے شدت تو اختیار کر لی تھی مگر ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحابِ کہف کا قصہ سنایا گیا تاکہ ان کی ہمت بندھے اور انہیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

موضوع اور مضمون

یہ سورہ مشرکینِ مکہ کے تین سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے آپ کے سامنے پیش کیے تھے۔ اصحابِ کہف کون تھے؟ قصۂ خضر کی حقیقت کیا ہے[1] اور ذوالقرنین کا کیا قصہ ہے؟ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اسی لیے اہلِ کتاب نے امتحان کی غرض سے ان کا انتخاب کیا تھا، تاکہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبی کی زبان سے ان کے سوالات کا پورا جواب دیا بلکہ اُن کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصوں کو پوری طرح اُس صورتِ حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اُس وقت مکہ میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی۔

۱۔ اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے اور اُن کا حال مکے کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رویہ کفارِ قریش کے رویہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو تب بھی اس کو باطل

---

[1] روایات میں آتا ہے کہ دوسرا سوال روح کے متعلق تھا جس کا جواب بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں دیا گیا ہے، مگر سورۂ کہف اور بنی اسرائیل کے زمانۂ نزول میں کئی سال کا فرق ہے، اور سورۂ کہف میں دو کے بجائے تین قصے بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا سوال دراصل قصۂ خضر سے متعلق تھا نہ کہ روح سے متعلق۔ خود قرآن میں بھی ایک اشارہ ایسا موجود ہے جس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۶۱)

کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ضمناً کفارِ مکہ کو یہ بھی بتایا کہ اصحابِ کہف کا قصہ عقیدۂ آخرت کی صحت کا ایک ثبوت ہے جس طرح خدا نے اصحابِ کہف کو ایک مدتِ دراز تک موت کی نیند سُلانے کے بعد پھر جِلا اُٹھایا، اُسی طرح اُس کی قدرت سے وہ بعث بعد الموت بھی کچھ بعید نہیں ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔

۲۔ اصحابِ کہف کے قصے سے راستہ نکال کر اُس ظلم وستم اور تحقیر وتذلیل پر گفتگو شروع کر دی گئی جو مکے کے سردار اور کھاتے پیتے لوگ اپنی بستی کی چھوٹی سی نومسلم جماعت کے ساتھ برت رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ نہ ان ظالموں سے کوئی مصالحت کرو اور نہ اپنے غریب ساتھیوں کے مقابلے میں ان بڑے بڑے لوگوں کو کوئی اہمیت دو۔ دوسری طرف اُن رئیسوں کو نصیحت کی گئی کہ اپنے چند روزہ عیشِ زندگانی پر نہ بھولو بلکہ ان بھلائیوں کے طالب بنو جو ابدی اور پائیدار ہیں۔

۳۔ اسی سلسلۂ کلام میں قصہ خضر وموسیٰ کچھ اس انداز سے سنایا گیا کہ اس میں کفار کے سوالات کا جواب بھی تھا اور مومنین کے لیے سامانِ تسلی بھی۔ اس قصے میں دراصل جو سبق دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے وہ چونکہ تمہاری نظر سے پوشیدہ ہیں اس لیے تم بات بات پر حیران ہوتے ہو کہ یہ کیوں ہو گیا؟ یہ تو بڑا غضب ہوا، حالانکہ اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو تمہیں خود معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور بظاہر جس چیز میں بُرائی نظر آتی ہے۔ آخر کار وہ بھی کسی نتیجۂ خیر ہی کے لیے ہوتی ہے۔

۴۔ اس کے بعد قصۂ ذوالقرنین ارشاد ہوتا ہے اور اس میں سائلوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم تو اپنی اتنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرماں روا اور ایسا زبردست فاتح اور اس قدر عظیم الشان ذرائع کا مالک ہو کر بھی اپنی حقیقت کو نہ بھولا تھا اور اپنے خالق کے آگے ہمیشہ سرِ تسلیم خم رکھتا تھا۔ نیز یہ کہ تم اپنی ذرا ذرا سی حویلیوں اور بغیچوں کی بہار کو لازوال سمجھ بیٹھے ہو مگر وہ دنیا کی سب سے زیادہ مستحکم دیوارِ تحفظ بنا کر بھی یہی سمجھتا تھا کہ اصل بھروسے کے لائق اللہ ہے نہ کہ یہ دیوار۔ اللہ کی مرضی جب تک ہے یہ دیوار دشمنوں کو روکتی رہے گی اور جب اُس کی مرضی کچھ اور ہو گی تو اس دیوار میں رخنوں اور شگافوں کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

اس طرح کفار کے امتحانی سوالات کو انہی پر پوری طرح اُلٹ دینے کے بعد خاتمۂ کلام میں پھر اُنہی باتوں کو دہرا دیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوئی ہیں یعنی یہ کہ توحید اور آخرت سراسر حق ہیں اور تمہاری اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ انہیں مانو، ان کے مطابق اپنی اصلاح کرو اور خدا کے حضور اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے دُنیا میں زندگی بسر کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی خراب ہوگی اور تمہارا سب کچھ کیا کرایا اکارت جائے گا۔

مَرْیَمْ

نام اِس سورت کا نام آیت وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں حضرت مریم کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا زمانۂ نزول ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا ہے۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرینِ اسلام جب نجاشی کے دربار میں بلائے گئے تھے۔ اس وقت حضرتِ جعفر نے یہی سورۃ بھرے دربار میں تلاوت فرمائی تھی

تاریخی پس منظر جس دَور میں یہ سورہ نازل ہوئی اس کے حالات کی طرف ہم کسی حد تک سورۂ کہف کے دیباچے میں اشارہ کر چکے ہیں لیکن وہ مختصر اشارہ اس سورہ کو اور اس دَور کی دوسری سورتوں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے ہم ذرا اُس وقت کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

قریش کے سردار جب تضحیک، استہزاء، اطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریکِ اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ظلم وستم، مارپیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے اپنے قبیلے کے نو مسلموں کو تنگ پکڑا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک، پیاس کی تکلیفیں دے کر، حتیٰ کہ سخت جسمانی اذیتیں دے دے کر انہیں اسلام چھوڑنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور وہ موالی جو قریش والوں کے تحت زیر دست کی حیثیت سے رہتے تھے، بُری طرح پیسے گئے۔ مثلاً بلالؓ، عامر بن فُہیرہ، اُم عُبیس، زِنّیرہ، عمّار بن یاسر اور ان کے والدین وغیرہم۔ ان لوگوں کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکے کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے

پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے ان سے کام لے لیا جاتا اور اُجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت خبّاب بن اَرت کی یہ روایت موجود ہے کہ:-

"میں مکّے میں لوہار کا کام کرتا تھا۔ مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اُجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اُجرت نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔"

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوشش کی جاتیں اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے، ان کو ہر طریقے سے ذلیل و رُسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خبّاب کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟" یہ سن کر آپ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپ نے فرمایا "تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے اُن پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔" (بخاری)

یہ حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضور نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشة فان بها ملکا لا یظلم عنده احد وھی ارض صدق حتی یجعل الله لکم فرجا مما انتم فیه۔ "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ، وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔"

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مَردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی

یہاں تک کہ ۸۳ مرد گیارہ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن ۔۔۔ ابوجہل کے بھائی سلمہ ابن ہشام، اس کے چچازاد بھائی ہشام بن ابی حذیفہ اور عیاش بن ابی ربیعہ اور اس کی چچازاد بہن حضرت ام سلمہ۔ ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ۔ عتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے سگے بھائی ابوحذیفہ۔ سہیل بن عمرو کی بیٹی سہلہ اور اسی طرح دوسرے سرداران قریش اور مشہور دشمنان اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے اور بعض لوگوں کے دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ آخر کار مسلمان ہو کر رہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعہ سے لگی تھی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰ بنت حثمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمرؓ آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے "عبداللہ کی ماں جا رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "ہاں، خدا کی قسم تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا ہے، خدا کی زمین کھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔" یہ سن کر عمر کے چہرے پر رقت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ "خدا تمہارے ساتھ ہو۔"

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی کو اس پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ ام المومنین حضرت سلمہ نے (جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیان سلطنت میں خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس

بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانے دینے کے بعد کہا کہ "ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔" ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے "ایسے لوگوں کو ضرور نکال دینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔" مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ "اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔" چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بُلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم وکاست پیش کریں گے خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا؟ اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں۔ پھر ان مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس امید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہو گا۔ نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے نبی پر اترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰ

اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ اس کی داڑھی تر ہوگئی۔ جب حضرت جعفر نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور عیسیٰ جو کچھ لائے تھے دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، خدا کی قسم میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہ کروں گا۔"

دوسرے روز عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بہت بڑی بات کہتے ہیں۔" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عمروؓ کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے جمع ہوکر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے بڑے پریشان تھے مگر پھر بھی اصحاب رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسولؐ نے سکھائی۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال دہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامل کہا کہ ھو عبد اللہ و رسولہ و روحہ و کلمتہ القاھا الی مریم العذراء البتول "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا۔" نجاشی نے سن ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا۔ "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اس سے ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔" اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیے واپس کر دیئے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

موضوع اور مضمون

اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اس سورہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اوّلین بات نمایاں ہوکر ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

پہلے دو رکوعوں میں حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا قصہ سنانے کے بعد پھر تیسرے رکوع میں حالاتِ زمانہ کی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا قصہ سنایا گیا ہے کیونکہ ایسے ہی حالات میں وہ بھی اپنے باپ اور خاندان اور اہلِ ملک کے ظلم سے تنگ آکر وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے اس سے ایک طرف کفارِ مکہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان ابراہیمؑ کی پوزیشن میں ہیں اور تم لوگ اُن ظالموں کی پوزیشن میں ہو جنہوں نے تمہارے باپ اور پیشوا ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام وطن سے نکل کر تباہ نہ ہوئے بلکہ اور زیادہ سربلند ہو گئے ایسا ہی انجام نیک تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

اس کے بعد چوتھے رکوع میں دوسرے انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، مگر انبیاء کے گزر جانے کے بعد ان کی اُمتیں بگڑتی رہی ہیں اور آج مختلف اُمتوں میں جو گمراہیاں پائی جاتی رہی ہیں یہ اسی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔

آخری دو رکوعوں میں کفارِ مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ دشمنانِ حق کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

طٰهٰ

زمانۂ نزول

اس سورۃ کا زمانۂ نزول سورۂ مریم کے زمانے قریب ہی کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہجرت حبشہ کے زمانے میں یا اس کے بعد نازل ہوئی ہو۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے یہ نازل ہو چکی تھی۔

ان کے قبولِ اسلام کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر روایت یہ ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تو راستہ میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری اپنی بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں اُن کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید بیٹھے ہوئے حضرت خبّابؓ بن اَرت سے ایک صحیفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی ان کی بہن نے صحیفہ فوراً چُھپا لیا۔ مگر حضرت عمرؓ اس کے پڑھنے کی آواز سن چکے تھے۔ انہوں نے پہلے کچھ پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد بہنوئی پر پل پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے بچانا چاہا تو انہیں بھی مارا۔ یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ آخر کار بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا کہ ہاں ہم مسلمان ہو چکے ہیں تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو۔ حضرت عمرؓ بہن کا خون بہتے دیکھ کر کچھ پشیمان سے ہو گئے، اور کہنے لگے کہ اچھا مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن نے پہلے قسم لی کہ وہ اسے پھاڑ نہ دیں گے۔ پھر کہا کہ تم جب تک غسل نہ کر لو اس پاک صحیفے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور پھر وہ صحیفہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں یہی سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ پڑھتے پڑھتے یک لخت ان کی زبان سے نکلا "کیا خوب کلام ہے۔" یہ سنتے ہی حضرت خباب بن اَرت جو اُن کی آہٹ پاتے ہی چُھپ گئے تھے باہر آ گئے اور کہا کہ "بخدا مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے

اپنے نبی کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا۔ کل ہی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خدایا ابوالحکیم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب، دونوں میں سے کسی کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اے عمرؓ، اللہ کی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو۔" اِس فقرے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور اسی وقت حضرت خبّاب کے ساتھ جاکر حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کر لیا۔ یہ ہجرتِ حبشہ سے تھوڑی مدت بعد ہی کا قصہ ہے۔

موضوع و مبحث

سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اے محمد! یہ قرآن تم پر کچھ اس لیے نازل نہیں کیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے تم کو ایک مصیبت میں ڈال دیا جائے۔ تم سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ پتھر کی چٹانوں سے دودھ کی نہر نکالو۔ نہ ماننے والوں کو منوا کر چھوڑو اور ہٹ دھرم لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کر کے دکھاؤ۔ یہ تو بس ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے تاکہ جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور جو اس کی پکڑ سے بچنا چاہے وہ سن کر سیدھا ہو جائے۔ یہ مالکِ زمین و آسمان کا کلام ہے۔ اور خدائی اس کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے

اس تمہید کے بعد یکایک حضرت موسیٰؑ کا قصہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ یہ محض ایک قصّے کی شکل میں بیان ہوا ہے۔ وقت کے حالات کی طرف اس میں کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ مگر جس ماحول میں یہ قصہ سنایا گیا ہے اس کے حالات سے مل جل کر یہ اہلِ مکّہ سے کچھ اور باتیں کرتا نظر آتا ہے جو اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے بین السطور سے ادا ہو رہی ہیں۔ ان باتوں کی تشریح سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ عرب میں کثیر التعداد یہودیوں کی موجودگی اور اہلِ عرب پر یہودیوں کے علمی و ذہنی تفوّق کی وجہ سے، نیز روم اور حبش کی عیسائی سلطنتوں کے اثر سے بھی عربوں میں بالعموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھنے کے بعد دیکھیے کہ وہ باتیں کیا ہیں جو اس قصّے کے بین السطور سے اہلِ مکّہ کو جتائی گئی ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کسی کو نبوّت اس طرح عطا نہیں کیا کرتا کہ ڈھول تاشے اور نفیریاں بجا کر ایک خلق اکٹھی کر لی جائے اور پھر باقاعدہ ایک تقریب کی صورت میں یہ اعلان کیا جائے کہ آج سے فلاں شخص کو ہم نے نبی مقرر کیا ہے۔ نبوّت تو جس کو بھی دی گئی ہے، کچھ اسی طرح بصیغۂ راز دی گئی

تھی۔ اب تمہیں کیوں اس بات پر اچنبھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یکایک نبی بن کر تمہارے سامنے آ گئے اور اس کا اعلان نہ آسمان سے ہوا، نہ زمین پر فرشتوں نے چل پھر کر اس کا ڈھول پیٹا۔ ایسے اعلانات پہلے نبیوں کے تقرر پر کب ہوئے تھے کہ آج ہوتے؟

(۲) جو بات آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) ٹھیک وہی بات منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سکھائی تھی۔

(۳) پھر جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی سر و سامان اور لاؤ لشکر کے تنِ تنہا قریش کے مقابلے میں دعوتِ حق کا علم بردار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی یکایک اتنے بڑے کام پر مامور کر دیئے گئے تھے کہ جا کر فرعون جیسے جبّار بادشاہ کو سرکشی سے باز آنے کی تلقین کریں۔ کوئی لشکر اُن کے ساتھ بھی نہیں بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے ایسے ہی عجیب ہیں۔ وہ مدین سے مصر جانے والے ایک مسافر کو راہ چلتے پکڑ کر بلا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جا اور وقت کے سب سے بڑے جابر حکمراں سے ٹکرا جا۔ بہت کیا تو اس کی درخواست پر اس کے بھائی کو مددگار کے طور پر دے دیا۔ کوئی فوج فرا اور ہاتھی گھوڑے اس کارِ عظیم کے لیے اس کو نہیں دیے گئے۔

(۴) جو اعتراضات اور شبہات اور الزامات اور مکر و ظلم کے ہتھکنڈے اہلِ مکہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں اُن سے بڑھ چڑھ کر وہی سب ہتھیار فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں استعمال کیے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ کس طرح وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہوا اور آخر کار کون غالب آ کر رہا، خدا کا بے سر و سامان نبی؟ یا لاؤ لشکر والا فرعون؟ اس سلسلہ میں خود مسلمانوں کو بھی ایک غیر ملفوظ تسلی دی گئی ہے کہ اپنی بے سر و سامانی اور کفار قریش کے سامان پر نہ جائیں جس کام کے پیچھے خدا کا ہاتھ ہوتا ہے وہ آخر کار غالب ہی ہو کر رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے ساحرانِ مصر کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب حق اُن پر منکشف ہو گیا تو وہ بے دھڑک اُس پر ایمان لے آئے اور پھر فرعون کے انتقام کا خوف انہیں بال برابر بھی ایمان کی راہ سے نہ ہٹا سکا۔

(۵) آخر میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک شہادت پیش کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں اور معبودوں کے گھڑے جانے کی ابتدا کس مضحکہ انگیز طریقے سے ہوا کرتی ہے اور یہ

کہ خدا کے نبی اس گھناؤنی چیز کا نام و نشان تک باقی رہنے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ پس آج اس شرک اور بت پرستی کی جو مخالفت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں وہ نبوت کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

اسی طرح قصہ موسیٰؑ کے پیرائے میں اُن تمام معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اس وقت اُن کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی کشمکش سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر وعظ کیا گیا کہ بہر حال یہ قرآن ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے جو تمہاری اپنی زبان میں تم کو سمجھانے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اس پر کان دھرو گے اور اس سے سبق لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود برا انجام دیکھو گے۔

پھر آدم علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جس روش پر تم لوگ جا رہے ہو یہ دراصل شیطان کی پیروی ہے۔ اَحیاناً شیطان کے بہکائے میں آ جانا تو خیر ایک وقتی کمزوری ہے جس سے انسان بمشکل ہی بچ سکتا ہے مگر آدمی کے لیے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ جب اس پر اس کی غلطی واضح کر دی جائے تو وہ اپنے باپ آدم کی طرح صاف صاف اس کا اعتراف کرنے، توبہ کرے اور پھر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے۔ غلطی اور اس پر ہٹ اور نصیحت پر نصیحت کیے جانے پر بھی اس سے باز نہ آنا، اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے جس کا نقصان آدمی کو خود ہی بھگتنا پڑے گا، کسی دوسرے کا کچھ نہ بگڑے گا۔

آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ ان منکرینِ حق کے معاملے میں جلدی اور بے صبری نہ کرو۔ خدا کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و انکار پر فوراً نہیں پکڑ لیتا بلکہ سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے۔ لہٰذا گھبراؤ نہیں، صبر کے ساتھ ان لوگوں کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جاؤ اور نصیحت کا حق ادا کرتے رہو۔

اسی سلسلے میں نماز کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اہلِ ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا ہوں جو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہیں۔

الانبیاء

نام

اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسلسل بہت سے انبیاء کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام "الانبیاء" رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورۃ کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

زمانۂ نزول

مضمون اور اندازِ بیان دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول مکّے کا دورِ متوسط، یعنی ہماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کا تیسرا دور ہے۔ اس کے پس منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دور کی سورتوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

موضوع اور مضمون

اس سورہ میں وہ کشمکش زیرِ بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرتؐ کے دعوائے رسالت اور آپ کی دعوتِ توحید و عقیدۂ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جا رہی تھیں ان پر زجر و توبیخ کی گئی ہے اور ان حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپ کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے اس پر متنبہ کیا گیا ہے اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو وہ دراصل تمہارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

دورانِ تقریر میں خاص طور پر جو امور زیرِ بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) کفارِ مکّہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

رسول ماننے سے انکار کرنا ـــــ اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

(۲) اُن کا آپ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر نہ جمنا ـــــ اس پر مختصر مگر نہایت پُرزور اور معنی خیز طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

(۳) ان کا یہ تصوّر کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روز کھیل کر یوں ہی ختم ہو جانا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا ہے، کسی حساب کتاب اور جزا و سزا سے سابقہ نہیں پیش آنا ہے ـــــ یہ چیز چونکہ اُس غفلت و بے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

(۴) شرک پر ان کا اصرار اور توحید کے خلاف ان کا جاہلانہ تعصب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نزاع تھا ـــــ اس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور توحید کے حق میں مختصر مگر بہت دل نشین دلائل دیئے گئے ہیں۔

(۵) ان کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار جھٹلانے کے باوجود جب ان پر کوئی عذاب نہیں آتا تو ضرور نبی جھوٹا ہے اور عذابِ الٰہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے ہمیں سناتا ہے محض خالی خولی دھمکیاں ہیں ـــــ اس کو استدلال اور نصیحت دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیاء علیہم السّلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظیریں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوّت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دنیا کے عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ الوہیت اور خدائی کا ان میں شائبہ تک نہ تھا بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اُس کے ساتھ انہی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اور بھی واضح کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ انبیاء پر طرح طرح کے مصائب آئے ہیں اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو برباد کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی ہے اور باقی جتنے مذاہب دنیا میں

بنے ہیں وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے تفرقے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہوں گے، اور جو لوگ اسے رد کردیں گے وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبی کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

اَلحَجّ

نام چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس سورے میں مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہوا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے مضامین اور اندازِ بیان کا یہ رنگ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکی دور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

ابتدائی حصے کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکی زندگی کے آخری دور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا ہے۔ یہ حصہ آیت ۲۴ (وَھُدُوۡٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ وَ ھُدُوۡٓا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ) پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر تک کا حصہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ذی الحجہ میں نازل ہوا ہو کیونکہ آیت ۲۵ سے ۴۱ تک کا مضمون اسی بات کی نشان دہی کرتا ہے، اور آیت ۳۹۔ ۴۰ کی شانِ نزول بھی اس کی مؤید ہے۔ اُس وقت مہاجرین ابھی تازہ تازہ ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے میں آئے تھے۔ حج کے زمانے میں اُن کو اپنا شہر اور حج کا اجتماع یاد آرہا ہوگا اور یہ بات بری طرح کھل رہی ہوگی کہ مشرکینِ قریش نے ان پر مسجد حرام کا راستہ تک بند کر دیا ہے۔ اُس زمانے میں وہ اس بات کے بھی منتظر ہوں گے کہ جن ظالموں نے ان کو گھروں سے نکالا، مسجد حرام کی زیارت سے محروم کیا اور خدا کا راستہ اختیار کرنے پر ان کی

زندگی تنگ دشوار کر دی۔ اُن کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ ٹھیک نفسیاتی موقع تھا ان آیات کے نزول کا۔ ان میں پہلے تو حج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مسجد حرام اس لیے بنائی گئی تھی اور یہ حج کا طریقہ اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی بندگی کی جائے، مگر آج وہاں شرک ہو رہا ہے اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والوں کے لیے اس کے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں اور انہیں بے دخل کر کے ملک میں وہ نظامِ صالح قائم کریں جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں فروغ پائیں۔ ابن عباس، مجاہد، عُروہ بن زُبیر، زید بن اسلم، مقاتل بن حیان، قتادہ اور دوسرے اکابر مفسّرین کا بیان ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی اور حدیث و سیرت کی روایات سے ثابت ہے کہ اس اجازت کے بعد فوراً ہی قریش کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں اور پہلی مہم صفر ۲ھ میں ساحل بحرِ احمر کی طرف روانہ ہوئی جو غزوۂ وَدّان یا غزوۂ اَبْواء کے نام سے مشہور ہے۔

موضوع و مبحث اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں۔ مشرکینِ مکّہ، مذبذب اور متردّد مسلمان اور مومنین صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکّے میں کی گئی اور مکّے میں اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے بے بنیاد جاہلانہ خیالات پر اصرار کیا، خدا کو چھوڑ کر ان معبودوں پر اعتماد کیا جن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے اور خدا کے رسول کو جھٹلا دیا۔ اب تمہارا انجام وہی کچھ ہو کر رہے گا جو تم سے پہلے اس روش پر چلنے والوں کا ہو چکا ہے۔ نبی کو جھٹلا کر اور اپنی قوم کے صالح ترین عنصر کو نشانۂ ستم بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خدا کا جو غضب تم پر نازل ہوگا، اس سے تمہارے بناوٹی معبود تمہیں بچا نہ سکیں گے۔ اس تنبیہ و انذار کے ساتھ افہام و تفہیم کا پہلو بالکل خالی نہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری سورۃ میں جگہ جگہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی پیش کیے ہیں۔

مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت

کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ آخر کیسا ایمان ہے کہ راحت، مسرت، عیش نصیب ہو تو خدا تمہارا خدا اور تم اس کے بندے مگر جہاں خدا کی راہ میں مصیبت آئی اور سختیاں جھیلنی پڑیں پھر نہ خدا تمہارا خدا رہا اور نہ تم اس کے بندے۔ حالانکہ تم اپنی اس روش سے کسی ایسی مصیبت اور نقصان اور تکلیف کو نہیں ٹال سکتے جو خدا نے تمہارے نصیب میں لکھ دی ہو۔

اہلِ ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے۔ ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی اور دوسرے خطاب میں صرف اہلِ ایمان مخاطب ہیں۔

پہلے خطاب میں مشرکینِ مکّہ کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے، حالانکہ مسجد حرام ان کی ذاتی جائداد نہیں ہے اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے۔ یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بجائے خود حق بجانب تھا بلکہ سیاسی حیثیت سے یہ قریش کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بھی تھا۔ اس سے عرب کے تمام دوسرے قبائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا گیا کہ قریش حرم کے مجاور ہیں یا مالک؟ اگر آج اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر وہ ایک گروہ کو حج سے روک دیتے ہیں اور اسے برداشت کر لیا جاتا ہے تو کیا بعید ہے کہ کل جس سے بھی اُن کے تعلقات خراب ہوں اس کو وہ حدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیں اور اس کا عمرہ و حج بند کر دیں۔ اس سلسلے میں مسجد حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام نے جب خدا کے حکم سے اس کو تعمیر کیا تھا تو سب لوگوں کو حج کا اذنِ عام دیا تھا اور وہاں اوّل روز سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق یکساں قرار دیے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھر شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ اب یہ کیا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع اور بتوں کی پرستش کے لیے ہو پوری آزادی۔

دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تمہیں اقتدار حاصل ہو تو تمہاری روش کیا ہونی چاہیئے اور اپنی حکومت میں تم کو کس مقصد کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ یہ مضمون سورہ کے

وسط میں بھی ہے اور آخر میں بھی۔ آخر میں گروہِ اہلِ ایمان کے لیے "مسلم" کے نام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ابراہیم کے اصل جانشین تم لوگ ہو، تمہیں اس خدمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے کہ دنیا میں شہادت علی الناس کے مقام پر کھڑے ہو، اب تمہیں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور فعل الخیرات سے اپنی زندگی کو بہترین نمونے کی زندگی بنانا چاہیے اور اللہ کے اعتماد پر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

اس موقع پر سورۂ بقرہ اور سورۂ انفال کے دیباچوں پر بھی نگاہ ڈال لی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

اَلْمُؤْمِنُوْن

نام پہلی ہی آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اندازِ بیان اور مضامین دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول مکے کا دورِ متوسط ہے۔ پس منظر میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے لیکن ابھی کفار کے ظلم و ستم نے پورا زور نہیں پکڑا ہے۔ آیت ۷۵-۷۶ سے صاف طور پر یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ مکے کے اُس قحط کی شدت کے زمانے میں نازل ہوئی ہے جو معتبر روایات کی رو سے اسی دورِ متوسط میں برپا ہوا تھا۔ عروہ بن زبیر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عمرؓ ایمان لا چکے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ سورۃ ان کے سامنے نازل ہوئی ہے۔ وہ خود نزولِ وحی کی کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے اور جب حضورؐ اس سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ اگر کوئی اُن کے معیار پر پورا اُتر جائے تو یقیناً جنت میں جائے گا، پھر آپؐ نے اس سورہ کی ابتدائی آیات سنائیں۔ (احمد، ترمذی، نسائی، حاکم)

موضوع اور مباحث اتباعِ رسول کی دعوت اس سورت کا مرکزی مضمون ہے اور پوری تقریر اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔

آغازِ کلام اس طرح ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس پیغمبر کی بات مان لی ہے اُن کے اندر یہ اور یہ اوصاف پیدا ہو رہے ہیں اور یقیناً ایسے ہی لوگ دنیا و آخرت کی فلاح کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد انسان کی پیدائش، آسمان و زمین کی پیدائش، نباتات و حیوانات کی پیدائش

اور دوسرے آثارِ کائنات کی طرف تو یہ دلائی گئی ہے جس سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ توحید اور معاد کی جن حقیقتوں کو ماننے کے لیے یہ پیغمبر تم سے کہتا ہے ان کے برحق ہونے پر تمہارا وجود اور یہ پورا نظامِ عالم گواہ ہے۔

پھر انبیاء علیہم السّلام اور ان کی امتوں کے قصّے شروع کیے گئے ہیں جو بظاہر تو قصّے ہی نظر آتے ہیں لیکن دراصل اس پیرائے میں چند باتیں سامعین کو سمجھائی گئی ہیں:۔

اوّل یہ کہ آج تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو شبہات و اعتراضات وارد کر رہے ہو وہ کچھ نئے نہیں ہیں۔ پہلے بھی انبیاء دنیا میں آئے تھے جن کو تم خود فرستادۂ الٰہی مانتے ہو ان سب پر ان کے زمانے کے جاہلوں نے یہی اعتراضات کیے تھے۔ اب دیکھ لو کہ تاریخ کا سبق کیا بتا رہا ہے: اعتراضات کرنے والے برحق تھے یا انبیاء؟

دوم یہ کہ توحید و آخرت کے متعلق جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں یہی تعلیم ہر زمانے کے انبیاء نے دی ہے۔ اس سے مختلف کوئی نرالی چیز نہیں پیش کی جا رہی ہے جو کبھی دنیا نے نہ سُنی ہو۔

سوم یہ کہ جن قوموں نے انبیاء کی بات سُن کر نہ دی اور ان کی مخالفت پر اصرار کیا وہ آخر کار تباہ ہو کر رہیں۔

چہارم یہ کہ خدا کی طرف سے ہر زمانے میں ایک ہی دین آتا رہا ہے اور تمام انبیاء ایک ہی اُمّت کے لوگ تھے۔ اس دینِ واحد کے سوا جو مختلف مذاہب تم لوگ دنیا میں دیکھ رہے ہو یہ سب لوگوں کے طبع زاد ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی من جانب اللہ نہیں ہے۔

ان قصّوں کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیوی خوش حالی، مال و دولت، آل و اولاد، حَشَم و خَدَم، قوّت و اقتدار وہ چیزیں نہیں ہیں جو کسی شخص یا گروہ کے راہِ راست پر ہونے کی یقینی علامت ہوں اور اس بات کی دلیل قرار دی جائیں کہ خدا اس پر مہربان ہے اور اس کا رویہ خدا کو محبوب ہے۔ اسی طرح کسی کا غریب اور خستہ حال ہونا بھی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا اُس سے اور اُس کے رویّے سے ناراض ہے۔ اصل چیز جس پر خدا کے ہاں محبوب یا مغضوب ہونے کا مدار ہے وہ آدمی کا ایمان اور اس کی خدا ترسی و راستبازی ہے۔ یہ باتیں اس لیے ارشاد ہوئی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی دعوت کے مقابلے میں اُس وقت جو مزاحمت ہو رہی تھی اس کے علم بردار سب کے سب مکے کے شیوخ اور بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ اپنی جگہ خود بھی یہ گھمنڈ رکھتے تھے اور ان کے زیرِ اثر لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نعمتوں کی بارش جن لوگوں پر ہو رہی ہے اور جو بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں ان پر ضرور خدا اور دیوتاؤں کا کرم ہے۔ رہے یہ ٹوٹے مارے لوگ جو محمدؐ کے ساتھ ہیں ان کی تو حالت خود ہی یہ بتا رہی ہے کہ خدا ان کے ساتھ نہیں ہے، اور دیوتاؤں کی تو مار ہی ان پر پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اہلِ مکہ کو مختلف پہلوؤں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ قحط جو تم پر نازل ہوا ہے یہ ایک تنبیہ ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو دیکھ کر سنبھلو اور راہِ راست پر آجاؤ ورنہ اس کے بعد سخت تر سزا آئے گی جس پر بلبلا اٹھو گے۔

پھر اُن کو ازسرِ نو اُن آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو کائنات میں اور خود ان کے اپنے وجود میں موجود ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھو جس توحید اور جس حیات بعدالموت کی حقیقت سے یہ پیغمبر تم کو آگاہ کر رہا ہے، کیا ہر طرف اس کی شہادت دینے والے آثار پھیلے ہوئے نہیں ہیں؟ کیا تمہاری عقل اور فطرت اس کی صحت وصداقت پر گواہی نہیں دیتی؟

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ یہ لوگ تمہارے مقابلے میں کیسا ہی بُرا رویہ اختیار کریں تم بھلے طریقوں ہی سے مدافعت کرنا۔ شیطان کبھی تم کو جوش میں لاکر برائی کا جواب برائی سے دینے پر آمادہ نہ کرنے پائے۔

خاتمۂ کلام پر مخالفینِ حق کو آخرت کی بازپُرس سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ جو کچھ تم دعوتِ حق اور اس کے پیرؤوں کے ساتھ کر رہے ہو اس کا سخت حساب تم سے لیا جائے گا۔

—————*—————

اَلنُّوْر

نام پانچویں رکوع کی پہلی آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول یہ امر متفق علیہ ہے کہ یہ سورت غزوۂ بنی المُصْطَلِق کے بعد نازل ہوئی ہے۔ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول واقعۂ اِفک کے سلسلہ میں ہوا ہے (جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دوسرے اور تیسرے رکوع میں آیا ہے) اور وہ تمام معتبر روایات کی رُو سے غزوۂ بنی المصطلق کے سفر میں پیش آیا تھا لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا یہ غزوہ ۵ھ ہجری میں غزوۂ احزاب سے پہلے ہوا تھا یا ۶ھ میں غزوۂ احزاب کے بعد۔ اصل واقعہ کیا ہے اس کی تحقیق اس لیے ضروری ہے کہ پردے کے احکام قرآن مجید کی دو ہی سورتوں میں آئے ہیں، ایک یہ سورت، دوسری سورۂ احزاب جس کا نزول بالاتفاق غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا ہے۔ اب اگر غزوۂ احزاب پہلے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پردے کے احکام کی ابتدا اُن ہدایات سے ہوئی جو سورۂ احزاب میں وارد ہوئی ہیں اور تکمیل اُن احکام سے ہوئی جو اس سورت میں آئے ہیں اور اگر غزوۂ بنی المصطلق پہلے ہو تو احکام کی ترتیب اُلٹ جاتی ہے اور آغاز سورۂ نُور سے مان کر تکمیل سورۂ احزاب والے احکام پر ماننی پڑتی ہے۔ اس طرح اُس حکمتِ تشریع کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو احکامِ حجاب میں پائی جاتی ہے اسی غرض کے لیے ہم آگے بڑھنے سے پہلے زمانۂ نزول کی تحقیق کر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۵ھ ہجری میں پیش آیا اور پھر ذی القعدہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب (یا غزوۂ خندق) واقع ہوا۔ اس کی تائید میں سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ واقعۂ اُفک کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں ان میں سے بعض میں حضرت سعد بن

عُبادہ اور سعد بن معاذ کے جھگڑے کا ذکر آتا ہے اور تمام معتبر روایات کی رو سے حضرت سعد بن معاذ کا انتقال غزوۂ بنی قریظہ میں ہوا تھا جس کا زمانہ وقوع غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد ہے۔ لہٰذا ۶ھ میں اُن کے موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

دوسری طرف محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوۂ احزاب شوال ۵ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۶ھ کا۔ اس کی تائید وہ کثیر التعداد معتبر روایات کرتی ہیں جو اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ اور دوسرے لوگوں سے مروی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ افک سے پہلے احکامِ حجاب نازل ہو چکے تھے اور وہ سورۂ احزاب میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہو چکا تھا اور وہ غزوۂ احزاب کے بعد ذی القعدہ ۵ھ کا واقعہ ہے اور سورۂ احزاب میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ علاوہ بریں ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب کی بہن حَمْنہ بنتِ جَحش نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں محض اس وجہ سے حصہ لیا تھا کہ حضرت عائشہؓ اُن کی بہن کی سَوکن تھیں اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات پیدا ہونے کے لیے سوکناپے کا رشتہ شروع ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ سب شہادتیں ابن اسحاق کی روایت کو مضبوط کر دیتی ہیں۔

اس روایت کو قبول کرنے میں صرف یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ واقعۂ افک کے زمانے میں حضرت سعد بن معاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے مگر اس مشکل کو جو چیز رفع کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے متعلق حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں ان میں سے بعض میں حضرت سعد بن معاذ کا ذکر ہے اور بعض میں ان کے بجائے حضرت اُسَید بن حُضَیر کا۔ اور یہ دوسری روایت اُن دوسرے واقعات کے ساتھ پوری طرح مطابق ہو جاتی ہے جو اس سلسلے میں خود حضرت عائشہ ہی سے مروی ہیں۔ ورنہ محض سعد بن معاذ کے زمانۂ حیات سے مطابق کرنے کی خاطر اگر غزوہ بنی المصطلق اور قصۂ افک کو غزوہ احزاب و قریظہ سے پہلے کے واقعات مان لیا جائے تو اس پیچیدگی کا کوئی حل نہیں ملتا۔ پھر آیتِ حجاب کا نزول اور نکاح زینبؓ کا واقعہ اُس سے بھی پہلے پیش آنا چاہیے، حالانکہ قرآن اور کثیر التعداد روایاتِ صحیحہ دونوں اس پر شاہد ہیں کہ نکاح زینبؓ اور حکم حجاب احزاب و قُریظہ کے بعد کے واقعات ہیں۔ اسی بنا پر ابنِ حزم اور ابن قیمؒ اور بعض دوسرے محققین نے محمد بن اسحاق کی روایت

ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور ہم بھی اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔

تاریخی پس منظر

اب یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ سورۂ نور ۶ھ ہجری کے نصف آخر میں سورۂ احزاب کے کئی مہینے بعد نازل ہوئی ہے۔ ہمیں اُن حالات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے جن میں اس کا نزول ہوا۔

جنگِ بدر کی فتح سے عرب میں تحریکِ اسلامی کا جو عروج شروع ہوا تھا وہ غزوۂ خندق تک پہنچتے پہنچتے اِس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مشرکین، یہود، منافقین اور متربصین سب ہی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس نوخیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جا سکتی۔ جنگِ خندق میں یہ لوگ متحد ہو کر ۱۰ ہزار فوج کے ساتھ مدینے پر چڑھ آئے تھے مگر ایک مہینے تک سر مارنے کے بعد آخر کار ناکام ہو کر چلے گئے، اور ان کے جاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان فرما دیا۔ لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھذا ولکنکم تغزونھم۔ (ابن ہشام، جلد ۳، ص ۲۶۶) اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔

یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ مخالفِ اسلام طاقتوں کی قوتِ اقدام ختم ہو چکی ہے۔ اب اسلام بچاؤ کی نہیں بلکہ اقدام کی لڑائی لڑے گا اور کفر کو اقدام کے بجائے بچاؤ کی لڑائی لڑنی پڑے گی۔ یہ حالات کا بالکل صحیح جائزہ تھا جسے دوسرا فریق بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

اسلام کے اس روز افزوں عروج کی اصل وجہ مسلمانوں کی تعداد نہ تھی۔ بدر سے خندق تک ہر لڑائی میں کفار اُن سے کئی گنا زیادہ قوت لے کر آئے تھے اور مردم شماری کے لحاظ سے بھی مسلمان اس وقت تک عرب میں بمشکل ۱/۱۰ فی صدی تھے۔ اس عروج کی وجہ مسلمانوں کے اسلحہ کی برتری بھی نہ تھی۔ ہر طرح کے ساز و سامان میں کفار ہی کا پلہ بھاری تھا۔ معاشی طاقت اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا اُن سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے پاس تمام عرب کے معاشی وسائل تھے، اور مسلمان بھوکوں مر رہے تھے۔ اُن کی پشت پر تمام عرب کے مشرک اور اہلِ کتاب قبائل تھے، اور مسلمان ایک نئے دین کی دعوت دے کر قدیم نظام کے سارے حامیوں کی ہمدردیاں کھو چکے تھے۔ ان حالات میں جو چیز مسلمانوں کو برابر آگے بڑھائے لیے جا رہی تھی۔ وہ دراصل مسلمانوں کی اخلاقی برتری تھی جسے تمام دشمنانِ اسلام خود بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایک طرف

وہ دیکھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی بے داغ سیرتیں ہیں جن کی طہارت و پاکیزگی اور مضبوطی دلوں کو مسخر کرتی چلی جارہی ہے اور دوسری طرف انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ انفرادی و اجتماعی اخلاق کی طہارت نے مسلمانوں کے اندر کمال درجے کا اتحاد اور نظم و ضبط بھی پیدا کر دیا ہے جس کے سامنے مشرکین اور یہود کا ڈھیلا نظام جماعت امن اور جنگ دونوں حالتوں میں شکست کھاتا چلا جاتا ہے۔

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اُس کی خوبیاں اُسے بڑھا رہی ہیں تو انہیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے اندر بھی اپنی ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اُوپر خوب گندگی اچھالیں تاکہ دنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کا رُخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر رذیلانہ حملوں اور داخلی فتنہ انگیزیوں کی طرف پھیر دیا، اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے، اس لیے بالارادہ یا بلاارادہ طریق کار یہ قرار پایا کہ مدینے کے منافقین اندر سے فتنے اُٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذی القعدہ ۵ھ میں ہوا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے تبنیت[1] کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے متبنیٰ (زید بن حارثہ) کی مُطلّقہ بیوی (زینبؓ بنتِ جحش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینے کے منافقین پروپیگنڈا کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پردازیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے عجیب عجیب قصے گھڑ گھڑ کر پھیلا دے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے، اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دست بردار ہو گیا اور پھر کس طرح انہوں نے خود اپنی بہو سے بیاہ کر لیا۔ یہ قصے اس کثرت سے پھیلائے گئے کہ مسلمان تک ان کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ محدثین اور مفسرین کے ایک گروہ نے حضرت زینبؓ اور زید کے متعلق جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں آج تک ان

[1] دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانا اور خاندان میں اسے بالکل صلبی بیٹے کی حیثیت دے دینا۔

مَن گھڑت قصّوں کے اجزا پائے جاتے ہیں اور مستشرقینِ مغرب ان کو خوب نمک مرچ لگا کر اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی (اُمَیمَہ بنتِ عبدالمطلب) کی صاحبزادی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضورؐ کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی۔ ان کو اتفاقاً ایک روز دیکھ لینے اور معاذ اللہ ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعہ سے ایک ہی سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو مجبور کر کے حضرت زیدؓ سے ان کی شادی کی تھی۔ ان کے بھائی عبداللہ بن جَحش اس شادی سے ناراض تھے۔ خود حضرت زینبؓ اس پر راضی نہ تھیں، کیونکہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی بننا قریش کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی طبعاً قبول نہ کر سکتی تھی مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں معاشرتی مساوات قائم کرنے کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کریں۔ انہیں حکماً اس پر راضی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوست اور دشمن سب کو معلوم تھیں، اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہ تھا کہ حضرت زینبؓ کا احساس فخرِ نسبی ہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ان کا اور زید بن حارثہؓ کا نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچی۔ مگر اس کے باوجود بے شرم افترا پردازوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بدترین اخلاقی الزامات لگائے، اور ان کو اس کثرت سے رواج دیا کہ آج تک ان کا یہ پروپیگنڈا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔

اس کے بعد دوسرا حملہ غزوہ بنی المُصطَلِق کے موقع پر کیا گیا اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ بنی المصطلق قبیلۂ بنی خُزاعہ کی ایک شاخ تھی جو ساحل بحرِ احمر پر جدّہ اور رابغ کے درمیان قُدَید کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے چشمے کا نام مُرَیسِیع تھا جس کے آس پاس اس قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس مناسبت سے احادیث میں اس مہم کا نام غزوہ مُریسیع بھی آیا ہے۔ نقشے سے اس کی صحیح جائے وقوع معلوم ہو سکتی ہے۔

شعبان ۵ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ ایک لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ فتنے کے سر اٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ اس مہم میں عبداللہ بن اُبَی بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپ کے ساتھ

ہوگیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اِس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے
مُریسیع کے مقام پر آنحضرتؐ نے اچانک دُشمن کو جا لیا اور تھوڑی سی زد و خورد کے بعد پورے قبیلے کو مال
اسباب سمیت گرفتار کر لیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابھی مُریسیع ہی پر لشکر اسلام پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا
کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم (جہجاہ بن مسعود غفاری) اور قبیلہ خزرج کے ایک حلیف (سنان
بن وبر جُہنی) کے درمیان پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے انصار کو پکارا دوسرے نے مہاجرین کو آواز دی
لوگ دونوں طرف سے جمع ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کر دیا گیا، لیکن عبداللہ بن اُبَی نے جو انصار کے
قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتا تھا بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اس نے انصار کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ "یہ
مہاجرین ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ہمارے حریف بن بیٹھے ہیں۔ ہماری اور ان قریشی کنگلوں کی مثال
ایسی ہے کہ کتے کو پال تاکہ تجھی کو بھنبھوڑ کھائے۔ یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود ہی
لا کر انہیں اپنے ہاں بسایا ہے اور ان کو اپنے مال و جائداد میں حصہ دار بنایا ہے۔ آج اگر تم ان سے ہاتھ
کھینچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔" پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ مدینے واپس پہنچنے کے بعد جو ہم میں سے
عزت والا ہے وہ ذلیل لوگوں کو نکال کر باہر کر دے گا۔[1] اُس کی ان باتوں کی اطلاع جب نبی صلی اللہ علیہ
وسلم کو پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کرا دینا چاہیئے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا فکیف یا عمر
اذا تحدث الناس ان محمد ایقتل اصحابہ (عمرؓ، دنیا کیا کہے گی کہ محمد خود اپنے ہی ساتھیوں کو
قتل کر رہا ہے) پھر آپ نے فوراً ہی اس مقام سے کوچ کا حکم دے دیا اور دوسرے دن دوپہر
تک کسی جگہ پڑاؤ نہ کیا تاکہ لوگ خوب تھک جائیں اور کسی کو بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرنے اور سننے کی
مہلت نہ ملے۔ راستے میں اُسید بن حُضیر نے عرض کیا "یا نبی اللہ آج آپ نے اپنے معمول کے
خلاف ناوقت کوچ کا حکم دے دیا۔" آپ نے جواب دیا "تم نے سُنا نہیں کہ تمہارے صاحب
نے کیا باتیں کی ہیں؟" انہوں نے پوچھا "کون صاحب؟" آپ نے فرمایا "عبداللہ بن اُبَی"۔ انہوں
نے عرض کیا "یا رسول اللہ، اس شخص سے رعایت فرمایئے، آپ جب مدینے تشریف لائے ہیں تو ہم
لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپ کی آمد
سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اسی کی جلن وہ نکال رہا ہے۔"

یہ شوشہ ابھی تازہ ہی تھا کہ اسی سفر میں اُس نے ایک اور خطرناک فتنہ اٹھا دیا اور فتنہ

---

[1] سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے خود اس کا یہ قول نقل فرمایا ہے

بھی ایسا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ بکمال درجہ ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینے کی نوخیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ یہ حضرت عائشہؓ پر تہمت کا فتنہ تھا۔ اس کا واقعہ خود انہی کی زبانی سنیئے جس سے پوری صورتِ حال سامنے آجائے گی۔ بیچ بیچ میں جو امور تشریح طلب ہوں گے انہیں ہم دوسری معتبر روایات کی مدد سے قوسین میں بڑھاتے جائیں گے تاکہ جنابِ صدیقہ کے تسلسلِ بیان میں خلل نہ واقع ہو۔ فرماتی ہیں :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ کی بیویوں میں سے کون آپ کے ساتھ جائے[1] غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودے میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے

---

[1] اس قرعہ اندازی کی نوعیت لاٹری کی سی نہ تھی۔ دراصل تمام بیویوں کے حقوق برابر کے تھے ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود کسی کو انتخاب کرتے تو دوسری بیویوں کی دل شکنی ہوتی اور ان میں باہم رشک و رقابت پیدا ہونے کے لیے بھی یہ ایک محرک بن جاتا۔ اس لیے آپ قرعہ اندازی سے اس کا فیصلہ فرماتے تھے۔ شریعت میں قرعہ اندازی ایسی ہی صورتوں کے لیے ہے جب کہ چند آدمیوں کا جائز حق بالکل برابر ہو اور کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو مگر حق کسی ایک ہی کو دیا جا سکتا ہو۔

جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آگئی۔ صبح کے وقت صفوانؓ بن مُعَطّل بن سُلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ صاحب بدری صحابیوں میں سے تھے۔ ان کو صبح دیر تک سوتے کی عادت[1] تھی۔ اس لیے یہ بھی لشکرگاہ میں کہیں پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اُٹھ کر مدینے چلے جا رہے تھے) مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی یہیں رہ گئیں"۔ اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اُٹھ کر فوراً اپنے منھ پر چادر ڈال لی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لاکر اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جا لیا جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھیرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتہ نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اُٹھانے والوں نے بہتان اُٹھا دیے اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن اُبَی تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔

(دوسری روایت میں آیا ہے کہ جس وقت صفوان کے اونٹ پر حضرت عائشہ لشکرگاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح پیچھے چھوٹ گئی تھیں اسی وقت عبداللہ بن اُبَیّ پکار اُٹھا کہ "خدا کی قسم یہ بچ کر نہیں آئی ہے، لو دیکھو، تمہارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ

---

[1] ابوداؤد اور دوسری کتب سُنَن میں یہ ذکر آتا ہے کہ ان کی بیوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صبح کی نماز وقت پر نہیں پڑھتے۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ یا رسول اللہ یہ میرا خاندانی عیب ہے۔ دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دُور نہیں کر سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اچھا جب آنکھ کھلے نماز ادا کر لیا کرو۔ بعض محدثین نے ان کے قافلے سے پیچھے رہ جانے کی یہی وجہ بیان کی ہے مگر بعض دوسرے محدثین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس خدمت پر مقرر کیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں کوچ کرنے کی وجہ سے اگر کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو صبح اسے تلاش کر کے لیتے آئیں۔

گزاری اور اب وہ اسے علانیہ لیے چلا آرہا ہے)۔"

مدینے پہنچ کر میں بیمار ہوگئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف تیکم (کیسی ہیں یہ) خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے، اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمار داری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اُس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مِسطح بن اُثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں، (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی اُن لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے) راستے میں اُن کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔ غارت ہو مسطح۔ میں نے کہا اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگِ بدر میں حصّہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا" بٹیا کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟ پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اُڑا رہے ہیں (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مِسطح، حسّان بن ثابت مشہور شاعرِ اسلام اور حَمنہ بنت جحش، حضرت زینبؓ کی بہن کا حصّہ سب سے نمایاں تھا۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی۔"

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں" میرے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ اور اُسامہؓ بن زید کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اُسامہؓ نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اور عرض کیا" یا رسول اللہ، بھلائی کے سوا آپ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جو اُڑایا جارہا ہے۔ رہے علیؓ تو انہوں نے کہا" یا رسول اللہ عورتوں کی کمی نہیں

ہے۔ آپ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔ چنانچہ خدمت گار کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا "خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں نے اُن میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں کہ بیوی ذرا آٹے کا خیال رکھنا مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔" اسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا "مسلمانو! کون ہے جو اُس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی میں کوئی بُرائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔" اس پر اُسید بن حُضیر (بعض روایات میں سعد بن معاذؓ[1]) نے اُٹھ کر کہا "یا رسول اللہ، اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں، ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔" یہ سنتے ہی سعد بن عُبادہ رئیسِ خزرج اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ "جھوٹ کہتے ہو تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام صرف اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خزرج میں سے ہے۔ اگر وہ تمہارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے[2]۔" اسید بن حُضیر نے جواب میں کہا "تم منافق ہو اسی لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔" اس پر

---

[1] غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نام لینے کی بجائے سیدِ اوس کے الفاظ استعمال فرمائے ہوں گے۔ کسی راوی نے اس سے مراد حضرت معاذ کو سمجھ لیا۔ کیونکہ اپنی زندگی میں وہی قبیلۂ اوس کے سردار تھے اور تاریخ میں وہی اس حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ کے وقت ان کے چچازاد بھائی اُسید بن حُضیر اوس کے سردار تھے۔

[2] حضرت سعد بن عُبادہ اگرچہ نہایت صالح اور مخلص مسلمانوں میں سے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے اور مدینے میں جن لوگوں کے ذریعہ سے اسلام پھیلا تھا ان میں ایک نمایاں شخص وہ بھی تھے۔ لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان کے اندر قومی حمیت اور عرب میں اس وقت قوم کے معنی قبیلے کے تھے بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے عبداللہ بن اُبی کی

مسجد نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد ہی میں لڑ پڑتے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اتر آئے۔"

حضرت عائشہؓ کے قصے کی باقی تفصیلات ہم اثنائے تفسیر میں اُس جگہ نقل کریں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی برأت نازل ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ نے یہ شوشہ چھوڑ کر بیک وقت کئی شکار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ صدیق کی عزت پر حملہ کیا۔ دوسری طرف اس نے اسلامی تحریک کے بلند ترین اخلاقی وقار کو گرانے کی کوشش کی۔ تیسری طرف اس نے یہ ایک ایسی چنگاری پھینکی تھی کہ اگر اسلام اپنے پیروؤں کی کایا نہ پلٹ چکا ہوتا تو مہاجرین اور انصار، اور خود انصار کے بھی دونوں قبیلے آپس میں لڑ مرتے۔

موضوع اور مباحث

یہ تھے وہ حالات جن میں پہلے حملے کے موقع پر سورۂ احزاب کے آخری ۶ رکوع نازل ہوئے اور دوسرے حملے کے موقع پر یہ سورۂ نور اتری۔ اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر ان دونوں سورتوں کا ترتیب وار مقابلہ کیا جائے تو وہ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو ان کے احکام میں مضمر ہے۔

منافقین مسلمانوں کو اس میدان میں شکست دینا چاہتے تھے جو ان کے تفوق کا اصل

پشت پناہی کی۔ کیونکہ وہ ان کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الحرمۃ۔ (آج کشت و خون کا دن ہے۔ آج یہاں کی حرمت حلال کی جائے گی)، اور اس پر عتاب فرما کر حضورؐ نے ان سے لشکر کا جھنڈا واپس لے لیا۔ پھر آخرکار یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے انہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں یہ دعویٰ کیا کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور جب ان کی بات نہ چلی اور انصار و مہاجرین سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تو تنہا وہی ایک تھے جنہوں نے بیعت سے انکار کر دیا اور مرتے دم تک قریشی خلیفہ کی خلافت تسلیم نہ کی۔ (ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر اور الاستیعاب لابن عبدالبر، ذکر سعد بن عُبادہ صفحہ ۱۰-۱۱)

میدان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بجائے اس کے کہ وہ اُن کے اخلاقی حملوں پر ایک غضب ناک تقریر فرماتا، یا مسلمانوں کو جوابی حملے کرنے پر اکساتا، تمام تر توجہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دینے پر صرف فرمائی کہ تمہارے اخلاقی محاذ میں جہاں جہاں رخنے موجود ہیں ان کو بھرو اور اس محاذ کو اور زیادہ مضبوط کرلو۔ ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ نکاحِ زینبؓ کے موقع پر منافقین اور کفار نے کیا طوفان اُٹھایا تھا۔ اب ذرا سورۂ احزاب نکال کر پڑھیئے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ٹھیک اُسی طوفان کا زمانہ تھا جب کہ معاشرتی اصلاح کے متعلق حسبِ ذیل ہدایات دی گئیں۔

(۱) ازواجِ مطہرات کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، بناؤ سنگھار کرکے باہر نہ نکلو اور غیر مَردوں کے ساتھ بات کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ کوئی شخص بے جا توقعات قائم کرلے۔ (آیات ۳۲-۳۳)

(۲) حضورؐ کے گھر میں غیر مَردوں کے بلا اجازت داخل ہو جانے کو روک دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ (آیت ۵۳)

(۳) غیر مَحرَم مردوں اور مَحرَم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ازواجِ مطہرات کے صرف محرم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپ کے گھروں میں آجا سکتے ہیں۔ (آیت ۵۵)

(۴) مسلمانوں کو بتایا گیا کہ نبی کی بیویاں تمہاری مائیں ہیں اور ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے لیے ابد اً حرام ہیں جس طرح اس کی حقیقی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے اُن کے بارے میں ہر مسلمان اپنی نیت کو بالکل پاک رکھے۔ (آیت ۵۳-۵۴)

(۵) مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ نبی کو اذیت دینا دُنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت اور رُسوا کُن عذاب کا موجب ہے، اور اسی طرح کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا اور اس پر ناحق الزام لگانا بھی سخت گناہ ہے۔ (آیات ۵۷-۵۸)

(۶) تمام مسلمان عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلا کریں۔ (آیت ۵۹)

پھر جب واقعۂ افک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلچل برپا ہوئی تو یہ سُورۂ نور اخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام وہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ

اول تو مسلم معاشرے کو بُرائیوں کی پیداوار اور ان کے پھیلاؤ سے محفوظ رکھا جائے اور اگر وہ پیدا ہو ہی جائیں تو ان کا پورا پورا تدارک کیا جائے۔ ان احکام و ہدایات کو ہم اسی ترتیب کے ساتھ یہاں خلاصۃً درج کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ اس سورہ میں نازل ہوئے ہیں تاکہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ قرآن ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے کس طرح قانونی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر بیک وقت تجویز کرتا ہے۔

(۱) زنا، جسے معاشرتی جرم پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا (سورۂ نساء، آیات ۱۵-۱۶) اب اس کو فوجداری جرم قرار دے کر اس کی سزا سو کوڑے مقرر کر دی گئی۔

(۲) بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور ان کے ساتھ رشتۂ مناکحت جوڑنے سے اہلِ ایمان کو منع کر دیا گیا۔

(۳) جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

(۴) شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لِعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۵) حضرت عائشہؓ پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو اس طرح کی افواہیں اگر اُڑ رہی ہوں تو اُنہیں دبانا اور ان کا سدِّباب کرنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ ایک منھ سے لے کر دوسرا منھ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ اسی سلسلے میں یہ بات ایک اصولی حقیقت کے طور پر سمجھائی گئی کہ طیّب آدمی کا جوڑ طیّب عورت ہی سے لگ سکتا ہے۔ خبیث عورت کے اطوار سے اس کا مزاج چند روز بھی موافقت نہیں کر سکتا اور ایسا ہی حال طیّب عورت کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی رُوح طیّب مرد ہی سے موافقت کر سکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اب اگر رسولؐ کو تم جانتے ہو کہ وہ ایک طیّب بلکہ اطیب انسان ہیں تو کس طرح یہ بات تمہاری عقل میں سما گئی کہ ایک خبیث ترین عورت ان کی محبوب ترین رفیقۂ حیات بن سکتی تھی۔ جو عورت عملاً زنا تک کر گزرے اس کے عام اطوار کب ایسے ہو سکتے ہیں کہ رسولؐ جیسا پاکیزہ انسان اس کے ساتھ یوں نباہ کرے۔ پس صرف یہ بات کہ ایک کمینہ آدمی نے ایک بیہودہ الزام کسی پر لگا دیا ہے، اسے قابلِ قبول کیا معنیٰ قابلِ توجہ اور ممکن الوقوع

سمجھ لینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ الزام لگانے والا ہے کون اور الزام لگایا کس پر جا رہا ہے؟

(۶) جو لوگ بیہودہ خبریں اور بُری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فحش اور فواحش کو رواج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

(۷) یہ قاعدہ کلیہ مقرر کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلقات کی بنیاد باہمی حُسنِ ظن پر ہونی چاہیے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ اس کے گنہ گار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گنہ گار سمجھا جائے جب تک کہ اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

(۸) لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف نہ گھُس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جائیں۔

(۹) عورتوں اور مَردوں کو غضِّ بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھُورتے یا جھانک تانک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

(۱۰) عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سَر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔

(۱۱) عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے محرم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سِوا کسی کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔

(۱۲) ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چھپا کر نکلیں بلکہ بجنے والے زیور بھی پہن کر نہ نکلیں۔

(۱۳) معاشرے میں عورتوں اور مَردوں کے بِن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں۔ حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ تجرّد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مجرّد لوگ اور کچھ نہیں تو بُری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

(۱۴) لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مکاتبت کی راہ نکال دی گئی اور مالکوں کے علاوہ دوسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ مُکاتَب غلاموں اور لونڈیوں کی مالی امداد کریں۔

(۱۵) لونڈیوں سے کسب کرانا ممنوع قرار دیا گیا۔ عرب میں یہ پیشہ لونڈیوں سے ہی کرانے کا

رواج تھا، اس لیے اس کی ممانعت دراصل قحبہ گری کی قانونی بندش تھی۔

(۱۶) گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۱۷) بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اُتار کر رکھ دیں تو مضائقہ نہیں، مگر حکم دیا گیا کہ تبرّج (بن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انہیں نصیحت کی گئی کہ بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈالے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

(۱۸) اندھے، لنگڑے، لُولے اور بیمار کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ کھانے کی کوئی چیز کسی کے ہاں سے بلا اجازت کھالے تو اس کا شمار چوری اور خیانت میں نہ ہوگا۔ اُس پر کوئی گرفت نہ کی جائے۔

(۱۹) قریبی عزیزوں اور بے تکلّف دوستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں بلا اجازت بھی کھا سکتے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے گھر میں کھا سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے پردے ہٹا دیے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے اُن رخنوں کو بند کر دیں جن سے کوئی فتنہ پرداز پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

ان ہدایات کے ساتھ ساتھ منافقین اور مومنین کی وہ کھلی کھلی علامتیں بھی بیان کر دی گئیں جن سے ہر مسلمان یہ جان سکے کہ معاشرے میں مخلص اہلِ ایمان کون لوگ ہیں اور منافق کون۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جماعتی نظم و ضبط کو اور کس دیا گیا اور اس کے لیے چند مزید ضابطے بنا دیے گئے تاکہ وہ طاقت اور زیادہ مضبوط ہو جائے جس سے غیظ کھا کر کفار و منافقین فتنہ انگیزیاں کر رہے تھے۔

اس تمام بحث میں نمایاں چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ پوری سورۂ نور اُس تلخی سے خالی ہے جو شرمناک اور بیہودہ حملوں کے جواب میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک طرف اُن حالات کو دیکھیے جن میں یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ اور دوسری سورت کے مضامین اور انداز کلام کو دیکھیے۔ اس قدر اشتعال انگیز صورت حال میں کیسے ٹھنڈے طریقے سے قانون سازی کی جارہی ہے۔ مصلحانہ احکام دیے جارہے

ہیں، حکیمانہ ہدایات دی جا رہی ہیں اور تعلیم و نصیحت کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اِس سے صرف یہی سبق نہیں ملتا کہ ہم کو فتنوں کے مقابلے میں سخت سے سخت اشتعال کے مواقع پر بھی کس طرح ٹھنڈے تدبُّر اور عالی ظرفی اور حکمت سے کام لینا چاہیئے، بلکہ اس سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہ کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، کسی ایسی ہستی کا نازل کیا ہوا ہے جو بہت بلند مقام سے انسانی حالات اور معاملات کا مشاہدہ کر رہی ہے اور اپنی ذات میں ان حالات و معاملات سے غیر متاثر رہ کر خالص ہدایت و رہنمائی کا منصب ادا کر رہی ہے۔ اگر یہ آنحضرت کا اپنا کلام ہوتا تو آپ کی انتہائی بلند نظری کے باوجود اس میں اُس فطری تلخی کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پایا جاتا جو خود اپنی عزّت و ناموس پر کمینہ حملوں کو سُن کر ایک شریف آدمی کے جذبات میں لازماً پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

اَلفُرقَان

نام پہلی ہی آیت تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی قرآن کی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے نہ کہ عنوانِ مضمون کے طور پر۔ تاہم مضمونِ سورہ کے ساتھ یہ نام ایک قریبی مناسبت رکھتا ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

زمانۂ نزول اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول بھی وہی ہے جو سورۂ مومنون وغیرہ کا ہے یعنی زمانۂ قیامِ مکّہ کا دورِ متوسّط۔ ابن جریر اور امام رازی نے ضحّاک بن مُزاحم اور مُقاتِل بن سلیمان کی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت سورۂ نساء سے ۸ سال پہلے اتری تھی۔ اس حساب سے بھی اس کا زمانۂ نزول وہی دورِ متوسّط قرار پاتا ہے۔ (ابن جریر، جلد ۱۹، صفحہ ۲۸-۳۰۔ تفسیر کبیر، جلد ۶، صفحہ ۳۵۸)

موضوع و مباحث اس میں اُن شبہات و اعتراضات پر کلام کیا گیا ہے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت، اور آپؐ کی پیش کردہ تعلیم پر کفارِ مکّہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے، اُن میں سے ایک ایک کا جچا تُلا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دعوتِ حق سے مُنہ موڑنے کے بُرے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اخلاقی خوبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر عوام النّاس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لو، کون کھوٹا ہے اور کون کھرا۔ ایک طرف اس سیرت و کردار کے لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اب تک تیار ہو رہے ہیں اور آئندہ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف وہ نمونۂ اخلاق ہے جو عام اہلِ عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے جاہلیت کے علمبردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اب خود فیصلہ کرو کہ ان دو نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟ یہ ایک غیر ملفوظ سوال تھا جو عرب کے ہر باشندے کے سامنے رکھ دیا گیا، اور چند سال کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس کا جو جواب دیا وہ جریدۂ روزگار پر ثبت ہو چکا ہے۔

الشُّعَرَآء

نام آیت ۲۲۴ وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضمون اور اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے۔ ابن عباس کا بیان ہے کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر واقعہ اور اس کے بعد الشعراء (رُوح المعانی جلد ۱۹ صفحہ ۶۴) اور سورۂ طٰہٰ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

موضوع اور مباحث تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ وتذکیر کا مقابلہ پیہم جحود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر ہمیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو۔ کبھی آپ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اُڑا دینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپ کے مشن کا استخفاف کرتے کہ ان کے پیرو یا تو چند نادان نوجوان ہیں یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات کے لوگ۔ حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشرافِ قوم اور شیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و معاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، مگر وہ ہٹ دھرمی کی نت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی چیز آنحضورؐ کے لیے سوہانِ رُوح بنی ہوئی تھی۔

ان حالات میں یہ صورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے اپنی جان کیوں گھُلاتے ہو؟ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی ہے،

بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے۔ کسی ایسی نشانی کے طالب ہیں جو زبردستی ان کی گردنیں جھکا دے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آجائے گی تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انہیں سمجھائی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد دسویں رکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ طالب حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے ہیں۔ نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفارِ مکہ کام لے رہے تھے اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

اول یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر ہر صاحبِ عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قومِ نوحؑ نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قومِ لوطؑ اور اصحاب الایکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی حجتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے اور آخرکار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں ان کی دلیل و حجت کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسری بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود بھی

طے کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم وکرم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رکوع میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں۔ اس قرآن کو دیکھو جو تمہاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جن کا کلام ہو سکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا تمہیں کاہن نظر آتا ہے؟ کیا محمدؐ اور ان کے اصحاب تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مشرب ہوا کرتے ہیں؟ ضد م ضدا کی بات دوسری ہے۔ مگر اپنے دلوں کو خود ٹٹول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجام دیکھ کر رہو گے۔

اَلنَّمْل

نام

دوسرے رکوع کی چوتھی آیت میں وَادِ النَّمْلِ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورۃ جس میں النمل کا قصہ مذکور ہے یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول

مضمون اور انداز بیان مکہ کے دورِ متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عباسؓ اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ "پہلے سورہ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص۔"

موضوع اور مضمون

یہ سورۃ دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغازِ سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورۃ کے اختتام تک۔

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور پھر مان لینے کے بعد اپنی زندگی میں بھی اطاعت واتباع کا رویہ اختیار کریں، لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے وہ انکارِ آخرت ہے، کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمہ دار، بندۂ نفس اور فریفتۂ حیاتِ دنیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قوم ثمود اور سرکشانِ قوم لوط کا ہے جن کی سیرت فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجۃً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے

تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے اُن لوگوں کے دشمن ہو گئے، جنھوں نے ان کو خیر و صلاح کی طرف بلایا۔ انہوں نے اپنی اُن بدکاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گھناؤنا پن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انہیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے تک بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جن کو خدا نے دولت، حکومت، اور شوکت و حشمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انہیں احساس تھا کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے جو تاریخ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں، جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کر سکتا ہے وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں درجے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اس سے بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اُسے قبولِ حق سے نہ روک سکی۔ کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا۔ خدا کے حضور جواب دہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

دوسرے خطبے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہور حقائق کی طرف اشارہ کر کے کفارِ مکہ سے پے در پے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ یہ حقائق اُس شرک کی شہادت دے رہے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اُس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اس قرآن میں تمہیں دی جا رہی ہے۔ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے، وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے لیے زندگی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ کیونکہ جب ان کے نزدیک آخر کار سب کچھ مٹی ہو جانا ہے اور حیاتِ دنیا کی اس ساری تگ و دو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے تو

آدمی کے لیے حق اور باطل یکساں ہیں۔ اُس کے لیے اس سوال میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ اُس کا نظامِ حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یاس نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہوں تو انہیں دعوت دینا بے کار ہے بلکہ دراصل اس سے مقصود سوتے والوں کو جھنجھوڑ کر جگانا ہے۔ اسی لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے در پے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں اس سے غفلت برتنے کے نتائج پر متنبہ کریں اور انہیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمہارے اپنے لیے نافع اور اسے رد کرنا تمہارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کرو گے جن کے سامنے آجانے کے بعد ماننے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، اُس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

القصص

نام آیت نمبر ۲۵ کے اس فقرے سے ماخوذ ہے : وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ، یعنی وہ سورہ جس میں القصص کا لفظ آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے قصص کے معنی ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لفظ باعتبار معنی بھی اس سورہ کا عنوان ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان ہوا ہے۔

زمانۂ نزول سورۂ نمل کے دیباچے میں ابن عباس اور جابر بن زید کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ سورۂ شعراء، سورۂ نمل اور سورۂ قصص یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ زبان، انداز بیان اور مضامین سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں سورتوں کا زمانۂ نزول قریب قریب ایک ہی ہے اور اس لحاظ سے بھی ان تینوں میں قریبی تعلق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے مختلف اجزاء جو ان میں بیان کیے گئے ہیں وہ باہم مل کر ایک پورا قصہ بن جاتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں نبوت کا منصب قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ عرض کرتے ہیں کہ "قوم فرعون کا ایک جرم میرے ذمہ ہے جس کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں کہ وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔" پھر جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے ہاں تشریف لے جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے "کیا ہم نے اپنے ہاں تجھے بچہ سا نہیں پالا تھا اور تو ہمارے ہاں چند سال رہا پھر کر گیا جو کچھ کر گیا۔" ان دونوں باتوں کی تفصیل وہاں نہیں بیان کی گئی۔ اس سورہ میں اُسے بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نمل میں قصہ یکایک اس بات سے شروع ہو گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے اہل و عیال کو لے کر جا رہے تھے اور اچانک انہوں نے ایک آگ دیکھی۔ وہاں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ یہ کیسا سفر تھا، کہاں سے وہ آ رہے تھے اور کدھر جا رہے تھے۔ یہ تفصیل اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ تینوں سورتیں مل کر قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی

تکمیل کر دیتی ہیں۔

موضوع اور مباحث

اس کا موضوع اُن شبہات و اعتراضات کو رفع کرنا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر وارد کیے جارہے تھے، اور اُن عذرات کو قطع کرنا ہے جو آپ پر ایمان نہ لانے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو زمانۂ نزول کے حالات سے مل کر خود بخود چند حقیقتیں سامع کے ذہن نشین کر دیتا ہے:-

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے وہ غیر محسوس طریقے سے اسباب و ذرائع فراہم کرتا ہے۔ جس بچّے کے ہاتھوں آخر کار فرعون کا تختہ الٹنا تھا، اسے اللہ نے خود فرعون ہی کے گھر میں اس کے اپنے ہاتھوں پرورش کرا دیا اور فرعون یہ نہ جان سکا کہ وہ کسے پرورش کر رہا ہے۔ اُس خدا کی مشیت سے کون لڑ سکتا ہے اور کس کی چالیں اس کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ نبوّت کسی شخص کو کسی بڑے جشن اور زمین و آسمان سے کسی بھاری اعلان کے ساتھ نہیں دی جاتی۔ تم کو حیرت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چپکے سے یہ نبوت کہاں سے مل گئی اور بیٹھے بٹھائے یہ نبی کیسے بن گئے۔ مگر جن موسیٰ (علیہ السلام) کا تم خود حوالہ دیتے ہو کہ لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى، (آیت ۴۸)، انہیں بھی اسی طرح راہ چلتے نبوّت مل گئی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ آج طور سینا کی سنسان وادی میں کیا واقعہ پیش آگیا۔ موسیٰؑ خود ایک لمحے پہلے تک نہ جانتے تھے کہ انہیں کیا چیز ملنے والی ہے۔ آگ لینے چلے تھے اور پیمبری مل گئی۔

تیسرے یہ کہ جس بندے سے خدا کوئی کام لینا چاہتا ہے وہ بغیر کسی لاؤ لشکر اور سامان کے اُٹھتا ہے کوئی اس کا مددگار نہیں ہوتا، کوئی طاقت بظاہر اس کے پاس نہیں ہوتی، مگر بڑے بڑے لاؤ لشکر اور سرو سامان والے آخر کار اس کے مقابلے میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جو نسبت آج تم اپنے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان پا رہے ہو اس سے بہت زیادہ فرق موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کی طاقت کے درمیان تھا، مگر دیکھ لو کہ آخر کون جیتا اور کون ہارا۔

چوتھے یہ کہ تم لوگ بار بار موسیٰؑ کا حوالہ دیتے ہو کہ "محمدؐ کو وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا، یعنی عصا اور ید بیضا اور دوسرے کھلے کھلے معجزے۔ گویا تم ایمان لانے کو تو تیار بیٹھے ہو، بس انتظار

ہے تو یہ کہ تمہیں وہ معجزے دکھائے جائیں جو موسیٰ نے فرعون کو دکھائے تھے۔ مگر تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے تھے انہوں نے کیا کیا تھا؟ وہ انہیں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ انہوں نے کہا تو یہ کہا کہ یہ تو جادو ہے، کیوں کہ وہ حق کے خلاف ہٹ دھرمی اور عناد میں مبتلا تھے۔ اسی مرض میں آج تم مبتلا ہو۔ کیا تم اُسی طرح کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آؤ گے؟ پھر تمہیں کچھ یہ بھی خبر ہے کہ جن لوگوں نے وہ معجزے دیکھ کر حق کا انکار کیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟ آخر کار اللہ نے انہیں تباہ کر کے چھوڑا۔ اب کیا تم بھی ہٹ دھرمی کے ساتھ معجزہ مانگ کر اپنی شامت بلانا چاہتے ہو؟

یہ وہ باتیں ہیں جو کسی تصریح کے بغیر آپ سے آپ ہر اُس شخص کے ذہن میں اتر جاتی تھیں جو مکّے کا فرانہ ماحول میں اس قصّے کو سنتا تھا، کیونکہ اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان ویسی ہی ایک کشمکش برپا تھی جیسی اس سے پہلے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان برپا ہو چکی تھی اور ان حالات میں قصہ سنانے کے معنی یہ تھے کہ اس کا ہر ہر جزء وقت کے حالات پر خود بخود چسپاں ہوتا چلا جائے، خواہ ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جائے جس سے معلوم ہو کہ قصّے کا کون سا جزء اِس وقت کے معاملے پر چسپاں ہو رہا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رکوع سے اصل موضوع پر براہِ راست کلام شروع ہوتا ہے۔

پہلے اس بات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا ایک ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ آپؐ امی ہونے کے باوجود دو ہزار برس پہلے گزرا ہوا ایک تاریخی واقعہ اس تفصیل کے ساتھ من وعن سُنا رہے ہیں، حالانکہ آپؐ کے شہر اور آپؐ کی برادری کے لوگ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کے پاس ان معلومات کے حاصل ہونے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی وہ نشان دہی کر سکیں

پھر آپؐ کے نبی بنائے جانے کو اُن لوگوں کے حق میں اللہ کی ایک رحمت قرار دیا جاتا ہے کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے اور اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا۔

پھر اُن کے اس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے جو وہ بار بار پیش کرتے تھے کہ "یہ نبی وہ معجزے کیوں نہ لایا جو اس سے پہلے موسیٰؑ لائے تھے۔" ان سے کہا جاتا ہے کہ موسیٰؑ جن کے متعلق تم خود مان رہے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے معجزے لائے تھے انہی کو تم نے کب مانا ہے کہ اب اس نبی سے معجزے کا مطالبہ کرتے ہو؟ خواہشاتِ نفس کی بندگی نہ کرو تو حق اب بھی تمہیں نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس مرض میں تم مبتلا رہو تو خواہ کوئی معجزہ آ جائے تمہاری آنکھیں نہیں کھل سکتیں۔

پھر کفارِ مکہ کو اس واقعہ پر عبرت اور شرم دلائی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا کہ باہر سے کچھ عیسائی مکہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سُن کر ایمان لے آئے مگر مکہ کے لوگ اپنے گھر کی اس نعمت سے مستفید تو کیا ہوتے، ان کے ابوجہل نے اُلٹی ان لوگوں کی کُھلم کھلا بے عزتی کی۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اس اصل عذر کو لیا جاتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ ماننے کے لیے وہ پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اہلِ عرب کے دینِ شرک کو چھوڑ کر اس نئے دینِ توحید کو قبول کر لیں تو یکایک اس ملک سے ہماری مذہبی، سیاسی، اور معاشی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی اور ہمارا حال یہ ہوگا کہ عرب کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے کی حیثیت کھو کر اس زمین میں ہمارے لیے کوئی جائے پناہ تک باقی نہ رہے گی۔ یہ چونکہ سردارانِ قریش کی حق دشمنی کا اصل محرک تھا اور باقی سارے شبہات و اعتراضات محض بہانے تھے جو وہ عوام کو فریب دینے کے لیے تراشتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر آخر سورہ تک مفصّل کلام فرمایا اور اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈال کر نہایت حکیمانہ طریقے سے اُن تمام بنیادی امراض کا مداوا کیا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ حق اور باطل کا فیصلہ دنیوی مفاد کے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔

العنکبوت

نام

آیت ۴۱ کے فقرہ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ "عنکبوت" آیا ہے۔

زمانۂ نزول

آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ پس منظر میں اُسی زمانے کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مفسرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینہ میں ہوا ہے، یہ قیاس قائم کر لیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں اور باقی سورۃ مکی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم وستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہو سکتا تھا نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسے مکہ کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے، حالانکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بنا رکھی گئی ہے اور یہ اندرونی شہادت اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکہ کے آخری دَور کی نہیں بلکہ اُس دَور کے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس پر ہجرت حبشہ واقع ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون

سورۃ کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں پر بڑے مصائب وشدائد کا زمانہ تھا۔ کفار

کی طرف سے اسلام کی مخالفت پورے زور شور سے ہو رہی تھی اور ایمان لانے والوں پر سخت ظلم وستم توڑے جا رہے تھے۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ ایک طرف صادق الایمان لوگوں میں عزم وہمت اور استقامت پیدا کرنے کے لیے، اور دوسری طرف ضعیف الایمان لوگوں کو شرم دلانے کے لیے نازل فرمائی۔ اس کے ساتھ کفارِ مکہ کو بھی اس میں سخت تہدید کی گئی کہ اپنے حق میں اُس انجام کو دعوت نہ دیں جو عداوتِ حق کا طریقہ اختیار کرنے والے ہر زمانے میں دیکھتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں اُن سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بعض نوجوانوں کو اُس وقت پیش آرہے تھے۔ مثلاً اُن کے والدین ان پر زور ڈالتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور ہمارے دین پر قائم رہو، جس قرآن پر تم ایمان لائے ہو اس میں بھی تو یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے تو ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے مانو ورنہ تم خود اپنے ہی ایمان کے خلاف کام کرو گے۔ اس کا جواب آیت ۸ میں دیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض نومسلموں سے اُن کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ عذاب ثواب ہماری گردن پر، تم ہمارا کہنا مانو اور اس شخص سے الگ ہو جاؤ۔ اگر خدا تمہیں پکڑے گا تو ہم خود آگے بڑھ کر کہہ دیں گے کہ صاحب ان بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، ان کو ہم نے ایمان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، اس لیے آپ ہمیں پکڑ لیں۔ اس کا جواب آیات ۱۲-۱۳ میں دیا گیا ہے۔

جو قصے اِس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں اُن میں بھی زیادہ تر یہی پہلو نمایاں ہے کہ پچھلے انبیاء کو دیکھو، کیسی کیسی سختیاں ان پر گزریں اور کتنی کتنی مدت وہ ستائے گئے۔ پھر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔ اِس لیے گھبراؤ نہیں، اللہ کی مدد ضرور آئے گی، مگر آزمائش کا ایک دور گزرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دینے کے ساتھ کفارِ مکہ کو بھی ان قصوں میں متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پکڑ ہونے میں دیر ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ کبھی پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ پچھلی تباہ شدہ قوموں کے نشانات تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو کہ آخر کار ان کی شامت آکر رہی اور خدا نے اپنے نبیوں کی مدد کی۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ظلم وستم تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ جہاں خدا کی بندگی کر سکو

وہاں چلے جاؤ۔

اِن سب باتوں کے ساتھ کفار کی تفہیم کا پہلو بھی چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ توحید اور معاد، دونوں حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شرک کا ابطال کیا گیا ہے اور آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلا کر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ سب نشانات اس تعلیم کی تصدیق کر رہے ہیں جو ہمارا نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

الرُّوم

نام پہلی ہی آیت کے لفظ غُلِبَتِ الرُّوم سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول آغاز ہی میں جس تاریخی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے زمانۂ نزول قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔" اُس زمانے میں عرب سے متصل رومی مقبوضات اُردن، شام اور فلسطین تھے اور ان علاقوں میں رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ء میں مکمل ہوا تھا اس لیے پوری صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ اسی سال نازل ہوئی تھی اور یہ وہی سال تھا جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔

تاریخی پس منظر جو پیش گوئی اس سورہ کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو اُن آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصر روم مارِیس Mauric کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس Phocas تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا، اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِ عام لٹکوا دیئے اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر مارِیس اس کا محسن تھا۔ اسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی

باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل Herscllns کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا اور اس نے برسرِ اقتدار آکر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیئے تھی مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی۔ اور اب اس جنگ کو اُس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آکر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشیں ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اُسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا کنیسۃ القیامہ Holy Sepul Chre برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے

ہوتا ہے جو اُس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا۔ اس میں وہ کہتا ہے :

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام رُوئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اِس کمینے اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچالیا ؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں وہ پیش گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشینگوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر

ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون Chai Cedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ Carthage (موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مورخ گبن کے بقول قرآن مجید کی اس پیشن گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔[۱]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں اور عربی زبان میں بِضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہو گی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور ادھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ بحرِ اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقفِ اعظم سرجیس Sergius نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے

---

[۱] Gibbon, Decline And Fall Of The Roman Empire Vol. II, P. 788. Modern Library New York

نذرانوں کی جمع شدہ دولت سُود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے اذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقامِ پیدائش ارمیاہ Clorumi a کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں۔ دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کُن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون Ctesiphon کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیئے گئے اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہوگیا۔ یہی سال تھا جس میں صُلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور یہی سال تھا جس میں خسرو کے بیٹے قبادِ ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا اور اسی سال نبی صلی اللہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ مُعظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشینگوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبیؔ بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیق ؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے کیونکہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

موضوع اور مضمون

اس سورہ میں کلام کا آغاز اس بات سے کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور ساری دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ قریب ہے مگر چند سال نہ گزرتے پائیں گے کہ پانسہ پلٹ جائے گا اور جو مغلوب ہے وہ غالب ہو جائے گا۔

اس تمہید سے یہ مضمون نکل آیا کہ انسان اپنی سطح بینی کی وجہ سے وہی کچھ دیکھتا ہے جو بظاہر اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر اس ظاہر کے پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر بینی جب دنیا کے ذرا ذرا سے معاملات میں غلط فہمیوں اور غلط اندازوں کی موجب ہوتی ہے اور جبکہ محض اتنی سی بات نہ جاننے کی وجہ سے کہ "کل کیا ہونے والا ہے" آدمی غلط تخمینے لگا بیٹھتا ہے، تو پھر بحیثیت مجموعی پوری زندگی کے معاملے میں ظاہر حیاتِ دنیا پر اعتماد کر بیٹھنا اور اسی کی بنیاد پر اپنے پورے سرمایۂ حیات کو داؤں پر لگا دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

اس طرح روم و ایران کے معاملے سے تقریر کا رُخ آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل تین رکوعوں تک طریقے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخرت ممکن بھی ہے، معقول بھی ہے، اس کی ضرورت بھی ہے اور انسانی زندگی کے نظام کو درست رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ آدمی آخرت کا یقین رکھ کر اپنی موجودہ زندگی کا پروگرام اختیار کرے ورنہ وہی غلطی واقع ہو گی جو ظاہر پر اعتماد کر لینے سے واقع ہوا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں آخرت پر استدلال کرتے ہوئے کائنات کے جن آثار کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے وہ بعینہٖ وہی آثار ہیں جو توحید پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے چوتھے رکوع کے آغاز سے تقریر کا رُخ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کے لیے فطری دین اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ بالکل یکسو ہو کر خدائے واحد کی بندگی کرے۔ شرک فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان کے خلاف ہے۔ اسی لیے جہاں بھی انسان نے اس گمراہی کو اختیار کیا ہے وہاں فساد رونما ہوا ہے۔ اس موقع پر پھر اُس فسادِ عظیم کی طرف، جو اُس وقت دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ کی بدولت برپا تھا، اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ فساد بھی شرک کے نتائج میں سے ہے اور پچھلی انسانی تاریخ میں بھی جتنی قومیں مبتلائے فساد ہوئی ہیں وہ

سب بھی مشرک ہی تھیں۔

خاتمۂ کلام پر تمثیل کے پیرایہ میں لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مردہ پڑی ہوئی زمین خدا کی بھیجی ہوئی بارش سے یکایک جی اُٹھتی ہے اور زندگی و بہار کے خزانے اُگلنے شروع کر دیتی ہے، اسی طرح خدا کی بھیجی ہوئی وحی و نبوّت بھی مُردہ پڑی ہوئی انسانیت کے حق میں ایک بارانِ رحمت ہے جس کا نزول اُس کے لیے زندگی اور نشو و نما اور خیر و فلاح کا موجب ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤ گے تو یہی عرب کی سونی زمین رحمتِ الٰہی سے لہلہا اُٹھے گی اور ساری بھلائی تمہارے اپنے لیے ہی ہوگی اس سے فائدہ نہ اُٹھاؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ پھر پچھتانے کا کچھ حاصل نہ ہوگا اور تلافی کا کوئی موقع تمہیں میسّر نہ آئے گا۔

لُقمان

نام

اِس سورہ کے دوسرے رکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمانِ حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام لقمان رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اسلامی دعوت کو دبانے اور روکنے کے لیے جبر و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جانے لگے تھے، لیکن ابھی طوفانِ مخالفت نے پوری شدت اختیار نہ کی تھی۔ اس کی نشان دہی آیت ۱۴-۱۵ سے ہوتی ہے جس میں نئے نئے مسلمان ہونے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ والدین کے حقوق تو بے شک خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہیں لیکن اگر وہ تمہیں اسلام قبول کرنے سے روکیں اور دینِ شرک کی طرف پلٹنے پر مجبور کریں تو ان کی یہ بات ہرگز نہ مانو۔ یہی بات سورۂ عنکبوت میں بھی ارشاد ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں لیکن دونوں کے مجموعی اندازِ بیان اور مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ لقمان پہلے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کے پس منظر میں کسی شدید مخالفت کا نشان نہیں ملتا اور اس کے برعکس سورۂ عنکبوت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے زمانہ میں مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم ہو رہا تھا۔

موضوع و مضمون

اِس سورہ میں لوگوں کو شرک کی لغویت و نامعقولیت اور توحید کی صداقت و معقولیت سمجھائی گئی ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید چھوڑ دیں، کھلے دل سے اس تعلیم پر غور کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداوندِ عالم کی طرف سے پیش کر رہے ہیں اور کھلی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہر طرف کائنات میں اور خود ان کے اپنے نفس

میں کیسے کیسے صریح آثار اس کی سچائی پر شہادت دے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی آواز نہیں ہے جو دنیا میں یا خود دیارِ عرب میں پہلی مرتبہ ہی اٹھی ہو اور لوگوں کے لیے بالکل نامانوس ہو۔ پہلے بھی جو لوگ علم و عقل اور حکمت و دانائی رکھتے تھے وہ یہی باتیں کہتے تھے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ تمہارے اپنے ہی ملک میں لقمان نامی حکیم گزر چکا ہے جس کی حکمت و دانش کے افسانے تمہارے ہاں مشہور ہیں، جس کی ضرب الامثال اور جس کے حکیمانہ مقولوں کو تم اپنی گفتگوؤں میں نقل کرتے ہو جس کا ذکر تمہارے شاعر اور خطیب اکثر کیا کرتے ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ وہ کس عقیدے اور کن اخلاقیات کی تعلیم دیتا تھا۔

———✳———

السّجدہ

نام آیت ۱۵ میں سجدہ کا جو مضمون آیا ہے اسی کو سورہ کا عنوان قرار دیا ہے۔

زمانۂ نزول اندازِ بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے، اور اس کا بھی ابتدائی زمانہ کیونکہ اس کلام کے پس منظر میں ظلم وستم کی وہ شدت نظر نہیں آتی جو بعد کے ادوار کی سورتوں کے پیچھے نظر آتی ہے۔

موضوع اور مباحث سورہ کا موضوع توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق لوگوں کے شبہات کو رفع کرنا اور ان تینوں حقیقتوں پر ایمان کی دعوت دینا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپس میں چرچے کر رہے تھے کہ یہ شخص عجیب عجیب باتیں گھڑ گھڑ کر سنا رہا ہے۔ کبھی مرنے کے بعد کی خبریں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مٹی میں رل مل جانے کے بعد تم پھر اُٹھائے جاؤ گے اور حساب کتاب ہوگا اور دوزخ ہوگی اور جنت ہوگی۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ دیوی دیوتا اور بزرگ کوئی چیز نہیں ہیں، بس اکیلا ایک خدا ہی معبود ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، آسمان سے مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ کلام جو میں تم کو سنا رہا ہوں میرا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔ یہ عجیب افسانے ہیں جو یہ شخص ہمیں سنا رہا ہے ــــ انہی باتوں کا جواب اس سورہ کا موضوع بحث ہے۔

اس جواب میں کفار سے یہ کہا گیا ہے کہ بلا شک وریب یہ خدا ہی کا کلام ہے اور اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نبوت کے فیض سے محروم، غفلت میں پڑی ہوئی ایک قوم کو چونکایا جائے۔ اسے تم افترا کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ اس کا منزل من اللہ ہونا ظاہر وباہر ہے۔

پھر ان سے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہے، عقل سے کام

لے کر خود سوچو کہ ان میں کیا چیز اچنبھے کی ہے۔ آسمان و زمین کے انتظام کو دیکھو، خود اپنی پیدائش اور بناوٹ پر غور کرو، کیا یہ سب کچھ اس تعلیم کی صداقت پر شاہد نہیں ہے جو اس نبی کی زبان سے اس قرآن میں تم کو دی جارہی ہے؟ یہ نظامِ کائنات توحید پر دلالت کر رہا ہے یا شرک پر؟ اور اس سارے نظام کو دیکھ کر اور خود اپنی پیدائش پر نگاہ ڈال کر کیا تمہاری عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ جس نے اب تمہیں پیدا کر رکھا ہے وہ پھر تمہیں پیدا نہ کر سکے گا؟

پھر عالمِ آخرت کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے نتائج و عواقب بیان کر کے یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے کفر چھوڑ دیں اور قرآن کی اس تعلیم کو قبول کر لیں جسے مان کر خود ان کی اپنی ہی عاقبت درست ہوگی۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ انسان کے قصوروں پر یکایک آخری اور فیصلہ کُن عذاب میں اسے نہیں پکڑ لیتا بلکہ اُس سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں مصیبتیں، آفات اور نقصانات بھیجتا رہتا ہے۔ ہلکی ہلکی چوٹیں لگاتار رہتا ہے، تاکہ اُسے تنبیہ ہو اور اُس کی آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی اگر ان ابتدائی چوٹوں ہی سے ہوش میں آجائے تو اس کے اپنے حق میں بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ دنیا میں یہ کوئی پہلا اور انوکھا واقعہ تو نہیں ہے کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے کتاب آئی ہو۔ اس سے پہلے آخر موسیٰ (علیہ السلام) پر بھی تو کتاب آئی تھی جسے تم سب لوگ جانتے ہو۔ یہ آخر کون سی ایسی بات ہے کہ اس پر تم لوگ یوں کان کھڑے کر رہے ہو۔ یقین مانو کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے آئی ہے اور خوب سمجھ لو کہ اب پھر وہی کچھ ہوگا جو موسیٰؑ کے عہد میں ہو چکا ہے۔ امامت و پیشوائی اب انہی کو نصیب ہوگی جو اس کتابِ الٰہی کو مان لیں گے۔ اسے رَدّ کر دینے والوں کے لیے ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔

پھر کفارِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں تم جن پچھلی تباہ شدہ قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے ہو ان کا انجام دیکھ لو، کیا یہی انجام تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ آج تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چند لڑکوں اور چند غلاموں اور غریب لوگوں کے سوا کوئی نہیں سن رہا ہے اور ہر طرف سے ان پر طعن اور ملامت اور پھبتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس سے تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ چلنے والی بات نہیں ہے، چار دن چلے گی اور پھر ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ محض تمہاری نظر کا دھوکا ہے۔ کیا یہ تمہارا رات دن کا مشاہدہ نہیں ہے کہ آج ایک زمین بالکل بے آب و گیاہ

بڑی ہے جسے دیکھ کر گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے پیٹ میں روئیدگی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں، مگر کل ایک ہی بارش میں وہ اس طرح پھبک اٹھتی ہے کہ اس کے چپے چپے سے نمو کی طاقتیں پھوٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔

خاتمۂ کلام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ تمہاری باتیں سن کر مذاق اُڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت، یہ فیصلہ کُن فتح آپ کو کب نصیب ہونے والی ہے، ذرا تاریخ تو ارشاد ہو۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمہارے فیصلے کا وقت آجائے گا اس وقت ماننا تمہارے لیے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ ماننا ہے تو اب مان لو۔ اور آخری فیصلے کا ہی انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

اَلْاَحْزَاب

نام آیت ۲۰ کے فقرہ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اِس سورۃ کے مضامین تین اہم واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ ایک، غزوۂ احزاب جو شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ دوسرے غزوۂ بنی قریظہ جو ذی القعدہ ۵ ھ میں پیش آیا۔ تیسرے حضرت زینبؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جو اسی سال ذی القعدہ میں ہوا۔ ان تاریخی واقعات سے سورۃ کا زمانۂ نزول ٹھیک متعین ہو جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر جنگِ اُحد (شوال ۳ ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہوگئی تھی اس کی وجہ سے مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انہیں اُمید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو اُحد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ جنگِ اُحد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلۂ بنی اسد نے مدینہ طیبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روک تھام کے لیے سَرِیَّہ[1] ابو سلمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ ھ میں قبائلِ عَضَل اور قارہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقہ میں جا کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا۔ مگر رَجیع (جدّہ اور رابغ کے درمیان) پہنچ کر وہ لوگ قبیلۂ ھُذَیل کے کفار کو ان بے بس مبلغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا اور دو صاحبوں (حضرت خُبَیب بن عدِیؓ

---

[1] اصطلاح میں سَرِیَّہ اس فوجی مہم کو کہتے ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوتے تھے اور غزوہ اس جنگ یا مہم کو کہا جاتا ہے جس میں حضورؐ خود قیادت فرماتے تھے۔

حضرت زید بن الدثنہ) کو لے جا کر مکہ معظمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہِ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر حضورؐ نے ایک اور تبلیغی وفد جو چالیس (یا بقول بعض ستر) انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا، نجد کی طرف روانہ کیا مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بنی سُلیم کے قبائل عُصَیّہ اور رِعل اور ذکوان نے بئرِ معونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی النضیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ ربیع الاول ۴ھ میں اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر ڈالی۔ پھر جمادی الاولیٰ ۴ھ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں، بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے مدینے پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضورؐ کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا۔ اس طرح جنگِ احد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

لیکن وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابۂ کرام کا جذبۂ فداکاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ عربوں کے معاشی مقاطعہ نے اہلِ مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا، گرد و پیش کے تمام مشرک قبائل چیرہ دست ہو رہے تھے۔ خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مارِ آستین بنے ہوئے تھے مگر ان مٹھی بھر مومنین صادقین نے رسولِ خداؐ کی قیادت میں پے در پے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہو گیا بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

جنگِ احزاب سے پہلے کے غزوات

ان میں سے اولین اقدام وہ تھا جو جنگِ اُحُد کے فوراً ہی بعد کیا گیا۔ جنگ کے ٹھیک دوسرے روز جبکہ بکثرت مسلمان زخمی تھے اور بہت سے گھروں میں عزیز ترین اقارب کی شہادت پر کہرام برپا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی اور حضرت حمزہؓ کی شہادت پر دلفگار تھے، حضورؐ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکرِ کفار کے تعاقب میں چلنا ہے تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ حضورؐ کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفارِ قریش ہاتھ آئی ہوئی فتح کا کوئی فائدہ اُٹھائے بغیر واپس تو چلے گئے ہیں، لیکن راستے میں جب کسی جگہ ٹھہریں گے تو اپنی اس حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ اس بنا پر آپؐ نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً ۶۳۰ جاں نثار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مکہ کے راستے میں جب حمراء الاسد پہنچ کر آپؐ نے تین روز

تک پڑاؤ کیا تو ایک غیر مسلم ہمدرد کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ ابوسفیان اپنے ۲۹۷۸ آدمیوں کے ساتھ مدینے سے ۳۶ میل دور الرّوحاء کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے لیکن یہ سن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں۔ اس کارروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہو گئے، بلکہ گرد و پیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اولوالعزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول صفحات ۲۲۹-۲۳۰ - ۳۰۲)

پھر جونہی کہ بنی اسد نے مدینے پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں شروع کیں، حضورؐ کے مخبروں نے بروقت آپؐ کو ان کے ارادوں سے باخبر کر دیا قبل اس کے کہ وہ چڑھ کر آتے آپؐ نے حضرت ابو سلمہ (ام المومنین حضرت اُمِ سَلَمہ کے پہلے شوہر) کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پر پہنچ گئی۔ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔

اس کے بعد بنی النَّضِیر کی باری آئی جس روز انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اسی روز آپ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ منافقین مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبَی نے ان کو ترغیب دی کہ ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو، میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا، بنی قُریظہ تمہاری مدد کریں گے، اور نجد سے بنی غطفان بھی تمہاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آکر انہوں نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ حضورؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافاتِ مدینہ کا وہ پورا محلہ جس میں بنی نَضِیر رہتے تھے ان کے باغات اور گڑھیوں اور سامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خیبر، وادی القریٰ

اور شام میں تتر بتر ہو گئے۔

پھر آپؐ نے بنی غطفان کی طرف توجہ کی جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آپؐ چار سو کا لشکر لے کر نکلے اور ذات الرِّقاع کے مقام پر ان کو جا لیا۔ اس اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھر بار اور مال و اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد شعبان ۴ھ میں آپ ابو سفیان کے اُس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اُس نے اُحد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ پر اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے اعلان کیا تھا کہ ان موعدکم بدر للعام المقبل (آئندہ سال بدر کے مقام پر ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہو گا)، اور حضورؐ نے جواب میں ایک صحابیؓ کے ذریعہ سے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ نعم، ھی بیننا و بینک موعد (ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تیرے درمیان طے ہو گئی)۔ اس قرارداد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپ ۱۵۰۰ صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے ابو سفیان دو ہزار کا لشکر لے کر چلا مگر مَرُّ الظَّہران (موجودہ وادیٔ فاطمہ) سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو اُحد میں اُکھڑی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی کہ اب تنہا قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل ص ۳۰۴)

اس دھاک میں ایک اور واقعہ نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دُومۃ الجندل (موجودہ الجوف) ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

غزوۂ احزاب

یہ حالات تھے جن میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے دَورہ کر کے قریش اور غطفان اور ہُذیل اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے شوال ۵ھ میں قبائلِ عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شمال کی طرف سے بنی النَّضِیر اور بنی قَیْنُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر اور وادی القُریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غطفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فزارہ، مُرّہ، اشجع، سَعْد اور اسد وغیرہ) نے پیش قدمی کی، اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔

یہ حملہ اگرچہ اچانک ہوتا تو سخت تباہ کن ہوتا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپؐ کے خبر رساں اور تحریکِ اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل موجود تھے،[1] آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ قبل اس کے یہ جمّ غفیر آپؐ کے شہر پہنچتا، آپ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمال غربی رُخ پر ایک خندق کھدوالی اور کوہ سَلع کو پُشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حَرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی

---

[1] یہ قوم پرست جتھوں کے مقابلے میں ایک نظریاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتھے صرف اپنی قوم کے افراد کی تائید و حمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں، لیکن ایک اصولی و نظریاتی تحریک اپنی دعوت سے ہر سمت میں بڑھتی ہے اور خود ان جتھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔

نقشے میں بھی یہی نہیں کہ انہیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہلِ عرب اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرہ کے لیے تیار ہونا پڑا۔ جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں جو مدینہ طیبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنو قُریظہ کی جانب تھیں اور اُدھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اُن کی طرف سے بنی النَّضِیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطَب بنی قریظہ کے پاس بھیجا گیا تاکہ انہیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ ابتداءً انہوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے لیکن جب ابنِ اَخطَب نے ان سے کہا کہ "دیکھو میں اس وقت عرب کی متحدہ طاقت اس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا" تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آگئی اور بنی قُریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ نے فوراً انصار کے سرداروں (سعد بن عُبادہ، سعد بن معاذ، عبداللہ بن رواحہ اور خوّات بن جُبیر) کو ان کے پاس تحقیق حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُریظہ عہد پر قائم رہیں تو آ کر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان یہ خبر سنا دینا، لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مصر ہوں تو صرف مجھ کو اشارۃً اس کی اطلاع دے دینا تاکہ عام مسلمان یہ بات سُن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قریظہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انہوں نے برملا اُن سے کہہ دیا کہ لاعقد بیننا و بین محمد ولاعھد۔ "ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔" اس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارۃً حضورؐ سے عرض کر دیا:

عَضَل وقارَہ ۔ یعنی قبیلہ عَضَل وقارَہ نے رَجیع کے مقام پر مبلغینِ اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قریظہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہوگیا۔ کیوں کہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آگئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں اور انہوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ "ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔" کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں ہمیں جاکر ان کی حفاظت کرنی ہے، کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ درست کرلو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہوگیا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا ۱/۳ حصہ لے کر واپس چلے جائیں لیکن جب انصار کے سرداروں (سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ) سے آپؐ نے ان شرائطِ صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ، یہ آپ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپ صرف ہمارے بچانے کے لیے یہ تجویز فرمارہے ہیں۔" آپؐ نے جواب دیا "میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پل پڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔" اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ "اگر آپ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اس وقت بھی ایک حبہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب تو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے، کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے۔ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔" یہ کہہ کر انہوں نے

معاہدے کے اس مسودے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

اسی دوران میں قبیلۂ غَطفان کی شاخ اَشجع کے ایک صاحب نعیم بن مسعودؓ مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے' آپ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں میں اُسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔[۱] چنانچہ وہ پہلے بنی قریظہ کے پاس گئے جن سے اُن کا بہت میل جول تھا' اور ان سے کہا کہ قریش اور غطفان تو محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں' ان کا کچھ نہ بگڑے گا مگر تمہیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے' وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمہارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک ان باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمہارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیئے جائیں۔ یہ بات بنی قریظہ کے دل میں اُتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں' بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنی قُریظہ کی طرف سے کھٹک گئے' اور انہوں نے قرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں' اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے' کل تم ادھر سے حملہ کرو اور ہم ادھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قُریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالہ نہ کر دیں' ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ انہوں نے یرغمال دینے سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قُریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔

اب محاصرہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے

---

[۱] اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ۔ یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک بھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے اُلٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہو گئی۔ قدرتِ خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی اور صبح جب مسلمان اُٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھذا ولکنکم تغزونھم۔ یعنی "اب قریش کے لوگ تمہارے اوپر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے، اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔" یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤں چل چکے تھے۔ اس میں ہار جانے کے بعد اب ان میں یہ ہمت باقی نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ آور ہونے کی جُرأت کر سکتے۔ اب حملے Offensive کی قوت دشمنوں سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

غزوہ بنی قُریظہ

خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریلؑ نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قُریظہ کا معاملہ باقی ہے ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیئے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ "جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیار بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔" اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جُرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انہوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخر کار انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ

بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس امید پر حکم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدتوں سے چلے آرہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انہیں بھی اسی طرح مدینے سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قینقاع اور بنی النضیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینے سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے، اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بد عہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں جنگِ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵۰۰ تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور ۱۵۰۰ ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جبکہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملے میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

معاشرتی اصلاحات

جنگِ اُحد اور جنگِ احزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگرچہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن اور اطمینان نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر، اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کے قوانینِ نکاح و طلاق قریب قریب مکمل ہو گئے، وراثت کا قانون بنا، شراب اور جوئے کو حرام کیا گیا، اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔

اس سلسلہ کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا، تبنّیت (گود لینے یا بیٹا بنانے)

کا مسئلہ تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو متبنّٰی بنا لیتے تھے وہ بالکل اُن کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مرجائے یا اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے اُن قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی رُو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے یہ رسم اُن کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ اُن کی رُو سے جن عورتوں اور مَردوں کے درمیان رشتۂ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بد اخلاقیوں کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم اُن کے پھیلنے میں مددگار تھی، کیونکہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جائے، بہر حال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہو سکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدس پر بھروسہ کر کے مَردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانونِ نکاح و طلاق، قانونِ وراثت اور قانونِ حُرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ متبنّٰی کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیّل کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیّل محض ایک قانونی حکم کے طور پر اتنی سی بات کہہ دینے سے ختم نہیں ہو سکتا تھا کہ "منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔" صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے۔ حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان، منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے درمیان خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اس کو توڑیں، کیونکہ جو کام حضورؐ نے خود کیا ہو، اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا

تصوّر باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ احزاب سے کچھ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپؐ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی سے خود نکاح کرلیں۔ اور اس حکم کی تعمیل آپؐ نے محاصرۂ بنی قریظہ کے زمانے میں فرمائی۔ (غالباً تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا، اور اسی دوران میں جنگی مصروفیات پیش آگئی تھیں۔)

نکاحِ زینبؓ پر پروپیگنڈے کا طوفان

یہ کام ہونا تھا کہ حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یک لخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپ کی پے درپے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ اُحد کے بعد احزاب اور بنی قریظہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زک پر زک اُٹھاتے چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپؐ کو زیر کرسکیں گے۔ اِس لیے انہوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس اخلاقی برتری کو ختم کرسکیں گے جو اُن کی طاقت اور ان کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ یہ افسانے تراشے گئے کہ (معاذ اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہو کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے، بیٹے کو اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچا لیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لغو تھی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک اُن کی ساری عمر آپؐ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپؐ نے خود اصرار کر کے حضرت زیدؓ سے اُن کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں مگر حضورؐ کے حکم سے سب مجبور ہو گئے اور حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اُٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضورؐ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، آپؐ خود ان سے نکاح کر سکتے تھے لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے، خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صور اس زور سے پھونکا کہ

خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔

پردہ کے ابتدائی احکام

یہ بات کہ دشمنوں کے تصنیف کیے ہوئے یہ افسانے مسلمانوں کی زبان پر چڑھنے سے بھی نہ رُکے اس امر کی کھلی ہوئی علامت تھی کہ معاشرے میں شہوانیت کا عنصر حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ خرابی اگر موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ذہن ایسی پاک ہستی کے متعلق ایسے بے سروپا اور اس قدر گھناؤنے افسانوں کی طرف ادنیٰ التفات بھی کرتے، کجا کہ زبانیں ان کو دہرانے لگتیں۔ یہ ٹھیک موقع تھا جبکہ اسلامی معاشرے میں اُن اصلاحی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو "حجاب" (پردے) کے عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اِن اصلاحات کا آغاز اس سورے سے کیا گیا، اور ان کی تکمیل ایک سال بعد سورۂ نور میں کی گئی، جبکہ حضرت عائشہ پر بہتان کا فتنہ کھڑا ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم سورۂ نور، دیباچہ)

حضورؐ کی خانگی زندگی کے معاملات

اسی زمانے میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان کو خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اس کارِ عظیم میں منہمک تھی اُس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا، اور اس کو پریشانیوں سے بچانا اور اس کو لوگوں کے شکوک و شبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر ان دونوں مسئلوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ ابتدائی چار سال تک تو آپؐ کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا ہی نہیں۔ ۴ھ میں بنی النضیر کی جلاوطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ کی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا گیا، مگر وہ آپؐ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ ادھر منصبِ رسالت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپؐ کے جسم اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں اور آپؐ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ سونتے ڈال رہے تھے اور آپ اپنی معاش کے لیے ذرہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ اِن حالات میں جب آپؐ کی ازواجِ مطہرات خرچ کی تنگی کے باعث آپؐ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپؐ کے ذہن پر دوہرا بار پڑ جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپؐ کی چار بیویاں موجود تھیں حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت امّ سلمہؓ۔ اُم المومنین زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات اُبھرنے لگے کہ دوسروں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھہرایا گیا ہے مگر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پانچویں بیوی کیسے کرلی۔

موضوع اور مباحث

یہ مسائل تھے جو سورۂ احزاب کے نزول کے زمانے میں پیش آئے تھے اور انہی پر اس سورے میں کلام فرمایا گیا ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے اور پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک خطبہ نہیں ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہو بلکہ یہ متعدد احکام و فرامین اور خطبات پر مشتمل ہے جو اس زمانہ کے اہم واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور پھر یکجا جمع کر کے ایک سورۃ کی شکل میں مرتب کر دیئے گئے۔ اس کے حسب ذیل اجزاء صاف طور پر ممیز نظر آتے ہیں:۔

۱۔ پہلا رکوع غزوۂ احزاب سے کچھ پہلے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس رکوع کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ متبنّیٰ کے بارے میں جاہلیت کے تصورات اور اوہام و رسوم کو مٹایا جائے اور آپ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصورات رکھتے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے جب تک آپؐ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس بنا پر سخت متردد تھے اور قدم بڑھاتے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپؐ نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اٹھانے کے لیے منافقین اور یہود اور مشرکین کو جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ اس موقع پر رکوع اوّل کی آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ رکوع دوم و سوم میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُریظہ پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ یہ دونوں رکوع ان لڑائیوں کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

۳۔ چوتھے رکوع کے آغاز سے آیت ۳۵ تک کی تقریر دو مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو، جو اس تنگی وعسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں اللہ تعالیٰ نے نوٹس دے دیا کہ دنیا اور اس کی زینت' اور خدا اور رسولؐ اور آخرت میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو۔ اگر تمہیں پہلی چیز مطلوب ہے تو صاف کہہ دو، تمہیں ایک دن بھی تنگی میں مبتلا نہ رکھا جائے گا بلکہ بخوشی رخصت کر دیا جائے گا اور اگر دوسری چیز پسند ہے تو صبر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ساتھ دو۔ دوسرے حصّے میں اُس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا جس کی ضرورت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن اب خود محسوس کرنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں اصلاح کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کرتے ہوئے ازواجِ مطہرات کو حکم دیا گیا کہ تبرّجِ جاہلیت سے پرہیز کریں، وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مَردوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں سخت احتیاط ملحوظ رکھیں۔ یہ پردے کے احکام کا آغاز تھا۔

۴۔ آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے۔ اس میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین کی طرف سے اس نکاح کے سلسلے میں تھے۔ اُن تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ و مقام کیا ہے اور خود حضورؐ کو کفار و منافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵۔ آیت ۴۹ میں طلاق کے قانون کی ایک دفع بیان ہوئی ہے۔ یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً انہی واقعات کے سلسلہ میں کسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

۶۔ آیت ۵۰۔ ۵۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کا خاص ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضورؐ اُن متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملہ میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔

۷۔ آیت ۵۳۔ ۵۵ میں معاشرتی اصلاح کا دوسرا قدم اُٹھایا گیا۔ یہ حسبِ ذیل احکام پر مشتمل ہے:۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مَردوں کی آمد و رفت پر پابندی۔ ملاقات اور دعوت کا ضابطہ ازواجِ مطہرات کے بارے میں یہ قانون کہ گھروں میں صرف ان کے قریبی رشتہ دار آسکتے ہیں۔

باقی رہے غیر مرد، تو انہیں اگر کوئی بات کہنی ہو یا کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں یا مانگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں یہ حکم کہ وہ مسلمانوں کے لیے ماں کی طرح حرام ہیں اور حضورؐ کے بعد بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

۸۔ آیت ۵۶۔۵۷ میں ان چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور آپؐ کی خانگی زندگی پر کی جارہی تھیں اور اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ نبی تو درکنار اہلِ ایمان کو تو عام مسلمانوں پر بھی تہمتیں لگانے اور الزامات عائد کرنے سے کلی اجتناب کرنا چاہیئے۔

۹۔ آیت ۵۹ میں معاشرتی اصلاح کا تیسرا قدم اُٹھایا گیا ہے۔ اس میں تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب گھروں سے باہر نکلیں تو چادروں سے اپنے آپ کو ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلیں۔

اس کے بعد آخر سورۃ تک افواہ بازی کی اُس مہم Whisporing Compaign پر سخت زجر و توبیخ کی گئی ہے جو منافقین اور سفہاء واراذل نے اس وقت برپا کر رکھی تھی۔

سَبَا

نام آیت ۱۵ کے فقرے لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِھِمْ اٰیَۃٌ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں سَبا کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے نزول کا ٹھیک زمانہ کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مکّہ کا دَورِ متوسّط ہے یا دَورِ اوّل۔ اور اگر دَورِ متوسّط ہے تو غالباً اس کا ابتدائی زمانہ ہے جبکہ ظلم و ستم کی شدّت شروع نہ ہوئی تھی اور ابھی صرف تضحیک و استہزاء، افواہی جنگ، جھوٹے الزامات اور وسوسہ اندازیوں سے اسلام کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس سورہ میں کفار کے اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا جو خود نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت پر اور خود آپؐ کی نبوت پر زیادہ طنز و تمسخر اور بیہودہ الزامات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ اُن اعتراضات کا جواب کہیں تو ان کو نقل کرکے دیا گیا ہے اور کہیں تقریر سے خود یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر و بیشتر تفہیم و تذکیر اور استدلال کے انداز میں ہیں۔ لیکن کہیں کہیں کفار کو ان کی ہٹ دھرمی کے بُرے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ اِسی سلسلے میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ اور قومِ سبا کے قصّے اس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ تمہارے سامنے تاریخ کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقتیں بخشیں اور وہ شوکت و حشمت عطا کی جو پہلے کم ہی کسی کو ملی ہے۔ مگر یہ سب کچھ پاکر وہ کبر و غرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے شکر گزار بندے ہی بنے رہے اور دوسری طرف سبا کی قوم ہے جسے اللہ نے جب اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ پھول گئی اور آخر کار اس طرح پارہ پارہ ہوئی کہ اس کے بس افسانے ہی اب دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر خود رائے قائم کرو کہ توحید و آخرت کے یقین اور شکرِ نعمت کے جذبے سے جو زندگی بنتی ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ زندگی جو کفر و شرک اور انکارِ آخرت اور دنیا پرستی کی بنیاد پر بنتی ہے۔

فاطر

نام پہلی ہی آیت کا لفظ "فاطر" اس سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں فاطر کا لفظ آیا ہے۔ دوسرا نام "الملائکہ" بھی ہے اور یہ لفظ بھی پہلی آیت میں وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول اندازِ کلام کی اندرونی شہادت سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کا زمانہ غالباً مکہ معظمہ کا دورِ متوسط ہے اور اس کا بھی وہ حصہ جس میں مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بُری سے بُری چالیں چلی جا رہی تھیں۔

موضوع و مضمون کلام کا مدّعا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کے مقابلہ میں جو رویہ اُس وقت اہلِ مکہ اور اُن کے سرداروں نے اختیار کر رکھا تھا اس پر ناصحانہ انداز میں اُن کو تنبیہ و ملامت بھی کی جائے اور معلمانہ انداز میں فہمائش بھی۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نادانو، یہ نبی جس راہ کی طرف تم کو بلا رہا ہے۔ اس میں تمہارا اپنا بھلا ہے۔ اس پر تمہارا غصہ اور تمہاری مکاریاں اور چال بازیاں اور اُس کو ناکام کرنے کے لیے تمہاری تدبیریں در اصل اُس کے خلاف نہیں بلکہ تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہیں۔ اس کی بات نہ مانو گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس پر غور تو کرو، آخر اس میں غلط کیا بات ہے۔ وہ شرک کی تردید کرتا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا شرک کے لیے دنیا میں کوئی معقول بنیاد موجود ہے؟ وہ توحید کی دعوت دیتا ہے، تم خود عقل سے کام لے کر غور کرو کیا اللہ فاطر السمٰوٰت والارض کے سوا کہیں کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جو خدائی صفات اور اختیارات رکھتی ہو، وہ تم سے کہتا ہے کہ تم دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہو بلکہ تمہیں اپنے خدا کو اپنے

اعمال کا حساب دینا ہے اور اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کا نتیجہ دیکھنا ہوگا۔ تم تو دسوچو کہ اس پر تمہارے شبہات اور اچنبھے کس قدر بے اصل ہیں۔ کیا تمہاری آنکھیں رات دن اعادۂ خلق کا مشاہدہ نہیں کر رہی ہیں؟ پھر تمہارا ہی اعادہ اس خدا کے لیے کیوں ناممکن ہو جس نے تم کو ایک ذرا سے نطفے سے پیدا کر دیا، کیا تمہاری عقل یہ گواہی نہیں دیتی کہ بھلے اور بُرے کو یکساں نہ ہونا چاہیے؟ پھر تم ہی بتاؤ کہ معقول بات کیا ہے؟ یہ کہ بھلے اور بُرے کا انجام یکساں ہو، یعنی مٹی میں مِلنا اور فنا ہو جانا؟ یا یہ کہ بھلے کو بھلا اور بُرے کو بُرا بدلہ ملے۔ اب اگر ان سراسر معقول اور مبنی برحقیقت باتوں کو تم نہیں مانتے اور جھوٹے خداؤں کی بندگی نہیں چھوڑتے اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھتے ہوئے شترِ بے مہار ہی کی طرح دنیا میں جینا چاہتے ہو تو اس میں نبی کا کیا نقصان ہے۔ شامت تو تمہاری اپنی ہی آئے گی۔ نبی پر صرف سمجھانے کی ذمہ داری تھی اور وہ اس نے ادا کر دی۔

سلسلۂ کلام میں بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ جب نصیحت کا حق پوری طرح ادا کر رہے ہیں تو گمراہی پر اصرار کرنے والوں کے لیے راہِ راست قبول نہ کرنے کی کوئی ذمہ داری آپ کے اُوپر عائد نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ آپؐ کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے ان کے رویّے پر نہ آپؐ غمگین ہوں اور نہ انہیں راہِ راست پر لانے کی فکر میں اپنی جان گھلائیں۔ اس کے بجائے آپ اپنی توجہات اُن لوگوں پر صَرف کریں جو بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

ایمان قبول کرنے والوں کو بھی اسی سلسلے میں بڑی بشارتیں دی گئی ہیں تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے راہِ حق میں ثابت قدم رہیں۔

یٰسٓ

نام آغاز ہی کے دو حرفوں کو اس سُورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس سورے کا زمانۂ نزول یا تو مکہ کے دورِ متوسط کا آخری زمانہ ہے، یا پھر یہ زمانۂ قیامِ مکّہ کے آخری دَور کی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع و مضمون کلام کا مدعا کفارِ قریش کو نبوّتِ محمدیؐ پر ایمان نہ لانے اور ظلم و استہزاء سے اس کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈرانا ہے۔ اس میں انذار کا پہلو غالب اور نمایاں ہے مگر بار بار انذار کے ساتھ استدلال سے تفہیم بھی کی گئی ہے۔

استدلال تین امور پر کیا گیا ہے:

توحید پر آثارِ کائنات اور عقلِ عام سے،

آخرت پر آثارِ کائنات، عقلِ عام اور انسان کے اپنے وجود سے،

اور رسالتِ محمدیؐ کی صداقت پر اس بات سے کہ آپؐ تبلیغ رسالت میں یہ ساری مشقت محض بے غرضانہ برداشت کر رہے تھے اور اس امر سے کہ جن باتوں کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ سراسر معقول تھیں اور انہیں قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا بھلا تھا۔

اس استدلال کی قوت پر زجر و توبیخ اور ملامت و تنبیہ کے مضامین نہایت زوردار طریقے سے بار بار ارشاد ہوتے ہیں تاکہ دلوں کے قفل ٹوٹیں اور جن کے اندر قبولِ حق کی تھوڑی سی صلاحیت بھی ہو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

امام احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہ اور طبرانی وغیرہ نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یٰسٓ قلب القرآن یعنی یہ سورہ قرآن کا دل ہے۔ یہ اُسی طرح کی تشبیہ ہے جس طرح سورہ فاتحہ کو اُمُّ القرآن فرمایا گیا ہے۔ فاتحہ کو اُمّ القرآن قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں قرآن مجید کی پوری تعلیم کا خلاصہ آگیا ہے اور یٰسٓ کو قرآن کا دھڑکتا ہوا دل اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کی دعوت کو نہایت پُرزور طریقے سے پیش کرتی ہے جس سے جمود ٹوٹتا اور رُوح میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

انہی حضرت مَعقِل بن یسار سے، امام احمدؒ، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اقرءوا سورۃ یٰسٓ علی موتاکم۔ اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ مرتے وقت مسلمان کے ذہن میں نہ صرف یہ کہ تمام اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ اُس کے سامنے عالمِ آخرت کا پورا نقشہ بھی آجائے اور وہ جان لے کہ حیاتِ دنیا کی منزل سے گزر کر اب آگے کن منزلوں سے اس کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس مصلحت کی تکمیل کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر عربی داں آدمی کو سورۂ یٰسٓ سنانے کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی سنا دیا جائے تاکہ تذکیر کا حق پوری طرح ادا ہو جائے۔

الصّٰفّٰت

نام
پہلی ہی آیت کے لفظ والصافات سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول
مضامین اور طرزِ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ غالباً مکی دور کے وسط میں بلکہ شاید اس دورِ متوسط کے بھی آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبی و اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع اور مضمون
اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزاء کے ساتھ دیا جا رہا تھا اور آپؐ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اس پر کفارِ مکہ کو نہایت پُر زور طریقہ سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انہیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبرؐ جس کا تم مذاق اُڑا رہے ہو تمہارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آ جائے گا اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے۔ (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اس زمانے میں دیا گیا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بری طرح ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰۔ ۵۰ صحابہ مکہ میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ ان حالات میں ظاہر اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخر کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت کو نصیب ہو گا بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی لیکن ۱۵-۱۶

سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آگیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم و ترغیب کا حق بھی پورے توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر مختصر دل نشین دلائل دیے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں۔ ان گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کس قدر شاندار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے، کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے بلکہ ان مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سنا کر انہیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصل رُوح کیا ہے اور اسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ آیات سنا کر خوش خبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آرہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہی کو نصیب ہوگا، اور اہلِ باطل کے وہ علمبردار جو اس وقت غالب نظر آرہے ہیں انہی کے ہاتھوں مغلوب و مفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ محض خالی تسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

ص

نام

آغاز ہی کے حرف ص کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، بعض روایات کی رو سے یہ سورۃ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں علانیہ دعوت کا آغاز کیا تھا اور قریش کے سرداروں میں اس پر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا زمانۂ نزول تقریباً نبوت کا چوتھا سال قرار پاتا ہے۔ بعض دوسری روایات حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد کا واقعہ بتاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ اور ایک سلسلۂ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کے آخری مرض کے زمانہ میں وہ معاملہ پیش آیا تھا جس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اسے اگر صحیح مانا جائے تو یہ زمانۂ نزول نبوت کا دسواں یا گیارہواں سال ہے۔

تاریخی پس منظر

امام احمد، نسائی، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور محمد بن اسحٰق وغیرہ نے جو روایات نقل کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے تو انہوں نے مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے، اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش جن میں ابو جہل، ابوسفیان، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل، اسود بن المطلب، عُقبہ بن ابی مُعیط، عُتبہ اور شیبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات

بیان کیں، پھر کہا ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں، مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے حضورؐ کو وہ بات بتائی جو سرداران قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا چچا جان، مَیں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹ پٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے، تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اس پر وہ

---

[1] حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا اریدھم علی کلمة واحدة یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتودی الیھم بھا العجم الجزیة۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الی ان یتکلموا بکلمة تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابوطالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: کلمة واحدة تعطرنیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتم ان اعطیتکم کلمة تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مدعا سب کا یکساں ہے۔ یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں۔

سب یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو اس سورۃ کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہیں۔

ابن سعد نے طبقات میں یہ سارا قصہ اُسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اوپر مذکور ہوا مگر اُن کی روایت کے مطابق یہ ابو طالب کے مرض وفات کا نہیں بلکہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ نے دعوتِ عام کی ابتدا کی تھی اور مکہ میں پے در پے یہ خبریں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں کہ آج فلاں آدمی مسلمان ہوا اور کل فلاں۔ اُس وقت سردارانِ قریش یکے بعد دیگرے کئی وفد ابوطالب کے پاس لے کر پہنچے تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ سے روک دیں اور انھیں وفود میں سے ایک وفد کے ساتھ یہ گفتگو ہوئی تھی۔

زمخشری، رازی، نیسابوری اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وفد ابوطالب کے پاس اُس وقت گیا تھا جب عمرؓ کے ایمان لانے پر سردارانِ قریش بوکھلا گئے تھے لیکن کتبِ روایت میں سے کسی میں اس کا حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے اور نہ ان مفسرین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے تاہم اگر یہ صحیح ہو تو یہ ہے سمجھ میں نہ آنے والی بات۔ اس لیے کہ کفارِ قریش پہلے ہی یہ دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے کہ اسلام کی دعوت لے کر اُن کے درمیان سے ایک ایسا شخص اُٹھا ہے جو اپنی شرافت، بے داغ سیرت اور دانائی و سنجیدگی کے اعتبار سے ساری قوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور پھر اس کا دست راست ابوبکرؓ جیسا آدمی ہے جسے مکے اور اس کے اطراف کا بچہ بچہ ایک نہایت شریف اور راست باز اور ذکی انسان کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب جو انھوں نے دیکھا ہوگا کہ عمر بن خطاب جیسا جری اور صاحبِ عزم آدمی بھی ان دونوں سے جا ملا ہے تو یقیناً انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ خطرہ حدِ برداشت سے گزرتا جا رہا ہے۔

موضوع اور مباحث

اوپر جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے اُسی پر تبصرے سے اس سورۃ کا آغاز ہوا ہے۔ کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ دعوتِ اسلامی کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا تکبّر اور حسد اور تقلیدِ اعمیٰ پر اصرار ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنی ہی برادری کے ایک آدمی کو خدا کا نبی مان کر اس کی پیروی قبول کرلیں۔ یہ انہی جاہلانہ تخیلات پر جمے رہنا چاہتے ہیں جن پر انھوں نے اپنے قریب کے زمانے کے لوگوں کو پایا ہے اور جب اس جہالت کے پردے کو چاک کر کے ایک شخص ان کے سامنے اصل حقیقت کو پیش کرتا ہے تو یہ اس پر کان کھڑے کرتے ہیں اور اسے

عجیب بات بلکہ نرالی اور انہونی بات قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک توحید اور آخرت کا تخیل محض ناقابلِ قبول ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تخیل ہے جس کا بس مذاق ہی اُڑایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ کے ابتدائی حصے میں بھی اور آخری فقروں میں بھی کفار کو صاف صاف متنبہ کیا ہے کہ جس شخص کا تم مذاق اُڑا رہے ہو اور جس کی رہنمائی قبول کرنے سے تم کو آج سخت انکار ہے عنقریب وہی غالب آکر رہے گا اور وہ وقت دور نہیں ہے جب اسی شہر مکہ میں جہاں تم اس کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو اس کے آگے تم سب سرنگوں نظر آؤ گے۔

پھر پے در پے ۹ پیغمبروں کا ذکر کر کے، جن میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا قصہ زیادہ مفصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات سامعین کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے۔ اس کے ہاں انسان کا صحیح رویہ ہی مقبول ہے۔ بے جا بات خواہ کوئی بھی کرے وہ اس پر گرفت کرتا ہے اور اس کے ہاں وہی لوگ پسند کیے جاتے ہیں جو لغزش پر اصرار نہ کریں بلکہ اس پر متنبہ ہوتے ہی تائب ہو جائیں اور دنیا میں آخرت کی جواب دہی کو یاد رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔

اس کے بعد فرماں بردار بندوں اور سرکش بندوں کے اُس انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو وہ عالم آخرت میں دیکھنے والے ہیں اور اس سلسلے میں کفار کو دو باتیں خاص طور پر بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ آج جن سرداروں اور پیشواؤں کے پیچھے جاہل لوگ اندھے بن کر ضلالت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں کل وہی جہنم میں اپنے پیروؤں سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ آج جن اہلِ ایمان کو یہ لوگ ذلیل و خوار سمجھ رہے ہیں کل یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ اُن کا جہنم میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اور یہ خود اُس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

آخر میں قصۂ آدم و ابلیس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفار قریش کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکنے سے جو تکبّر تمھیں مانع ہو رہا ہے وہی تکبّر آدمؑ کے آگے جھکنے سے ابلیس کو بھی مانع ہوا تھا۔ خدا نے جو مرتبہ آدمؑ کو دیا تھا اس پر ابلیس نے حسد کیا اور حکمِ خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو مرتبہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے اس پر تم حسد کر رہے ہو اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ جسے خدا نے رسول مقرر کیا ہے اس کی اطاعت کرو، اس لیے جو انجام ابلیس کا ہونا ہے وہی آخر کار تمھارا بھی ہونا ہے۔

الزُّمَر

نام

اس سورہ کا نام آیت نمبر ۷۱ و ۷۳ (وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَہَنَّمَ زُمَرًا اور وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّہُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ زمر آیا ہے۔

زمانۂ نزول

آیت نمبر ۱۰ (وَاَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ) سے اس امر کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرتِ حبشہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ بعض روایات میں یہ تصریح آئی ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا تھا جبکہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا عزم کیا۔ (روح المعانی، جلد ۲۳، صفحہ ۲۲۶)

موضوع اور مضمون

یہ پوری سورت ایک بہترین اور انتہائی مؤثر خطبہ ہے جو ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے مکہ معظمہ کی ظلم و تشدد سے بھری ہوئی اور عناد و مخالفت سے لبریز فضا میں دیا گیا تھا یہ ایک وعظ ہے جس کے مخاطب زیادہ تر کفارِ قریش ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اہلِ ایمان سے بھی خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اصل مقصود بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان خالص اللہ کی بندگی اختیار کرے اور کسی دوسرے کی طاعت و عبادت سے اپنی خدا پرستی کو آلودہ نہ کرے۔ اس اصل الاصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زور دار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج اور شرک کی غلطی اور اس پر جمے رہنے کے بُرے نتائج کو واضح کیا گیا ہے اور لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آ کر اپنے رب کی رحمت کی طرف پلٹ آئیں۔ اسی سلسلے میں اہلِ ایمان

کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو، اللہ تمہارے صبر کا اجر دے گا۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ان کفار کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دو کہ ان کا ظلم وستم کبھی تم کو اس راہ سے پھیر سکے گا اور اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ تم میرا راستہ روکنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو کر ڈالو، میں اپنا یہ کام جاری رکھوں گا۔

المؤمن

نام آیت ۲۸ کے فقرے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں اُس خاص مومن کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول ابن عباس اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ یہ سورۂ زمر کے بعد متصلاً نازل ہوئی ہے اور اس کا جو مقام قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں ہے وُہی ترتیب نزول کے اعتبار سے بھی ہے۔

حالاتِ نزول جن حالات میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے اُن کی طرف صاف اشارات اس کے مضمون میں موجود ہیں۔ کفارِ مکہ نے اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو طرح کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ ہر طرف جھگڑے اور بحثیں چھیڑ کر، طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات اٹھا کر، اور نت نئے الزامات لگا کر قرآن کی تعلیم اور اسلام کی دعوت اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنے شبہات اور وسوسے لوگوں کے دِلوں میں پیدا کر دیے جائیں کہ ان کو صاف کرتے کرتے آخر کار حضورؐ اور اہلِ ایمان زِچ ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کو قتل کر دینے کے لیے زمین ہموار کی جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے وہ پیہم سازشیں کر رہے تھے اور ایک مرتبہ تو عملاً انہوں نے اس کا اقدام بھی کر ڈالا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص کی روایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقبہ بن ابی مُعَیط آگے بڑھا اور اس نے آپؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دینا شروع کر دیا تاکہ گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انہوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیقؓ اُس ظالم سے کشمکش کر رہے

تھے اُس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ : اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ (کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے) تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ واقعہ سیرت ابن ہشام میں بھی منقول ہوا ہے اور نسائی اور ابن ابی حاتم نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

موضوع اور مباحث

صورتِ حال کے اِن دونوں پہلوؤں کو آغازِ تقریر ہی میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے اور پھر آگے کی پوری تقریر انہی دونوں پر ایک انتہائی مؤثر اور سبق آموز تبصرہ ہے۔

قتل کی سازشوں کے جواب میں مومنِ آلِ فرعون کا قصہ سنایا گیا ہے (آیات ۲۳ تا ۵۵) اور اس قصے کے پیرائے میں تین گروہوں کو تین مختلف سبق دیے گئے ہیں :

۱۔ کفار کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرنا چاہتے ہو یہی کچھ اپنی طاقت کے بھروسے پر فرعون حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اب کیا یہ حرکتیں کر کے تم بھی اُسی انجام سے دو چار ہونا چاہتے ہو جس سے وہ دوچار ہوا۔ ؟

۲۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو سبق دیا گیا ہے کہ یہ ظالم بظاہر خواہ کتنے ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں اور ان کے مقابلہ میں تم خواہ کتنے ہی کمزور اور بے بس ہو مگر تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس خدا کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے تم کام کر رہے ہو اس کی طاقت ہر دوسری طاقت پر بھاری ہے۔ لہٰذا جو بڑی سے بڑی خوفناک دھمکی بھی یہ تمہیں دے سکتے ہیں اس کے جواب میں بس خدا کی پناہ مانگ لو اور اس کے بعد بالکل بے خوف ہو کر اپنے کام میں لگ جاؤ۔ خدا پرست کے پاس ظالم کی ہر دھمکی کا بس ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ۔ اس طرح خدا کے بھروسے پر خطرات سے بے پروا ہو کر کام کرو گے تو آخر کار اس کی نصرت آ کر رہے گی اور آج کے فرعون بھی وہی کچھ دیکھ لیں گے جو کل کے فرعون دیکھ چکے ہیں۔ وہ وقت آنے تک ظلم و ستم کے جو طوفان بھی امنڈ امنڈ کر آئیں انہیں صبر کے ساتھ تمہیں برداشت کرنا ہی ہوگا۔

ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی معاشرے میں موجود تھا اور وہ اُن لوگوں کا

گروہ تھا جو دلوں میں جان چکے تھے کہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ ہے اور کفارِ قریش سراسر زیادتی کر رہے ہیں یہ جان لینے کے باوجود خاموشی کے ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ جب حق کے دشمن علانیہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظالمانہ اقدام کرنے پر تُل گئے ہیں تو حیف ہے تم پر اگر اب بھی تم بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہو۔ اس حالت میں جس شخص کا ضمیر بالکل مر نہ چکا ہو۔ اُسے تو اُٹھ کر وہ فرض انجام دینا چاہیئے جو فرعون کے دربار میں اُس کے اپنے درباریوں میں سے ایک راست باز آدمی نے اُس وقت انجام دیا تھا جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ مصلحتیں تمہیں زبان کھولنے سے باز رکھ رہی ہیں، یہی مصلحتیں اس شخص کے آگے بھی راستہ روک کر کھڑی ہوئی تھیں مگر اُس نے اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کہہ کر ان ساری مصلحتوں کو ٹھکرا دیا، اور اس کے بعد دیکھ لو کہ فرعون اُس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

اب رہا کفار کا وہ مجادلہ جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے مکّہ معظمہ میں شب و روز جاری تھا، تو اس کے جواب میں ایک طرف دلائل سے توحید اور آخرت کے اُن عقائد کا برحق ہونا ثابت کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان اصل بنائے نزاع تھے اور یہ حقیقت صاف کھول کر رکھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ کسی علم اور کسی دلیل و حجت کے بغیر ان سچائیوں کے خلاف تواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف اُن اصل محرکات کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کی بنا پر سردارانِ قریش اس قدر سرگرمی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ بظاہر انہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ حضورؐ کی تعلیم اور آپؐ کے دعوئے نبوت پر انہیں حقیقی اعتراضات ہیں جن کی وجہ سے وہ ان باتوں کو نہیں مان رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اُن کے لیے محض ایک جنگِ اقتدار تھی۔ آیت ۵۶ میں یہ بات کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اُن سے صاف کہہ دی گئی ہے کہ تمہارے انکار کی اصل وجہ وہ کبر ہے جو تمہارے دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت تسلیم کر لیں گے تو تمہاری بڑائی قائم نہ رہ سکے گی۔ اسی وجہ سے تم اُن کو زک دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔

اسی سلسلے میں کفار کو پے در پے تنبیہات کی گئی ہیں کہ اگر اللہ کی آیات کے مقابلہ میں مجادلہ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو اُسی انجام سے دوچار ہو گے جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اس سے بدتر انجام تمہارے لیے آخرت میں مقدر ہے۔ اُس وقت تم پچھتاؤ گے مگر اس وقت کا پچھتانا تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوگا۔

حٰمٓ السّجدۃ

نام اس سورۃ کا نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک حٰم، دوسرے السجدہ ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کا آغاز حٰم سے ہوتا ہے اور جس میں ایک مقام پر آیت سجدہ آئی ہے۔

زمانۂ نزول معتبر روایات کی رو سے اس کا زمانۂ نزول حضرت حمزہ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق نے مشہور تابعی محمد بن کعب القرظی سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عُتبہ بن رَبیعہ (ابوسفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عتبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا "بھتیجے، تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہے، مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو، تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا، قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی، اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ

ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوالولید، آپ کہیں، میں سنوں گا۔ اس نے کہا۔ بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں۔ کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔" عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟" اس نے کہا "ہاں۔" آپؐ نے فرمایا۔ "اچھا اب میری سنو۔" اس کے بعد آپؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اسی سورۃ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا "اے ابوالولید، میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔" عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا "خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا "کیا سن آئے؟" اس نے کہا "بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور اس کی عزت تمہاری ہی عزت ہو گی۔" سردارانِ قریش اس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے "ولید کے ابا، آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔" عتبہ نے کہا "میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔" (ابن ہشام، جلد ۱، ص ۳۱۳-۳۱۴)

اس قصے کو دوسرے متعدد محدثین نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے

کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔" بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ آپ لوگ جانتے ہیں، محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔" تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۹۰-۹۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۶۲)

موضوع اور مضمون

عتبہ کی اس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی اس میں اُن بیہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپؐ کی عقل پر حملہ تھا۔ اس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کے نبی اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہر حال کوئی امکان نہیں ہے، اب لامحالہ آپؐ کی اس دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے یا پھر معاذاللہ آپؐ کی عقل میں فتور آگیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپؐ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا، اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپؐ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بیہودگیوں پر جب مخالفین اُتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اُن کو قطعی نظر انداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو کہے۔

عتبہ کی باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس سورہ میں اُس مخالفت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے کفارِ مکہ کی طرف سے اُس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بد اخلاقی کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے، آپ خواہ کچھ کریں ہم آپ کی بات سن کر نہ دیں گے، ہم نے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں، اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی ہے جو ہمیں اور آپ کو کبھی نہ

ملنے دے گی۔

انہوں نے آپ کو صاف صاف نوٹس دے دیا تھا کہ آپ اپنی اِس دعوت کا کام جاری رکھیے، ہم آپ کی مخالفت میں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا کریں گے۔

انہوں نے آپ کو زک دینے کے لیے کام کا یہ نقشہ بنایا تھا کہ جب بھی آپ یا آپ کے پیروؤں میں سے کوئی عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کرے، فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

وہ پوری سرگرمی سے اس کام میں لگے ہوئے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو اُلٹے معنیٰ پہنا کر عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ بات کچھ کہی جاتی تھی اور وہ اُسے بناتے کچھ تھے۔ سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالتے تھے۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی لفظ کہیں سے اور کوئی فقرہ کہیں سے لے اُڑتے اور اس کے ساتھ اپنی طرف سے چار باتیں ملا کر نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے تاکہ قرآن اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کی جائے۔

عجیب عجیب قسم کے اعتراضات جڑتے تھے جن کا ایک نمونہ اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک عرب اگر عربی زبان میں کوئی کلام سناتا ہے تو اس میں معجزے کی کیا بات ہوئی۔ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں جس کا جی چاہے ایک کلام تصنیف کرے اور دعویٰ کر دے کہ وہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ معجزہ تو جب ہوتا کہ یہ شخص کسی دوسری زبان میں جسے یہ نہیں جانتا، یکایک اُٹھ کر ایک فصیح و بلیغ تقریر کر ڈالتا تب یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ اس کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اوپر کہیں سے اس پر نازل ہو رہا ہے۔

اس اندھی اور بہری مخالفت کے جواب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے:

(۱) یہ خدا ہی کا نازل کردہ کلام ہے اور عربی زبان ہی میں ہے۔ جو حقیقتیں اس میں صاف صاف کھول کر بیان کی گئی ہیں، جاہل لوگ ان کے اندر علم کی کوئی روشنی نہیں پاتے، مگر سمجھ بوجھ رکھنے والے اس روشنی کو دیکھ بھی رہے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اُٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے یہ کلام نازل کیا۔ کوئی اسے زحمت

سمجھتا ہے تو اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔ خوشخبری ہے اُن لوگوں کے لیے جو اس سے فائدہ اٹھائیں اور ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو اس سے منھ موڑ لیں۔

(۲) تم نے اگر اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں تو نبی کے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو نہیں سننا چاہتا اُسے سنائے اور جو نہیں سمجھنا چاہتا اس کے دل میں زبردستی اپنی بات اُتارے۔ وہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے، سننے والوں کو ہی سُنا سکتا ہے اور سمجھنے والوں ہی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۳) تم چاہے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو، مگر حقیقت یہی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی ہے اور تم کسی دوسرے کے بندے نہیں ہو۔ تمہاری ضد سے یہ حقیقت بہر حال نہیں بدل سکتی۔ مان لو گے اور اس کے مطابق اپنا عمل درست کر لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، نہ مانو گے تو خود ہی تباہی سے دوچار ہو گے۔

(۴) تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ شرک اور کفر تم کس کے ساتھ کر رہے ہو؟ اُس خدا کے ساتھ جس نے یہ اتھاہ کائنات بنائی ہے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جس کی پیدا کی ہوئی برکتوں سے اِس زمین میں تم فائدہ اُٹھا رہے ہو اور جس کے مہیا کیے ہوئے رزق پر تم پل رہے ہو۔ اُس کا شریک تم اُس کی حقیر مخلوقات کو بناتے ہو اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضد میں آکر منھ موڑتے ہو۔

(۵) اچھا نہیں مانتے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم پر اُسی طرح کا عذاب اچانک ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے جیسا عاد اور ثمود پر آیا تھا اور یہ عذاب بھی تمہارے جُرم کی آخری سزا نہ ہوگا، بلکہ آگے میدانِ حشر کی بازپرس اور جہنّم کی آگ ہے۔

(۶) بڑا ہی بدقسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطین جنّ و انس لگ جائیں جو اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں، اس کی حماقتوں کو اُس کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کریں اسے کبھی نہ تو خود صحیح بات سوچنے دیں نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں اور ہر ایک دوسرے کی شہ پا کر پہلے پر دہلا مار رہا ہے مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں

نے مجھے بہکایا تھا وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انہیں پاؤں تلے روند ڈالوں۔

(۷) یہ قرآن ایک اٹل کتاب ہے اسے تم اپنی گھٹیا چالوں اور اپنے جھوٹ کے ہتھیاروں سے شکست نہیں دے سکتے۔ باطل خواہ سامنے سے آئے یا درپردہ اور بالواسطہ حملہ آور ہو، اسے زک دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

(۸) آج تمہاری اپنی زبان میں یہ قرآن پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔ تو تم کہتے ہو کہ یہ کسی عجمی زبان میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم تمہاری ہدایت کے لیے عجمی زبان میں اسے بھیجتے تو تم ہی لوگ کہتے کہ یہ بھی عجیب مذاق ہے، عرب قوم کی ہدایت کے لیے عجمی زبان میں کلام فرمایا جا رہا ہے جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمہیں دراصل ہدایت مطلوب ہی نہیں ہے۔ نہ ماننے کے لیے نت نئے بہانے تراش رہے ہو۔

(۹) کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر فی الواقع حقیقت یہی نکلی کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو اس کا انکار کر کے اور اس کی مخالفت میں اتنی دور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے۔

(۱۰) آج تم نہیں مان رہے ہو، مگر عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام آفاق پر چھا گئی ہے اور تم خود اس سے مغلوب ہو چکے ہو۔ اُس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا تھا وہ حق تھا۔

مخالفین کو یہ جوابات دینے کے ساتھ اُن مسائل کی طرف بھی توجہ فرمائی گئی ہے جو اس شدید مزاحمت کے ماحول میں اہلِ ایمان کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھے۔ ایمان لانے والوں کے لیے اُس وقت تبلیغ کرنا تو درکنار، ایمان کے راستے پر قائم رہنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا اور ہر اُس شخص کی جان عذاب میں آ جاتی تھی جس کے متعلق یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی خوفناک جتھابندی اور ہر طرف چھائی ہوئی طاقت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ اس حالت میں اول تو یہ کہہ کر اُن کی ہمت بندھائی گئی کہ تم حقیقت میں بے یار و مددگار نہیں ہو بلکہ جو شخص بھی ایک دفعہ خدا کو اپنا رب مان کر اس عقیدے اور مسلک پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے، خدا کے فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور دنیا سے لے کر آخرت تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر یہ فرما کر ان کا حوصلہ

بڑھایا گیا ہے کہ بہترین ہے وہ انسان جو خود نیک عمل کرے، دوسروں کو خدا کی طرف بلائے اور ڈٹ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو سوال سخت پریشان کن تھا وہ یہ تھا کہ جب اس دعوت کی راہ میں ایسے سنگِ گراں حائل ہیں تو ان چٹانوں سے تبلیغ کا راستہ آخر کیسے نکالا جائے۔ اس سوال کا حل آپ کو یہ بتایا گیا کہ یہ نمائشی چٹانیں بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں، مگر اخلاقِ حسنہ کا ہتھیار وہ ہتھیار ہے جو انہیں توڑ کر اور پگھلا کر رکھ دے گا، صبر کے ساتھ اس سے کام لو اور جب کبھی شیطان اشتعال دلا کر کسی دوسرے ہتھیار سے کام لینے پر اُکسائے تو خدا سے پناہ مانگو۔

الشُّورٰی

نام آیت ۳۸ کے فقرے وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں لفظ شوریٰ آیا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کے مضمون پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ حٰمٓ السجدہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ یہ ایک طرح سے بالکل اُس کا تتمہ نظر آتی ہے۔ اس کیفیت کو ہر وہ شخص خود محسوس کر لے گا جو پہلے سورۂ حٰمٓ السجدہ کو بغور پڑھے اور پھر اس سورے کی تلاوت کرے۔ وہ دیکھے گا کہ اس سورۃ میں سردارانِ قریش کی اندھی بہری مخالفت پر بڑی کاری ضربیں لگائی گئی تھیں، تاکہ مکہ معظمہ اور اس کے گرد و پیش کے علاقے میں جس کسی کے اندر بھی اخلاق، شرافت اور معقولیت کی کوئی حس باقی ہو وہ جان لے کہ قوم کے بڑے لوگ کس قدر بے جا طریقے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہیں اور اُن کے مقابلہ میں آپؐ کی بات کتنی سنجیدہ، آپ کا موقف کتنا معقول اور آپ کا رویہ کیسا شریفانہ ہے۔ اس تنبیہ کے معاً بعد یہ سورۃ نازل کی گئی جس نے تفہیم کا حق ادا کر دیا اور ایسے دل نشین انداز میں دعوتِ محمدیؐ کی حقیقت سمجھائی جس کا اثر قبول نہ کرنا کسی ایسے شخص کے بس میں نہ تھا جو حق پسندی کا کچھ بھی مادہ اپنے اندر رکھتا ہو۔ اور جاہلیت کی گمراہیوں کے عشق میں بالکل اندھا نہ ہو چکا ہو۔

موضوع اور مضمون بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمارے نبی کی پیش کردہ باتوں پر یہ کیا چہ میگوئیاں کرتے پھر رہے ہو۔ یہ باتیں کوئی نئی اور نرالی نہیں ہیں، نہ یہی کوئی نادر واقعہ ہے جو تاریخ میں پہلی ہی مرتبہ پیش آیا ہو کہ ایک

شخص پر خدا کی طرف سے وحی آئے اور اسے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے ہدایات دی جائیں۔

ایسی ہی وحی، اسی طرح کی ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر پے در پے بھیجتا رہا ہے اور نرالی، اچنبھے کے قابل بات یہ نہیں ہے کہ آسمان و زمین کے مالک کو معبود اور حاکم مانا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کے بندے ہو کر، اس کی خدائی میں رہتے ہوئے کسی دوسرے کی خداوندی تسلیم کی جائے۔ تم توحید پیش کرنے والے پر بگڑ رہے ہو حالانکہ مالکِ کائنات کے ساتھ جو شرک تم کر رہے ہو وہ ایسا جرمِ عظیم ہے کہ آسمان اس پر پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں۔ تمہاری اس جسارت پر فرشتے حیران ہیں اور ہر وقت ڈر رہے ہیں کہ نہ معلوم کب تم پر خدا کا غضب ٹوٹ پڑے۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ نبوت پر کسی شخص کا مقرر کیا جانا، اور اس شخص کا اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرنا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ خلقِ خدا کی قسمتوں کا مالک بنا دیا گیا ہے اور اسی دعوے کے ساتھ وہ میدان میں آیا ہے۔ قسمتیں تو اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ نبی صرف غافلوں کو چونکانے اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتانے آیا ہے۔ اس کی بات نہ ماننے والوں کا محاسبہ کرنا اور انہیں عذاب دینا یا نہ دینا اللہ کا اپنا کام ہے۔ یہ کام نبی کے سپرد نہیں کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دو کہ نبی اس طرح کے کسی دعوے کے ساتھ آیا ہے جیسے دعوے تمہارے ہاں کے نام نہاد مذہبی پیشوا اور پیر فقیر کیا کرتے ہیں جو ان کی بات نہ مانے گا، یا ان کی شان میں گستاخی کرے گا وہ اسے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اسی سلسلے میں لوگوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نبی تمہاری بدخواہی کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ تو ایک خیر خواہ ہے جو تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو اس میں تمہاری اپنی تباہی ہے۔

پھر اس مسئلے کی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر راست رو کیوں نہ بنا دیا اور یہ مجالِ اختلاف کیوں رکھی جس کی وجہ سے لوگ فکر و عمل کے ہر الٹے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی چیز کی بدولت تو یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ انسان اللہ کی اس رحمتِ خاص کو پا سکے جو دوسری بے اختیار مخلوقات کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اس ذی اختیار مخلوق کے لیے ہے جو جبلّی طور پر نہیں شعوری طور پر اپنے اختیار سے اللہ کو اپنا ولی Patron - Guardian بنائے۔ یہ روش جو انسان اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سہارا دے کر، اس کی

رہنمائی کرکے، اسے حسنِ عمل کی توفیق دے کر، اپنی رحمتِ خاص میں داخل کرلیتا ہے اور جو انسان اپنے اختیار کو غلط استعمال کرکے ان کو ولی بناتا ہے جو درحقیقت ولی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے، وہ اس رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کا اور ساری مخلوقات کا ولی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے نہ حقیقت میں ولی ہیں، نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ ولایت کا حق ادا کرسکیں۔ انسان کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے اختیار سے ولی کا انتخاب کرنے میں غلطی نہ کرے اور اسی کو اپنا ولی بنائے جو درحقیقت ولی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس دین کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہ حقیقت میں ہے کیا:

اس کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کائنات اور انسان کا خالق، مالک اور ولیِ حقیقی ہے، اِس لیے وہی انسان کا حاکم بھی ہے اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان کو دین اور شریعت (اعتقاد و عمل کا نظام) دے اور انسانی اختلافات کا فیصلہ کرکے بتائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ دوسری کسی ہستی کو انسان کے لیے شارع Lawgiver بننے کا سرے سے حق ہی نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر فطری حاکمیت کی طرح تشریعی حاکمیت بھی اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان یا کوئی غیر اللہ اس حاکمیت کو نہیں مانتا تو اس کا اللہ کی محض فطری حاکمیت کو ماننا لاحاصل ہے۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے انسان کے لیے ایک دین مقرر کیا ہے۔

وہ ایک ہی دین تھا جو ہر زمانے میں تمام انبیاء کو دیا جاتا رہا۔ کوئی نبی بھی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی نہیں تھا۔ وہی ایک دین اوّل روز سے نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا رہا ہے اور سارے انبیاء اسی کے پیرو اور داعی رہے ہیں۔

وہ دین کبھی محض مان کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ ہمیشہ اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے کہ زمین پر وہی قائم اور رائج اور نافذ ہو اور اللہ کے ملک میں اللہ کے دین کے سوا کسی اور کے ساختہ و پرداختہ دین کا سکہ نہ چلے۔ انبیاء علیہم السلام اس دین کی محض تبلیغ پر نہیں بلکہ اُسے قائم کرنے کی خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔

نوعِ انسانی کا اصل دین یہی تھا، مگر انبیاء کے بعد ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ خود غرض لوگ

اس کے اندر اپنی خود پسندی، خود رائی اور خود نمائی کے باعث اپنے مفاد کی خاطر تفرقے برپا کرکے نئے نئے مذہب نکالتے رہے۔ دنیا میں یہ جتنے بھی مختلف مذہب پائے جاتے ہیں سب اُسی ایک دین کو بگاڑ کر پیدا کیے گئے ہیں۔

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان متفرق طریقوں اور مصنوعی مذہبوں اور انسانی ساخت کے دینوں کی جگہ وہی اصل دین لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اسی کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے اگر تم اُلٹے بگڑتے ہو اور لڑنے کو دوڑتے ہو تو یہ تمہاری نادانی ہے۔ تمہاری اس حماقت کی وجہ سے نبی اپنا کام نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ اس بات پر مامور ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر جم جائے اور اس کام کو پورا کرے جس پر وہ مامور ہوا ہے۔ اُس سے یہ امید نہ رکھو کہ وہ تمہیں راضی کرنے کے لیے دین میں انہی اوہام و خرافات اور جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کے لیے کوئی گنجائش نکالے گا جن سے خدا کا دین پہلے خراب کیا جاتا رہا ہے۔

تم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو اختیار کرنا اللہ کے مقابلے میں کتنی بڑی جسارت ہے۔ تم اپنے نزدیک اسے دنیا کا معمول سمجھ رہے ہو، اور تمہیں اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، مگر اللہ کے نزدیک یہ بدترین شرک اور شدید ترین جرم ہے جس کی سخت سزا اُن سب لوگوں کو بھگتنی پڑے گی جنہوں نے اللہ کی زمین پر اپنا دین جاری کیا اور جنہوں نے اُن کے دین کی پیروی اور اطاعت کی۔

اِس طرح دین کا ایک صاف اور واضح تصوّر پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم لوگوں کو سمجھا کر راہِ راست پر لانے کے لیے جو بہتر سے بہتر طریقہ ممکن تھا وہ استعمال کیا جا چکا۔ ایک طرف اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی جو نہایت دل نشین طریقے سے تمہاری اپنی زبان میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہے اور دوسری طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی زندگیاں تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں جنہیں دیکھ کر تم جان سکتے ہو کہ اس کتاب کی رہنمائی میں کیسے انسان تیار ہوتے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم ہدایت نہ پاؤ پھر دنیا میں کوئی چیز تمہیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی۔ اس کا نتیجہ تو پھر یہی ہے کہ تمہیں اُسی گمراہی میں پڑا رہنے دیا جائے جس میں تم صدیوں سے مبتلا ہو اور اُسی انجام سے تم کو دوچار کر دیا جائے جو ایسے گمراہوں کے لیے اللہ کے ہاں مقدر ہے۔

ان حقائق کو بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں اختصار کے ساتھ توحید اور آخرت کے دلائل دیے گئے ہیں۔ دنیا پرستی کے نتائج پر متنبہ کیا گیا ہے۔ آخرت کی سزا سے ڈرایا گیا ہے اور کفار کی اُن اخلاقی کمزوریوں پر گرفت کی گئی ہے جو ہدایت سے اُن کے منھ موڑنے کا اصل سبب تھیں۔ پھر کلام کو ختم کرتے ہوئے دو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس سال میں "کتاب" کے تصور سے بالکل خالی الذہن اور ایمان کے مسائل و مباحث سے قطعی ناواقف رہنا، اور پھر یکایک ان دونوں چیزوں کو لے کر دنیا کے سامنے آجانا، آپؐ کے نبی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ کا اپنی پیش کردہ تعلیم کو خدا کی تعلیم قرار دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ آپ خدا سے رُو در رُو کلام کرنے کے مدّعی ہیں بلکہ خدا نے یہ تعلیم تمام انبیاء کی طرح آپ کو بھی تین طریقوں سے دی ہے، ایک وحی، دوسرے پردے کے پیچھے سے آواز اور تیسرے فرشتے کے ذریعے سے پیغام۔ یہ وضاحت اِس لیے کی گئی کہ مخالفین یہ الزام تراشی نہ کرسکیں کہ حضورؐ رُو در رُو کلام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور حق پسند لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسان نبوّت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہو اُسے کن طریقوں سے ہدایات دی جاتی ہیں۔

الزُّخرُف

نام

آیت ۳۵ کے لفظ وَ زُخْرُفاً سے ماخوذ ہے مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ زُخْرُفْ آیا ہے۔

زمانۂ نزول

کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہے جس میں المؤمن اور الشوریٰ نازل ہوئیں۔ یہ ایک ہی سلسلے کی سورتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا نزول اُس وقت سے شروع ہوا جب کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ شب و روز اپنی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر مشورے کر رہے تھے کہ آپؐ کو کس طرح ختم کیا جائے اور ایک حملہ آپؐ کی جان پر ہو بھی چکا تھا۔ اس صورتِ حال کی طرف آیات ۷۹۔۸۰ میں صاف اشارہ موجود ہے۔

موضوع اور مباحث

اِس سورے میں پورے زور کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے اُن جاہلانہ عقائد و اوہام پر تنقید کی گئی ہے جن پر وہ اصرار کیے چلے جا رہے تھے اور نہایت محکم و دل نشین طریقے سے ان کی نامعقولیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد جس کے اندر کچھ بھی معقولیت موجود ہو یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر یہ کیسی جہالتیں ہیں جن سے ہماری قوم بُری طرح چمٹی ہوئی ہے اور جو شخص ہمیں ان کے چکر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

کلام کا آغاز اِس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی شرارتوں کے بل پر یہ چاہتے ہو کہ اس کتاب کا نزول روک دیا جائے، مگر اللہ نے کبھی اشرار کی وجہ سے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کی تنزیل نہیں روکی ہے بلکہ اُن ظالموں کو ہلاک کر دیا ہے جو اُس کی ہدایت کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی کچھ

وہ اب بھی کرے گا۔ آگے چل کر آیات ۴۱-۴۳ اور ۷۹-۸۰ میں یہ مضمون پھر دہرایا گیا ہے۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے اُن کو سناتے ہوئے حضورؐ سے فرمایا گیا ہے کہ تم خواہ زندہ رہو یا نہ رہو ان ظالموں کو ہم سزا دے کر رہیں گے اور خود اُن لوگوں کو صاف صاف متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہمارے نبی کے خلاف ایک اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کُن قدم اُٹھائیں گے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ وہ مذہب کیا ہے جسے یہ لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور وہ دلائل کیا ہیں جن کے بل بوتے پر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا، اور ان کا اپنا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ جن نعمتوں سے یہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دوسروں کو اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک کرنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔

بندوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے ہیں اور اولاد بھی بیٹیاں جنہیں خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہیں۔

فرشتوں کو انہوں نے دیویاں قرار دے رکھا ہے۔ ان کے بُت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے ہیں۔ انہیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کی عبادت کرتے ہیں اور انہی سے منتیں اور مُرادیں مانگتے ہیں۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ فرشتے عورتیں ہیں؟

ان جہالتوں پر ٹوکا جاتا ہے تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے ان بُتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں نہ کہ وہ کام جو دنیا میں اُس کی مشیت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیت کے تحت تو ایک بُت پرستی ہی نہیں، چوری، زنا، ڈاکہ، قتل سب کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اس دلیل سے ہر اُس بُرائی کو جائز و برحق قرار دیا جائے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے؟

پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اس شرک کے لیے تمہارے پاس اس غلط دلیل کے سوا کوئی اور

سند بھی ہے تو جواب دیتے ہیں کہ باپ دادا سے یہ کام یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل ہے، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام جن کی اولاد ہونے پر ہی ان کے سارے فخر و امتیاز کا مدار ہے، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور انہوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو رد کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیل معقول نہ دیتی ہو، پھر اگر ان لوگوں کو اسلاف کی اندھی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا۔

ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں تو عیسائیوں کے اس فعل کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریم کو ابن اللہ مانا اور ان کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی اُمت نے شرک کیا ہے یا نہیں بلکہ یہ تھا کہ خود کسی نبی نے شرک کی تعلیم دی ہے؟ عیسیٰ ابن مریم نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو۔ ان کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے۔ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی، اسی کی تم عبادت کرو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرتے ہیں انہیں تامل ہے تو اس بنا پر کہ ان کے پاس مال و دولت اور ریاست و جاہت تو ہے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہمارے ہاں کسی کو نبی بنانا چاہتا تو ہمارے دونوں شہروں (مکہ و طائف) کے بڑے آدمیوں میں سے کسی کو بناتا۔ اسی بنا پر فرعون نے بھی حضرت موسیٰ کو حقیر جانا تھا اور کہا تھا کہ آسمان کا بادشاہ اگر مجھ زمین کے بادشاہ کے پاس کوئی ایلچی بھیجتا تو اسے سونے کے کنگن پہنا کر، فرشتوں کی ایک فوج اس کی اردلی میں دے کر بھیجتا۔ یہ فقیر کہاں سے آ کھڑا ہوا؟ فضیلت مجھے حاصل ہے کہ مصر کی بادشاہی میری ہے اور دریائے نیل کی نہریں میری ماتحتی میں چل رہی ہیں۔ یہ شخص میرے مقابلے کیا حیثیت رکھتا ہے کہ نہ مال رکھتا ہے نہ اقتدار۔

اس طرح کفار کی ایک ایک جاہلانہ بات پر تنقید کرتے اور اس کے نہایت معقول و مدلل جوابات دینے کے بعد آخر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ نہ خدا کی کوئی اولاد ہے، نہ آسمان و زمین کے

خدا الگ الگ ہیں، نہ اللہ کے ہاں کوئی ایسا شفیع ہے جو جان بوجھ کر گمراہی اختیار کرنے والوں کو اُس کی سزا سے بچا سکے اللہ کی ذات اس سے منزہ ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو۔ وہی اکیلا ساری کائنات کا خدا ہے باقی سب اس کے بندے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ خدائی صفات و اختیارات میں شریک۔ اور شفاعت اس کے ہاں صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود حق پرست ہوں اور انہی کے لیے کر سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں حق پرستی اختیار کی ہو۔

اَلدُّخان

نام آیت نمبر ۱۰ - یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ کے لفظ دُخان کو اس سورۃ کا عنوان بنایا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ دخان وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا، مگر مضامین کی اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ بھی اسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ زخرف اور اس سے پہلے کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں، البتہ یہ اُن سے کچھ متاخر ہے۔ تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب کفّار مکہ کی مخالفانہ روش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضور کا خیال یہ تھا کہ جب ان لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انہیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اٹھے۔ آخر کار بعض سردارانِ قریش، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے خاص طور پر ابوسفیان کا نام لیا ہے، حضورؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی اپنی قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کے لیے اللہ سے دعا کریں۔ یہی موقع ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

موضوع اور مباحث اس موقع پر کفارِ مکّہ کی فہمائش اور تنبیہ کے لیے جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا اس کی تمہید چند اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

اوّل یہ کہ تم لوگ اس قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو۔ یہ کتاب اپنی ذات میں خود اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوند عالم کی کتاب ہے۔

دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں بھی غلطی کر رہے ہو۔ تمہارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہو گئی ہے حالانکہ درحقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر تمہارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب نازل فرمانے کا فیصلہ فرمایا۔

تیسرے یہ کہ تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے، حالانکہ اس رسول کی بعثت اور اس کتاب کی تنزیل اُس ساعتِ خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے اور اللہ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انہیں بدل ڈالے، نہ وہ کسی جہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو۔ وہ تو اُس فرمانروائے کائنات کے پختہ اور اٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع و علیم اور حکیم ہے۔ اُن سے لڑنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ اللہ کو تم خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے مگر اس کے باوجود تمہیں دوسروں کے معبود بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمہارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص شعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی و موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہو سکتا کہ معبود ہونے کے مستحق اُس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کر کے اسی کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ، حقیقت میں تو اُن کا رب بھی اکیلا وہی خدا تھا جو تمہارا رب ہے اور انہیں بھی اسی ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمہیں کرنی چاہیے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی ربوبیت و رحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمہارا پیٹ پالے بلکہ یہ بھی ہے کہ تمہاری رہنمائی کا انتظام کرے۔ اسی رہنمائی کے لیے اُس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اُس قحط کے معاملے میں کو لیا گیا ہے جو اُس وقت درپیش تھا جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ قحط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی استدعا پر آیا تھا اور حضورؐ نے اس کے

لیے دعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ شاید کہ پھر حرفِ نصیحت ان پر کارگر ہو۔ یہ توقع اس وقت کسی حد تک پوری ہوتی نظر آرہی تھی کیونکہ بڑے بڑے ہیکڑ دشمنانِ حق کال کے مارے پکار اُٹھے تھے کہ پروردگار' یہ عذاب ہم پر سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اس پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے یہ لوگ کہاں سبق لینے والے ہیں۔ انہوں نے جب اُس رسول کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کی زندگی سے' جس کے کردار سے اور جس کے کام اور کلام سے علانیہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے' تو اب بھلا ایک قحط ان کی غفلت دور کر دے گا۔ دوسری طرف کفار کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہوا ہے کہ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو کہ یہ عذاب تم پر سے ٹال دیا جائے تو تم ایمان لے آؤ گے۔ ہم اس عذاب کو ہٹائے دیتے ہیں۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں کتنے سچے ہو۔ تمہارے سر پر تو شامت کھیل رہی ہے' تم ایک بڑی ضرب مانگ رہے ہو' ہلکی چوٹوں سے تمہارا دماغ دُرست نہیں ہو گا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو بھی ٹھیک یہی آزمائش پیش آئی تھی جس سے اب کفارِ قریش کے سرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ اُن کے پاس بھی ایک ایسا ہی معزز رسول آیا تھا۔ انہوں نے بھی وہ صریح علامات اور نشانیاں دیکھ لی تھیں جن سے اس کا مامور من اللہ ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بھی نشانی پر نشانی دیکھتے چلے گئے' مگر اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ آخر کار رسول کی جان لینے کے درپے ہو گئے' اور نتیجہ وہ کچھ دیکھا جو ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا موضوع آخرت کا لیا گیا ہے جس سے کفارِ مکہ کو شدت کے ساتھ انکار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ کر آتے نہیں دیکھا ہے۔ تم اگر دوسری زندگی کے دعوے میں سچے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو' اس کے جواب میں عقیدۂ آخرت کی دو دلیلیں مختصر طور پر دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس عقیدے کا انکار ہمیشہ اخلاق کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے بلکہ ایک حکیمانہ نظام ہے اور حکیم کا کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ پھر کفار کے اس مطالبہ کا کہ اُٹھا لاؤ

ہمارے باپ دادا کو، یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ کام روز روز ہر ایک کے مطالبے پر نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے اللہ نے ایک مقررہ وقت فرما دیا ہے جب وہ تمام نوع انسانی کو بیک وقت جمع کرے گا اور اپنی عدالت میں ان کا محاسبہ فرمائے گا۔ اُس وقت کی اگر کسی کو فکر کرنی ہو تو کر لے، کیونکہ وہاں کوئی نہ اپنے زور پر بچ سکے گا نہ کسی کے بچائے بچے گا۔

اللہ کی اس عدالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں مجرم قرار پائیں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جو وہاں سے کامیاب ہو کر نکلیں گے وہ کیا انعام پائیں گے، پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ قرآن صاف سیدھی زبان میں اور تمہاری اپنی زبان میں نازل کر دیا گیا ہے، اب اگر تم سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور انجام بد دیکھنے پر مصر ہو تو انتظار کرو، ہمارا نبی بھی منتظر ہے جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت پر سامنے آجائے گا۔

اَلجَاثِیَہ

نام آیت ۲۸ کے فقرے وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں لفظ جاثیہ آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس سورۃ کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر روایت میں بیان نہیں ہوا ہے مگر اس کے مضامین سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۂ دخان کے قریبی زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین میں ایسی مشابہت ہے جس سے یہ دونوں توام نظر آتی ہیں۔

موضوع اور مباحث اس کا موضوع توحید و آخرت کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دینا اور اُس رویّے پر اُن کو متنبہ کرنا ہے جو انہوں نے قرآن کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔

کلام کا آغاز توحید کے دلائل سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انسان کے اپنے وجود سے لے کر زمین و آسمان تک ہر طرف پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ اُٹھا کر دیکھو، ہر چیز اُسی توحید کی شہادت دے رہی ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ یہ طرح طرح کے حیوانات، یہ شب و روز، یہ بارشیں اور ان سے اُگنے والی نباتات، یہ ہوائیں اور یہ انسان کی اپنی پیدائش، ان ساری چیزوں کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر دیکھے اور کسی تعصب کے بغیر اپنی عقل کو سیدھے طریقے سے استعمال کر کے ان پر غور کرے تو یہ نشانیاں اسے اس امر کا یقین دلانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے اور نہ بہت سے خداؤں کی خدائی میں چل رہی ہے، بلکہ ایک ہی خدا نے اسے بنایا ہے اور وہی اکیلا اس کا مدبّر اور فرماں روا

ہے۔ البتہ اُس شخص کی بات دوسری ہے جو نہ ماننے کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو، یا شکوک و شبہات ہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ اُسے دنیا میں کہیں سے بھی یقین و ایمان کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر دوسرے رکوع کی ابتدا میں پھر فرمایا گیا ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنی چیزوں سے کام لے رہا ہے اور جو بے حد و حساب اشیاء اور قوتیں اس کائنات میں اُس کے مفاد کی خدمت کر رہی ہیں وہ آپ سے آپ کہیں سے نہیں آگئی ہیں، نہ دیویوں اور دیوتاؤں نے انہیں فراہم کیا ہے، بلکہ وہ ایک ہی خدا ہے جس نے یہ سب کچھ اپنے پاس سے اس کو بخشا اور اس کے لیے مسخر کر دیا ہے کوئی شخص صحیح غور و فکر سے کام لے تو اس کی اپنی عقل ہی پکار اُٹھے گی کہ وہی خدا انسان کا محسن ہے اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان اُس کا شکر گزار ہو۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کو اُس ہٹ دھرمی، استکبار، استہزاء اور اصرار علی الکفر پر سخت ملامت کی گئی ہے جس سے وہ قرآن کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی جس کی بدولت وہ تمام اقوامِ عالم پر فضیلت کے مستحق ہوئے تھے۔ انہوں نے جب اس نعمت کی ناقدری کی اور دین میں اختلاف کر کے اسے کھو دیا تو اب یہ دولت تمہارے ہاں بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ انسان کو دکھاتا ہے جو لوگ اپنی جہالت و حماقت سے اس کو رَد کر دیں گے وہ اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے اور خدا کی تائید و رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو اس کی پیروی قبول کر کے تقویٰ کی روش پر قائم ہو جائیں۔

اسی سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ خدا سے بے خوف لوگ تمہارے ساتھ جو بیہودگیاں کر رہے ہیں اُن پر درگزر اور تحمل سے کام لو۔ تم صبر کرو گے تو خدا خود اُن سے نمٹے گا اور تمہیں اس صبر کا اجر عطا فرمائے گا۔

پھر عقیدۂ آخرت کے متعلق کفار کے جاہلانہ خیالات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ ہم گردشِ ایام سے بس اُسی طرح مرتے ہیں جس طرح ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جائے۔ موت کے بعد کوئی روح باقی نہیں رہتی جسے قبض کیا جاتا ہو اور پھر کسی وقت دوبارہ لا کر انسانی جسم میں پھونک دیا جائے۔ اس چیز کا اگر تمہیں دعوے ہے

تو ہمارے مرے ہوئے آباؤ اجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پے در پے چند دلائل ارشاد فرمائے ہیں۔

ایک یہ کہ تم یہ بات کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہو بلکہ محض گمان کی بنیاد پر اتنا بڑا حکم لگا بیٹھے ہو۔ کیا فی الواقع تمہیں یہ علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اور روحیں قبض نہیں کی جاتیں بلکہ فنا ہو جاتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمہارے اس دعوے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ بس یہ ہے کہ تم نے کسی مرنے والے کو اٹھ کر دنیا میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ کیا یہ بات اتنا بڑا دعویٰ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مرنے والے پھر کبھی نہیں اٹھیں گے؟ کیا تمہارے تجربے اور مشاہدے میں کسی چیز کا نہ آنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ تمہیں اس چیز کے نہ ہونے کا علم حاصل ہے؟

تیسرے یہ کہ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ نیک اور بد، فرمانبردار اور نافرمان، ظالم اور مظلوم آخر کار سب یکساں کر دیے جائیں۔ کسی بھلائی کا کوئی اچھا نتیجہ اور کسی برائی کا کوئی برا نتیجہ نہ نکلے۔ نہ کسی مظلوم کی دادرسی ہو اور نہ کوئی ظالم اپنے کیے کی سزا پائے، بلکہ سب ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ خدا کی اس کائنات کے متعلق جس نے یہ تصور قائم کیا ہے اس نے بڑا ہی غلط تصور قائم کیا ہے۔ اس تصور کو ظالم اور بدکار لوگ تو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کا برا نتیجہ نہیں دیکھنا چاہتے لیکن خدا کی یہ خدائی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ یہ ایک برحق نظام ہے جس میں نیک و بد کو بالآخر یکساں کر دینے کا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

چوتھے یہ کہ انکارِ آخرت کا عقیدہ اخلاق کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ اس کو اختیار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کے بندے بنے ہوئے ہیں اور اس لیے کہ انہیں بندگیٔ نفس کی کھلی چھوٹ مل جائے۔ پھر جب وہ اس عقیدے کو اختیار کر لیتے ہیں تو یہ انہیں گمراہ سے گمراہ تر کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی اخلاقی حس بالکل مردہ ہو جاتی ہے اور ہدایت کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ دلائل دینے کے بعد اللہ تعالیٰ پورے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ جس طرح تم آپ سے آپ زندہ نہیں ہو گئے ہو بلکہ ہمارے زندہ کرنے سے زندہ ہوئے ہو، اسی طرح تم آپ سے آپ

نہیں مر جاتے، بلکہ ہمارے موت دینے سے مرتے ہو اور ایک وقت ایسا آنا ہے جب تم سب بیک وقت جمع کیے جاؤ گے۔ اس بات کو اگر آج تم اپنی جہالت و نادانی سے نہیں مانتے تو نہ مانو جب وہ وقت آجائے گا تو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ اپنے خدا کے حضور پیش ہو اور تمہارا پورا نامۂ اعمال بے کم و کاست تیار ہے جو تمہارے ایک ایک کرتوت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عقیدۂ آخرت کا یہ انکار اور اُس کا یہ مذاق جو تم اُڑا رہے ہو تمہیں کس قدر مہنگا پڑا ہے۔

الاحقاف

نام آیت نمبر ۲۱ کے فقرے اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول ایک تاریخی واقعہ سے متعین ہو جاتا ہے جس کا ذکر آیات ۲۹ تا ۳۲ میں آیا ہے۔ ان آیات میں جنوں کے آنے اور قرآن سن کر واپس جانے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ حدیث و سیرت کی متفق علیہ روایات کی رُو سے اُس وقت پیش آیا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ معظمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نخلہ کے مقام پر ٹھیرے تھے اور تمام معتبر تاریخی روایات کے مطابق آپ کے طائف تشریف لے جانے کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے۔ لہٰذا یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ ۱۰ نبوی کے آخر یا ۱۱ نبوی کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی

تاریخی پس منظر ۱۰ نبوی حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں انتہائی سختی کا سال تھا۔ تین برس سے قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر بنی ہاشم اور مسلمانوں کا مکمل مقاطعہ کر رکھا تھا اور حضورؐ اپنے خاندان اور اپنے اصحاب کے ساتھ شعبِ ابی طالب[1] میں محصور تھے۔ قریش کے لوگوں نے ہر طرف سے اس محلے کی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس سے گزر کر کسی قسم کی رسد اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ صرف حج کے زمانے میں یہ محصورین

---

[1] شعبِ ابی طالب مکہ معظمہ کے ایک محلے کا نام تھا جس میں بنی ہاشم رہا کرتے تھے۔ شعب عربی زبان میں گھاٹی کو کہتے ہیں چونکہ یہ محلہ کوہِ ابو قبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا اور ابو طالب بنی ہاشم کے سردار تھے۔ اس لیے اسے شعبِ ابی طالب کہا جاتا تھا۔ مکہ معظمہ میں جو مکان آج مقامی روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ پیدائش کی حیثیت سے معروف ہے۔ اسی کے قریب یہ گھاٹی واقع تھی۔ اب اسے شعب علی یا شعب بنی ہاشم کہتے ہیں۔

نکل کر کچھ خریداری کر سکتے تھے مگر ابولہب جب بھی ان میں سے کسی کو بازار کی طرف، یا کسی تجارتی قافلے کی طرف جاتے دیکھتا، پکار کر تاجروں سے کہہ دیتا کہ جو چیز یہ خریدنا چاہیں اُس کی قیمت اتنی زیادہ بتاؤ کہ یہ نہ خرید سکیں پھر وہ چیز میں تم سے خرید لوں گا اور تمہارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ متواتر تین سال کے مقاطعہ نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ محاصرہ اِس سال ٹوٹا ہی تھا کہ حضورؐ کے چچا ابوطالب، جو دس سال سے آپؐ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے وفات پا گئے، اور اس سانحے پر بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ آپ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ بھی انتقال فرما گئیں جن کی ذات آغازِ نبوت سے لے کر اس وقت تک آپ کے لیے وجہِ سکون وتسلی بنی رہی تھی۔ ان پے در پے صدموں اور تکلیفوں کی وجہ سے حضورؐ اس سال کو عام الحزن (رنج و غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کے بعد کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے سے زیادہ آپؐ کو تنگ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کا گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔ اسی زمانہ کا یہ واقعہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ ایک روز قریش کے اوباشوں میں سے ایک شخص نے نے سرِ بازار آپؐ کے سر پر مٹی پھینک دی۔

آخر کار آپؐ اس ارادے سے طائف تشریف لے گئے کہ بنی ثقیف کو اسلام کی طرف دعوت دیں اور اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو انہیں کم از کم اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ آپؐ کو اپنے ہاں چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دے دیں۔ آپؐ کو اس وقت کوئی سواری تک میسر نہ تھی۔ مکہ سے طائف تک کا سارا سفر آپؐ نے پیدل طے کیا۔ بعض روایات کے مطابق آپؐ کے ساتھ صرف حضرت زید بن حارثہ تھے وہاں پہنچ کر چند روز آپؐ نے قیام کیا اور ثقیف کے سرداروں اور معززین میں سے ایک ایک کے پاس جا کر بات کی مگر انہوں نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی کوئی بات نہ مانی بلکہ آپؐ کو صاف صاف نوٹس دے دیا کہ ان کے شہر سے نکل جائیں کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں آپؐ کی تبلیغ ان کے نوجوانوں کو "بگاڑ" نہ دے۔ آپؐ کو مجبوراً طائف چھوڑ دینا پڑا۔ جب آپؐ وہاں سے نکلنے لگے تو ثقیف کے سرداروں نے اپنے ہاں کے لفنگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف دُور تک آپؐ پر آوازے کستے، گالیاں دیتے اور پتھر مارتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آپ زخموں سے چور ہو گئے اور آپؐ کی جوتیاں

خون سے بھر گئیں۔ اس حالت میں آپ طائف کے باہر ایک باغ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے اور اپنے رب سے عرض کیا:۔

"خداوندا، مَیں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین، تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے یا کسی دشمن کے حوالے جو مجھ پر قابو پالے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ مَیں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اُجالا اور دنیا اور آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے، مجھے اس سے بچالے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عذاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔" (ابن ہشام، ج ۲، ۶۲)

دل شکستہ و غمگین پلٹ کر جب آپ قرن المنازل کے قریب پہنچے تو محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک بادل سا چھایا ہوا ہے، نظر اُٹھا کر دیکھا تو جبریل علیہ السّلام سامنے تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا: "آپ کی قوم نے جو کچھ آپ کو جواب دیا ہے اللہ نے اسے سُن لیا۔ اب یہ پہاڑ کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپ جو حکم دینا چاہیں اسے دے سکتے ہیں۔" پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپؐ کو سلام کر کے عرض کیا "آپ فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑ ان لوگوں پر اُلٹ دوں۔" آپؐ نے جواب دیا "نہیں، بلکہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسل سے وہ لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کریں گے۔" (بخاری، بدءالخلق، ذکر الملائکہ، مسلم، کتاب المغازی، نسائی، البعوث)

اِس کے بعد آپ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھیر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکہ واپس جاؤں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ انہی ایام میں ایک روز رات کو آپؐ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا اِدھر سے گزر ہوا، انہوں نے قرآن سنا، ایمان لائے، واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ خوش خبری سنائی کہ انسان چاہے آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

موضوع اور مباحث

یہ حالات تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ جو شخص بھی ایک طرف ان حالاتِ نزول کو دیکھے گا اور دوسری طرف اس سورۃ کو بغور پڑھے گا اُسے اس امر میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ فی الواقع یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے بلکہ "اس کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔" اِس لیے کہ اول سے آخر تک پوری سورۃ میں کہیں اُن انسانی جذبات و تاثرات کا ایک ادنیٰ شائبہ تک نہیں پایا جاتا جو اِن حالات سے گزرنے والے انسان کے اندر فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہوتا جنہیں پے درپے صدمات اور مصائب کے بے پناہ ہجوم اور طائف کے تازہ ترین جبر کے زخم خستہ حالی کی انتہا کو پہنچا دیا تھا تو اس سورے میں کہیں تو اُن کیفیات کا عکس نظر آتا ہے جو اُس وقت آپ کے دل پر گزر رہی تھیں۔ اوپر ہم نے حضورؐ کی جو دعا نقل کی ہے اُسے دیکھئے وہ آپ کا اپنا کلام ہے۔ اس کا لفظ لفظ ان کیفیات سے لبریز ہے مگر یہ سورۃ جو اُسی زمانے اور اُنہی حالات میں آپؐ ہی کی زبان سے ادا ہوئی ہے اُن کے ہر اثر سے قطعی خالی ہے۔

سورۃ کا موضوع کفار کو اُن گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے بلکہ بڑے اصرار اور غرور و استکبار کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے اور اُلٹا اس شخص کو ہدفِ ملامت بنا رہے تھے جو اُنہیں ان گمراہیوں سے نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔ ان کے نزدیک دنیا کی حیثیت محض ایک بے مقصد کھلونے کی تھی اور اس کے اندر اپنے آپ کو وہ غیر جواب دہ مخلوق سمجھ رہے تھے۔ توحید کی دعوت ان کے خیال میں باطل تھی اور انہیں اصرار تھا کہ اُن کے معبود واقعی خدا کے شریک ہیں۔ وہ قرآن کے متعلق یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ خداوند عالم کا کلام ہے۔ رسالت کا ایک عجیب جاہلانہ تصور ان کے ذہن میں تھا اور اس کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کو جانچنے کے لیے وہ طرح طرح کے نرالے معیار تجویز کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام کے برحق نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ اُن کے شیوخ اور بڑے بڑے قبائلی سردار اور ان کی قوم کے بُوجھ بجھکڑ اسے نہیں مان رہے ہیں اور صرف چند نوجوان، چند غریب لوگ اور چند غلام ہی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ قیامت اور زندگی بعد موت اور جزا و سزا کی باتوں کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھتے تھے، اور ان کا خیال یہ تھا کہ ان چیزوں کا وقوع خارج اَز اِمکان ہے۔

اس سورۃ میں بالاختصار انہی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مدلل تردید کی گئی ہے

اور کفّار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم اگر عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے تعصّب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو رَد کر دو گے تو آپ اپنا ہی انجام خراب کرو گے۔

مُحَمَّد

نام آیت نمبر ۲ کے فقرے وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور مشہور نام "قِتال" بھی ہے جو آیت نمبر ۲۰ کے فقرے وَذُکِرَ فِیْھَا الْقِتَالُ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضامین یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب جنگ کا حکم دیا جا چکا تھا مگر ابھی جنگ عملاً شروع ہوئی نہ تھی۔ اس کے مفصل دلائل آگے حاشیہ ۸ میں ملیں گے۔

تاریخی پس منظر جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مکہ معظمہ میں خاص طور پر اور عرب کی سرزمین میں بالعموم ہر جگہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر مدینۂ طیبہ کے دارالامان میں جمع ہو گئے تھے مگر کفارِ قریش یہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی ہر طرف سے کفار کے نرغے میں گھری ہوئی تھی اور وہ اسے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اس حالت میں دو ہی چارۂ کار باقی رہ گئے تھے۔ یا تو وہ دینِ حق کی دعوت و تبلیغ ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیروی تک سے دست بردار ہو کر جاہلیت کے آگے سپر ڈال دیں، یا پھر مارنے مرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ہمیشہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ عرب کی سرزمین میں اسلام کو رہنا ہے یا جاہلیت کو۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو اسی عزیمت کی راہ دکھائی جو اہلِ ایمان کے لیے ایک ہی راہ ہے۔ اس نے پہلے سورۂ حج (آیت ۳۹) میں ان کو جنگ کی اجازت دی اور پھر سورہ بقرہ (آیت ۱۹۰) میں اس کا حکم دے دیا۔ مگر اُس وقت ہر شخص جانتا

تھا کہ اِن حالات میں جنگ کے معنی کیا ہیں۔ مدینے میں اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جمعیت تھی جو پورے ایک ہزار مردانِ جنگی بھی فراہم کرنے کے قابل نہ تھی، اور اس سے کہا جا رہا تھا کہ سارے عرب کی جاہلیت سے ٹکرا جانے کے لیے تلوار لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر لڑائی کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی ایک ایسی بستی مشکل ہی سے فراہم کر سکتی تھی جس کے اندر سینکڑوں بے خانماں مہاجر ابھی پوری طرح بسے بھی نہ تھے اور چاروں طرف سے اہلِ عرب نے معاشی مقاطعہ کر کے اُس کی کمر توڑ رکھی تھی۔

موضوع اور مضمون

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل فرمائی گئی۔ اس کا موضوع اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے تیار کرنا اور ان کو اس سلسلہ میں ابتدائی ہدایات دینا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ قتال بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں ترتیب وار حسبِ ذیل مضامین ارشاد ہوئے ہیں۔

آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو گروہوں کے درمیان مقابلہ در پیش ہے۔ ایک گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ حق کو ماننے سے انکار کر چکا ہے اور اللہ کے راستے میں سدِّ راہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے اور دوسرے گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ اس حق کو مان گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا دو ٹوک فیصلہ یہ ہے کہ پہلے گروہ کی تمام سعی و عمل کو اس نے رائیگاں کر دیا، اور دوسرے گروہ کے حالات درست کر دیے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ابتدائی جنگی ہدایات دی گئی ہیں، ان کو اللہ کی مدد اور رہنمائی کا یقین دلایا گیا ہے کہ راہِ حق میں ان کی کوششیں رائیگاں نہ جائیں گی بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک وہ ان کا اچھے سے اچھا پھل پائیں گے۔

پھر کفار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی تائید و رہنمائی سے محروم ہیں۔ ان کی کوئی تدبیر اہلِ ایمان کے مقابلے میں کارگر نہ ہو گی اور وہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہت بُرا انجام دیکھیں گے۔ انہوں نے اللہ کے نبی کو مکہ سے نکال کر یہ سمجھا کہ انہیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ دراصل یہ کام کر کے انہوں نے اپنی تباہی کو خود اپنے اوپر دعوت دے دی۔

اس کے بعد منافقین کی طرف رُوئے سخن پھرتا ہے جو جنگ کا حکم آنے سے پہلے تو بڑے مسلمان بنے پھرتے تھے مگر یہ حکم آجانے کے بعد ان کے ہوش اُڑ گئے تھے اور وہ اپنی عافیت کی فکر میں کفّار سے ساز باز کرنے لگے تھے تاکہ اپنے آپ کو جنگ کے خطرات سے بچائیں۔ ان کو صاف صاف خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کے معاملہ میں منافقت اختیار کرنے والوں کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ یہاں تو بنیادی سوال جس پر تمام مدعیانِ ایمان کی آزمائش ہو رہی ہے یہ ہے کہ آدمی حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ؟ اس کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں یا کفر اور کفار کے ساتھ؟ وہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کو عزیز رکھتا ہے یا اُس حق کو جس پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اس آزمائش میں جو شخص کھوٹا نکلتا ہے وہ مومن ہی نہیں ہے، کجاکہ اس کی نماز اور اس کا روزہ اور اس کی زکوٰۃ خدا کے ہاں کسی اجر کی مستحق ہو۔

پھر مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی اور کفّار کی کثرت اور اُن کے سروسامان کی فراوانی دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، اُن کے آگے صلح کی پیش کش کر کے کمزوری کا اظہار نہ کریں جس سے اُن کی جرأتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اور زیادہ بڑھ جائیں، بلکہ اللہ کے بھروسے پر اُٹھیں اور کفر کے اِس پہاڑ سے ٹکرا جائیں۔ اللہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ وہی غالب رہیں گے اور یہ پہاڑ اُن سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

آخر میں مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ اُس وقت مسلمانوں کی معاشی حالت بہت پتلی تھی مگر سامنے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ عرب میں اسلام اور مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے یا نہیں۔ اِس مسئلے کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے دین کو کفر کے غلبہ سے بچانے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنی جانیں بھی لڑائیں اور جنگی تیاری میں اپنے مالی وسائل بھی پوری امکانی حد تک کھپا دیں۔ اس لیے مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اس وقت جو شخص بھی بُخل سے کام لے گا وہ دراصل اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا بلکہ خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے خطرے میں ڈال لے گا۔ اللہ تو انسانوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے دین کی خاطر قربانیاں دینے سے ایک گروہ اگر جی چُرائے گا تو اللہ اسے ہٹا کر دوسرا گروہ اس کی جگہ لے آئے گا۔

الفتح

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا سے ماخوذ ہے۔ یہ محض اس سورۃ کا نام ہی نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی اس کا عنوان ہے، کیونکہ اس میں اُس فتح عظیم پر کلام کیا گیا ہے جو صلح حُدَیبیہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائی تھی۔

زمانۂ نزول روایات اس پر متفق ہیں کہ اس کا نزول ذی القعدہ سنہ ۶ھ میں اُس وقت ہوا تھا جب آپ کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی طرف واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

تاریخی پس منظر جن واقعات کے سلسلہ میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا فرمایا ہے۔ پیغمبرؐ کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب وخیال نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ اور آگے چل کر آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے خود توثیق کر دی ہے کہ یہ خواب ہم نے اپنے رسول کو دکھایا تھا۔ اس لیے درحقیقت یہ نرا خواب نہ تھا بلکہ ایک الٰہی اشارہ تھا جس کی پیروی کرنا حضورؐ کے لیے ضروری تھا۔

بظاہرِ اسباب اس ہدایت پر عمل کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کفارِ قریش نے چھ سال سے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور اس پوری مدت میں کسی مسلمان کو انہوں نے حج اور عُمرے تک کے لیے حدودِ حرم کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ اب آخر یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کی ایک جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔

عمرے کا احرام باندھ کر جنگی سازوسامان ساتھ لیے ہوئے نکلنا گویا خود لڑائی کو دعوت دینا تھا، اور غیر مسلح جانے کے معنی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کے تھے۔ ان حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس اشارے پر عمل کیا جائے تو کیسے۔

مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اُس کا رب جو حکم بھی اس کو دے وہ بے کھٹکے اس پر عمل کر گزرے۔ اِس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بِلا تامّل اپنا خواب صحابۂ کرام کو سنا کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آس پاس کے قبائل میں بھی آپؐ نے اعلانِ عام کرا دیا کہ ہم عمرے کے لیے جا رہے ہیں، جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آجائے۔ جن لوگوں کی نگاہ ظاہری اسباب پر تھی انہوں نے سمجھا کہ یہ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی آپؐ کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا، مگر جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچا ایمان رکھتے تھے انہیں اس اَمر کی کوئی پَروا نہ تھی کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے لیے بس یہ کافی تھا کہ اللہ کا اشارہ ہے اور اس کا رسولؐ تعمیلِ حکم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز ان کو رسولِ خدا کا ساتھ دینے سے نہ روک سکتی تھی۔ چودہ سَو صحابی حضورؐ کی معیت میں اس خطرناک سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ذی القعدہ ۶ھ کے آغاز میں یہ مبارک قافلہ عمرے کے لیے مدینے سے روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ[1] پہنچ کر سب نے عمرے کا اِحرام باندھا۔ قربانی کے لیے ستّر اُونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں ہَدْی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ پرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار رکھ لی جس کی تمام زائرینِ حرم کو عرب کے معروف قاعدے کے مطابق اجازت تھی، اور اس کے سوا کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا۔ اس طرح یہ قافلہ لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی طرف چل پڑا۔

اُس وقت مکّہ اور مدینے کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، عرب کا بچّہ بچّہ اس کو جانتا تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو شوّال ۵ھ میں قریش نے قبائلِ عرب کی متحدہ طاقت کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی تھی اور غزوۂ احزاب کا مشہور معرکہ پیش آچکا تھا۔ اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے بڑے

---

[1] یہ مقام مدینے سے مکّے کی جانب تقریباً ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اب اسے بئرِ علی کہتے ہیں اور مدینے کے حاجی اسی مقام سے حج اور عُمرے کا احرام باندھتے ہیں۔

قافلے کے ساتھ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو پورے عرب کی نگاہیں اِس عجیب سفر کی طرف مرکوز ہوگئیں اور لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ قافلہ لڑنے کے لیے نہیں جا رہا ہے بلکہ ماہِ حرام میں، اِحرام باندھ کر، ھَدْی کے اُونٹ ساتھ لیے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرنے جا رہا ہے اور قطعی طور پر غیر مُسلّح ہے۔

قریش کے لوگوں کو حضورؐ کے اس اقدام نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ ذی القعدہ کا مہینہ اُن حرام مہینوں میں سے تھا جو صدہا برس سے عرب میں حج و زیارت کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اِس مہینے میں جو قافلہ اِحرام باندھ کر حج یا عمرے کے لیے جا رہا ہو اسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا حتیٰ کہ کسی قبیلے سے اُس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مسلّمہ قوانین کی رُو سے وہ اپنے علاقے سے اس کے گزرنے میں مانع نہ ہو سکتا تھا۔ قریش کے لوگ اس اُلجھن میں پڑ گئے کہ اگر ہم مدینے کے اس قافلے پر حملہ کر کے اسے مکّہ معظّمہ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو پورے ملک میں اس پر شور مچ جائے گا۔ عرب کا ہر شخص پکار اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمام قبائلِ عرب یہ سمجھیں گے کہ ہم خانۂ کعبہ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ہر قبیلہ اس تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ آئندہ کسی کو حج اور عمرہ کرنے دینا یا نہ کرنے دینا اب ہماری مرضی پر موقوف ہے جس سے ہم ناراض ہوں گے اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے سے اسی طرح روک دیں گے، جس طرح آج مدینے کے ان زائرین کو روک رہے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہو گی جس سے سارا عرب ہم سے منحرف ہو جائے گا لیکن اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ بخیریت اپنے شہر میں داخل ہو جانے دیتے ہیں تو پورے ملک میں ہماری ہَوا اُکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ ہم محمدؐ سے مرعوب ہو گئے۔ آخر کار بڑی کشمکش و پیچ کے بعد اُن کی جاہلانہ حمیّت ہی اُن پر غالب آ کر رہی اور انہوں نے اپنی ناک کی خاطر یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی اس قافلے کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی کَعب کے ایک شخص کو مُخبِر کی حیثیت سے آگے بھیج رکھا تھا تاکہ وہ قریش کے ارادوں اور ان کی نقل و حرکت سے آپ کو بروقت مطلع کرتا رہے۔ جب آپ عُسفان[1] پہنچے تو اُس نے آکر اطلاع دی کہ قریش کے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ذی طُوٰی[2] کے

---

[1] یہ مقام مدینے سے مکّہ کے راستے پر، مکّہ سے تقریباً دو دن کی مسافت پر واقع ہے (یعنی اونٹ کی سواری پر یہاں سے مکہ پہنچنے میں دو دن لگتے ہیں۔ [2] مکّہ سے باہر عسفان کے راستے پر ایک مقام۔

مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خالد بن ولید کو انہوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کُراعُ الغمیم[1] کی طرف آگے بھیج دیا ہے تاکہ وہ آپ کا راستہ روکیں۔ قریش کی چال یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُن کو اشتعال دِلائیں، اور پھر اگر لڑائی ہو جائے تو پورے ملک میں یہ مشہور کر دیں کہ یہ لوگ دراصل آئے تھے لڑنے کے لیے مگر بہانہ انہوں نے عمرے کا کیا تھا اور احرام محض دھوکا دینے کے لیے باندھ رکھا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع پاتے ہی فوراً راستہ بدل دیا، اور ایک نہایت دُشوار گزار راستہ سے سخت مُشقت اُٹھا کر حُدیبیہ[2] کے مقام پر پہنچ گئے، جو عین حرم کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں بنی خُزاعہ کا سردار بُدیل بن وَرقاء اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے صرف بیت اللہ کی زیارت اور طواف ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہی بات ان لوگوں نے جا کر قریش کے سرداروں کو بتا دی اور اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اِن زائرینِ حرم کا راستہ نہ روکیں مگر وہ اپنی ضد پر اَڑے رہے اور انہوں نے اَحابیش[3] کے سردار حُلَیس بن عَلقَمہ کو آپؐ کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپؐ کو واپس جانے پر آمادہ کرے۔ سردارانِ قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمد صلی اللہ وسلم اُس کی بات نہ مانیں گے تو وہ اُن سے ناراض ہو کر پلٹے گا اور پھر اَحابیش کی پوری طاقت ہمارے ساتھ ہو گی۔ مگر جب اس نے آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام بند ہے، ھَدی کے اونٹ سامنے کھڑے ہیں جن کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے ہیں اور یہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ حضورؐ سے کوئی بات کیے بغیر مکّہ کی طرف پلٹ گیا اور اس نے جا کر قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ بیت اللہ کی عظمت مان کر اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں اگر تم ان کو روکو گے تو اَحابیش اس کام میں تمہارا ساتھ ہرگز

---

[1] عُسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر، مکّہ کی جانب۔

[2] یہ مقام جدہ سے مکّہ جانے والی سڑک پر ٹھیک اُس جگہ واقع ہے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتی ہیں۔ اب اسے شُمَیسی کہتے ہیں۔ مکّہ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۳ میل ہے۔

[3] یہ اطرافِ مکّہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا جس سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے۔

نہ دیں گے۔ ہم تمہارے حلیف اس لیے نہیں بنے ہیں کہ تم حرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس میں تمہاری حمایت کریں۔

پھر قریش کی طرف سے عُروہ بن مسعود ثقفی آیا اور اس نے اپنے نزدیک بڑی اُونچ نیچ سمجھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ مکہ میں داخل ہونے کے ارادے سے باز آجائیں مگر آپؐ نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بنی خزاعہ کے سردار کو دیا تھا کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے ہیں بلکہ بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے بن کر ایک دینی فریضہ بجالانے کے لیے آئے ہیں۔ واپس جاکر عُروہ نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں مگر خدا کی قسم میں نے اصحابِ محمد کو جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فدائی دیکھا ہے، ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مَل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمہارا مقابلہ کس سے ہے۔

اس دَوران میں جبکہ ایلچیوں کی آمد و رفت اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ جاری تھا، قریش کے لوگ بار بار یہ کوشش کرتے رہے کہ چپکے سے حضورؐ کے کیمپ پر چھاپے مار کر صحابہ کو اشتعال دلائیں اور کسی نہ کسی طرح اُن سے ایسا اقدام کرالیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے، مگر ہر مرتبہ صحابہؓ کے صبر و ضبط اور حضورؐ کی حکمت و فراست نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام کر دیا۔ ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ صحابہؓ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپؐ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تنعیم[1] کی طرف سے ۸۰ آدمی عین نمازِ فجر کے وقت آئے اور انہوں نے اچانک چھاپہ مار دیا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے مگر حضورؐ نے انہیں بھی رہا کر دیا۔ اس طرح قریش کو اپنی ہر چال اور ہر تدبیر میں ناکامی ہوتی چلی گئی۔

آخر کار حضورؐ نے خود اپنی طرف سے عثمان رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مکہ بھیجا اور ان کے ذریعہ سے سردارانِ قریش کو یہ پیغام دیا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کے لیے ہدی ساتھ لے کر آئے ہیں طواف

---

[1] یہ مکّہ کے قریب حدودِ حرم سے باہر ایک مقام ہے۔ مکّہ کے لوگ بالعموم عمرہ کرنے کی خاطر اسی مقام پر جاکر احرام باندھتے ہیں اور پھر واپس آکر عمرہ ادا کرتے ہیں۔

اور قربانی کر کے واپس چلے جائیں گے مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکہ ہی میں روک لیا۔ اسی دوران میں یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں اور ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر سچی ہے۔ اب مزید تحمل کا کوئی موقع نہ تھا۔ مکہ میں داخلہ کی بات تو دوسری تھی، اس کے لیے طاقت کا استعمال ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ مگر جب نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ گئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس بات پر بیعت لی کہ اب یہاں سے ہم مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موقع کی نزاکت نگاہ میں ہو تو آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مسلمان صرف ۱۴ سو تھے، اور کسی سامانِ جنگ کے بغیر آئے تھے۔ اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دور، عین مکہ کی سرحد پر ٹھیرے ہوئے تھے جہاں دشمن اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور گرد و پیش سے اپنے حامی قبیلوں کو لا کر بھی انہیں گھیرے میں لے سکتا تھا۔ اس کے باوجود ایک شخص کے سوا پورا قافلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مرنے مارنے کی بیعت کرنے کے لیے بلا تأمل آمادہ ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے اخلاصِ ایمانی اور راہِ خدا میں ان کی فدائیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ یہی وہ بیعت ہے جو بیعتِ رضوان کے نام سے تاریخ اسلام میں مشہور ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر غلط تھی۔ حضرت عثمانؓ خود بھی واپس آ گئے اور قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے آیا۔ حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اب قریش اپنی اس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ حضورؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سرے سے مکہ میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپؐ اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آپ عمرے کے لیے آ سکتے ہیں۔ طویل گفت و شنید کے بعد جن پر صلح نامہ لکھا گیا وہ یہ تھیں :-

(۱) دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا علانیہ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

(۲) اس دوران میں قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا اسے واپس کر دیں گے، اور آپؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا

اسے وہ واپس نہ کریں گے۔

(۳) قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اس کا اختیار ہوگا۔

(۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال واپس جائیں گے اور آئندہ سال وہ عمرے کے لیے آکر تین دن مکّہ میں ٹھیر سکتے ہیں، بشرطیکہ پر تلوں میں صرف ایک ایک تلوار لے کر آئیں اور کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔ ان تین دِنوں میں اہلِ مکّہ اُن کے لیے شہر خالی کر دیں گے (تاکہ کسی تصادم کی نوبت نہ آئے) مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جس وقت اس معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں، مسلمانوں کا پورا لشکر سخت مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مصلحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنہیں نگاہ میں رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ کسی کی نظر اتنی دُور رَس نہ تھی کہ اس صلح کے نتیجے میں جو خیرِ عظیم رونما ہونے والی تھی اُسے دیکھ سکے۔ کفارِ قریش اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے اور مسلمان اس پر بے تاب تھے کہ ہم آخر دب کر یہ ذلیل شرائط کیوں قبول کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبّر تک کا یہ حال تھا کہ وہ کہتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ نہ پائی تھی مگر اس موقع پر مَیں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بے چین ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا "کیا حضورؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر آخر ہم اپنے دین کے معاملے میں یہ ذلّت کیوں اختیار کریں؟" انہوں نے جواب دیا۔ "اے عمرؓ، وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔" پھر اُن سے صبر نہ ہوا۔ جا کر یہی سوالات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیے اور حضورؐ نے بھی ان کو ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ مدتوں اس پر نوافل اور صدقات ادا کرتے رہے تاکہ اللہ تعالیٰ اُس گستاخی کو معاف فرما دے جو اس روز اُن سے شانِ رسالت میں ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ دو باتیں اس معاہدے میں لوگوں کو بُری طرح کھَل رہی تھیں۔ ایک، شرط نمبر ۲، جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ یہ صریح نامساوی شرط ہے۔ اگر مکّہ سے بھاگ کر آنے والوں کو ہم واپس کریں تو مدینے سے بھاگ کر جانے والے کو وہ کیوں نہ واپس کریں۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا جو ہمارے ہاں سے بھاگ کر اُن کے پاس چلا جائے وہ آخر ہمارے کس کام کا ہے؟ اللہ اسے ہم سے دُور ہی رکھے۔

اور جو اُن کے ہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آجائے اسے اگر ہم واپس کر دیں گے تو اللہ اس کے لیے خلاصی کی کوئی اور صورت پیدا فرما دے گا۔ دوسری چیز جو لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی وہ چوتھی شرط تھی۔ مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ماننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمام عرب کے سامنے گویا ہم ناکام واپس جا رہے ہیں۔ مزید براں یہ سوال بھی دلوں میں خلش پیدا کر رہا تھا کہ حضورؐ نے تو خواب میں یہ دیکھا تھا کہ ہم مکہ میں طواف کر رہے ہیں، مگر یہاں تو ہم طواف کیے بغیر واپس جاتے کی شرط مان رہے ہیں۔ حضورؐ نے اس پر لوگوں کو سمجھایا کہ خواب میں آخر اسی سال طواف کرنے کی صراحت تو نہ تھی۔ شرائط صلح کے مطابق اس سال نہیں تو اگلے سال ان شاء اللہ طواف ہوگا۔

جلتی پر تیل کا کام جس واقعہ نے کیا وہ یہ تھا کہ عین اس وقت جب صلح کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سُہیل بن عمرو کے اپنے صاحبزادے ابو جندل جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفارِ مکہ نے ان کو قید کر رکھا تھا، کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے فریاد کی کہ مجھے اس جِلسِ بے جا سے نجات دلائی جائے۔ صحابہ کرامؓ کے لیے یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا، مگر سُہیل بن عمرو نے کہا کہ صلح نامے کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی ہو، شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں، اِس لیے اس لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حجت تسلیم فرمائی اور ابو جندل ظالموں کے حوالے کر دیئے گئے۔

صلح سے فارغ ہو کر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اب یہیں قربانی کر کے سر منڈواؤ اور احرام ختم کر دو، مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حضورؐ نے تین مرتبہ حکم دیا، مگر صحابہؓ پر اس وقت رنج و غم اور دل شکستگی کا ایسا شدید غلبہ تھا کہ انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی۔ حضورؐ کے پورے دورِ رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہ آئی کہ آپؐ صحابہؓ کو حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ نہ پڑیں۔ آپؐ کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے اپنے خیمے میں جا کر اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ سے اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ بس خاموشی کے ساتھ تشریف لے جا کر اپنا اونٹ ذبح فرمائیں اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیں۔ اس کے بعد لوگ خود بخود آپؐ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپؐ کے فعل کو دیکھ کر لوگوں نے بھی قربانیاں کر لیں، سر منڈوا لیے یا بال ترشوا لیے اور احرام سے نکل آئے، مگر دل اُن کے غم سے کٹے

جا رہے تھے۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ حُدَیبیہ کی صلح کو اپنی شکست اور ذلّت سمجھتا ہوا مدینہ کی طرف واپس جا رہا تھا، اُس وقت ضَجنَان[1] کے مقام پر (یا بقولِ بعض کُراعُ الغَمِیم کے مقام پر) یہ سورۃ نازل ہوئی۔ جس نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ یہ صلح جس کو وہ شکست سمجھ رہے ہیں دراصل فتحِ عظیم ہے۔ اس کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر یہ سورۃ آپؐ نے تلاوت فرمائی اور خاص طور پر حضرت عُمرؓ کو بلا کر اسے سنایا، کیونکہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ تھے۔

اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے مگر کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کھُلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی۔

۱۔ اس میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت محض قریش اور قبائلِ عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ ان کو برادری باہر (OUTLAW) سمجھتے تھے۔ اب خود قریش ہی نے آپ سے معاہدہ کر کے سلطنتِ اسلامی کے مقبوضات پر آپ کا اقتدار مان لیا اور قبائلِ عرب کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ اِن دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدات کر لیں۔

۲۔ مسلمانوں کے لیے زیارتِ بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے آپ سے آپ گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آ رہے تھے بلکہ عرب کے مسلّمہ ادیان میں سے ایک ہے اور دوسرے عربوں کی طرح اس کے پیرو بھی حج و عمرہ کے مناسک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اہلِ عرب کے دِلوں کی وہ نفرت کم ہو گئی جو قریش کے پروپیگنڈا سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

---

[1] مکہ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

۴۔ دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسّر آ گیا اور انہوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پورے اُنیس سال میں اتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے اس کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔ یہ اسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ صرف ۱۴ سو آدمی آئے تھے، یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپ کے ہم رکاب تھا۔

قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجراء سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدن بنا دیں۔ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیت ۳ میں فرمایا کہ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، دیباچہ سورۂ مائدہ۔ اور حاشیہ ۱۵)

۵۔ قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمالِ عرب اور وسطِ عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔ صلح حدیبیہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہو گیا اور اس کے بعد فدک، وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیرِ نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسطِ عرب کے وہ تمام قبیلے بھی جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس طرح حدیبیہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو صلح سے حاصل ہوئیں جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ جو چیز اس صلح میں مسلمانوں کو ناگوار ہوئی تھی اور جسے قریش نے اپنی جیت سمجھا تھا وہ یہ تھی کہ مکہ سے بھاگ کر جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا، مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر اُلٹا پڑا

اور تجربہ نے بتا دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُور رَس نے اس کے کِن نتائج کو دیکھ کر یہ شرط قبول کی تھی۔ صلح کے کچھ دن بعد مکہ سے ایک مسلمان ابو بصیر قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور حضورؐ نے معاہدے کے مطابق انہیں اُن لوگوں کے حوالے کر دیا جو اُن کی گرفتاری کے لیے مکّہ سے بھیجے گئے تھے مگر مکہ جاتے ہوئے وہ پھر اُن کی گرفت سے بچ نکلے اور ساحل بحرِ احمر کے اُس راستے پر جا بیٹھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس کے بعد جس مسلمان کو بھی قریش کی قید سے بھاگ نکلنے کا موقع ملتا وہ مدینہ جانے کے بجائے ابو بصیر کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔ یہاں تک کہ ستّر آدمی وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مار مار کر ان کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ آخر کار قریش نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں اور حُدیبیہ کے معاہدے کی وہ شرط آپ سے آپ ساقط ہو گئی۔

یہ تاریخی پس منظر نگاہ میں رکھ کر اِس سورہ کو پڑھا جائے تو اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

الحُجُرات

نام

آیت ۴ کے فقرہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ سُورۃ جس میں لفظ الحجرات آیا ہے۔

زمانۂ نزول

یہ بات روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے اور سورۃ کے مضامین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ سورۃ مختلف مواقع پر نازل شدہ احکام و ہدایات کا مجموعہ ہے جنہیں مضمون کی مناسبت سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر احکام مدینہ طیبہ کے آخری دَور میں نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً آیت ۴ کے متعلق مفسّرین کا بیان ہے کہ یہ بنی تَمِیم کے بارے میں نازل ہوئی تھی جن کے وفد نے آکر ازواجِ مطہرات کے حجروں کے باہر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا شروع کر دیا تھا اور تمام کتب سیرت میں اس وفد کی آمد کا زمانہ ۹ھ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ۶ کے متعلق حدیث کی بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا، اور یہ بات معلوم ہے کہ ولید بن عقبہ فتح مکّہ کے موقع پر مسلمان ہوئے ہیں۔

موضوع اور مُباحث

اِس سورۃ کا موضوع مسلمانوں کو اُن آداب کی تعلیم دینا ہے جو اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہیں۔

ابتدائی پانچ آیتوں میں اُن کو وہ ادب سِکھایا گیا ہے جو اُنہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے معاملے میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

پھر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ہر خبر پر یقین کر لینا اور اس پر کوئی کارروائی کر گزرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی اطلاع ملے تو غور سے دیکھنا چاہیے کہ خبر ملنے کا ذریعہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ قابلِ اعتماد نہ ہو تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے تحقیق کر لینا چاہیے کہ خبر

صحیح ہے یا نہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ کسی وقت مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

پھر مسلمانوں کو اُن بُرائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا مذاق اُڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، ایک دوسرے کے بُرے نام رکھنا، بدگمانیاں کرنا، دوسروں کے حالات کی کھوج کرنا، لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی بُرائیاں کرنا، یہ وہ افعال ہیں جو بجائے خود بھی گناہ ہیں اور معاشرے میں بگاڑ بھی پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نام بنام ان کا ذکر فرما کر انہیں حرام قرار دے دیا ہے۔

اس کے بعد اُن قومی اور نسلی امتیازات پر ضرب لگائی گئی ہے جو دنیا میں عالمگیر فساد کے موجب ہوتے ہیں۔ قوموں اور قبیلوں اور خاندانوں کا اپنے شرف پر فخر و غرور اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنا، اور اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے دوسروں کو گرانا، اُن اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت دنیا ظلم سے بھر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر سی آیت میں یہ فرما کر اس بُرائی کی جڑ کاٹ دی ہے کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے ہیں اور قوموں اور قبیلوں میں اُن کا تقسیم ہونا تعارف کے لیے ہے نہ کہ تفاخر کے لیے، اور ایک انسان پر دوسرے انسان کی فوقیت کے لیے اخلاقی فضیلت کے سوا اور کوئی جائز بنیاد نہیں ہے۔

آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اصل چیز ایمان کا زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ کو ماننا، عملاً فرماں بردار بن کر رہنا اور خلوص کے ساتھ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کھپا دینا ہے۔ حقیقی مومن وہی ہیں جو یہ روش اختیار کریں۔ رہے وہ لوگ جو دل کی تصدیق کے بغیر محض زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور پھر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا اسلام قبول کر کے انہوں نے کوئی احسان کیا ہے، تو دنیا میں ان کا شمار مسلمانوں میں ہو سکتا ہے، معاشرے میں ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اللہ کے ہاں وہ مومن قرار نہیں پا سکتے۔

ق

نام آغاز ہی کے حرف قٓ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کا افتتاح حرفِ قٓ سے ہوتا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ٹھیک کس زمانہ میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکّہ معظمہ کا دُوسرا دَور ہے جو نبوّت کے تیسرے سال سے شروع ہو کر پانچویں سال تک رہا۔ اس دَور کی خصوصیات ہم سُورۂ انعام کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔ اُن خصوصیات کے لحاظ سے اندازاً یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ سُورۃ پانچویں سال میں نازل ہوئی جبکہ کفّار کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی مگر ابھی ظلم و ستم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

موضوع اور مباحث معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عیدین کی نمازوں میں اس سورۃ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ایک خاتون امِ ہشام بن حارثہ، جو حضور کی پڑوسن تھیں بیان کرتی ہیں کہ مجھے سورۂ ق یاد ہی اس طرح ہوئی کہ میں جمعہ کے خطبوں میں اکثر آپؐ کی زبان مبارک سے اس کو سنتی تھی۔ بعض اور روایات میں آیا ہے کہ فجر کی نماز میں بھی آپ بکثرت اس کو پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ کی نگاہ میں یہ ایک بڑی اہم سورت تھی، اِس لیے آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بار بار اس کے مضامین پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔

اس اہمیت کی وجہ سورۃ کو بغور پڑھنے سے باٰسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ پوری سورۃ کا موضوع آخرت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ معظمہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا آپؐ کی جس بات پر ہوا وہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے، اور ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ تو بالکل انہونی بات ہے۔ عقل باور

نہیں کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارا ذرّہ ذرّہ زمین میں منتشر ہو چکا ہو تو ان پراگندہ اجزاء کو ہزارہا برس گزرنے کے بعد پھر سے اکٹھا کر کے ہمارا یہی جسم از سرِ نو بنا دیا جائے اور ہم زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تقریر نازل ہوئی۔ اس میں بڑے مختصر طریقے سے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک طرف آخرت کے امکان اور اس کے وقوع پر دلائل دیے گئے ہیں، اور دوسری طرف لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم خواہ تعجب کرو، یا بعید از عقل سمجھو، یا جھٹلاؤ، بہر حال اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت، اٹل حقیقت یہ ہے کہ تمہارے جسم کا ایک ایک ذرّہ جو زمین میں منتشر ہوتا ہے، اس کے متعلق اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس حال میں کس جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ اس کے لیے کافی ہے کہ یہ تمام منتشر ذرّات پھر جمع ہو جائیں اور تم کو اسی طرح دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے جیسے پہلے بنایا گیا تھا۔ اِس طرح تمہارا یہ خیال کہ تم یہاں شترِ بے مہار بنا کر چھوڑ دیے گئے ہو اور کسی کے سامنے تمہیں جواب دہی نہیں کرنی ہے ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست خود بھی تمہارے قول و فعل سے بلکہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے اور اس کے فرشتے بھی تم میں سے ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے تمام حرکات و سکنات کا ریکارڈ محفوظ کر رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو ایک پکار پر تم بالکل اُسی طرح نکل کھڑے ہو گے جس طرح بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی زمین سے نباتات کی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اُس وقت یہ غفلت کا پردہ جو آج تمہاری عقل پر پڑا ہوا ہے، تمہارے سامنے سے ہٹ جائے گا، اور تم اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لو گے جس کا آج انکار کر رہے ہو۔ اُس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں تھے بلکہ ذمہ دار اور جواب دہ تھے۔ جزا و سزا، عذاب و ثواب اور جنّت و دوزخ، جنہیں آج فسانۂ عجائب سمجھ رہے ہو، اُس وقت یہ ساری چیزیں تمہاری مشہود حقیقتیں ہوں گی۔ حق سے عناد کی پاداش میں اُسی جہنم کے اندر پھینکے جاؤ گے جسے آج عقل سے بعید سمجھتے ہو، اور خدائے رحمان سے ڈر کر راہِ راست کی طرف پلٹ آنے والے تمہاری آنکھوں کے سامنے اُسی جنّت میں جائیں گے جس کا ذکر سن کر آج تمہیں تعجب ہو رہا ہے۔

الذّٰرِیٰت

نام پہلے ہی لفظ وَالذّٰرِیَات سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کی ابتدا لفظ الذاریات سے ہوتی ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور اندازِ بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانہ میں نازل ہوئی ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ تکذیب و استہزاء اور جھوٹے الزامات سے تو بڑے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا، مگر ابھی ظلم و تشدد کی چکی چلنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی اُسی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے جس میں سورۂ ق نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مُباحث اس کا بڑا حصہ آخرت کے موضوع پر ہے اور آخر میں توحید کی دعوت پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی بات نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ تصورات پر اصرار کرنا خود انہی قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ جنہوں نے یہ روش اختیار کی ہے۔

آخرت کے متعلق جو بات اس سورہ کے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت پرمعنی فقروں میں بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مآل و انجام کے بارے میں لوگوں کے مختلف اور متضاد عقیدے خود اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے قیاسات دوڑا کر اپنی جگہ جو نظریہ قائم کر لیا اُسی کو وہ اپنا عقیدہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے سمجھا کہ زندگی بعدِ موت نہیں ہو گی، کسی نے اس کو مانا تو تناسخ کی شکل میں مانا، کسی نے حیاتِ اُخروی اور جزا و سزا کو تسلیم کیا تو جزائے اعمال سے بچنے کے لیے طرح طرح کے سہارے تجویز کر لیے۔ اتنے بڑے اور اہم ترین بنیادی مسئلے پر جس کے بارے میں آدمی کی رائے کا غلط ہو جانا اس کی پوری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتا ہے۔

اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے مستقبل کو برباد کر ڈالتا ہے۔ علم کے بغیر محض قیاسات کی بنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا ایک تباہ کن حماقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہ کر ساری عمر جاہلانہ غفلت میں گزار دے اور مرنے کے بعد اچانک ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جس کے لیے اُس نے قطعاً کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ایسے مسئلے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو آخرت کے متعلق جو علم خدا کی طرف سے اس کا نبی دے رہا ہے اس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور زمین و آسمان کے نظام اور خود اپنے وجود پر نگاہ ڈال کر کھلی آنکھوں سے دیکھے کہ کیا اُس کے صحیح ہونے کی شہادت ہر طرف موجود نہیں ہے؟ اس سلسلے میں ہوا اور بارش کے انتظام کو، زمین کی ساخت اور اُس کی مخلوقات کو، انسان کے اپنے نفس کو، آسمان کی تخلیق کو، اور دنیا کی تمام اشیاء کے جوڑوں کی شکل میں بنائے جانے کو آخرت کی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور انسانی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح قانونِ مکافات کا مقتضی نظر آ رہا ہے۔

اس کے بعد بڑے مختصر انداز میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے خالق نے تم کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ تمہارے بناوٹی معبودوں کی طرح نہیں ہے جو تم سے رزق لیتے ہیں اور تمہاری مدد کے بغیر جن کی خدائی نہیں چل سکتی۔ وہ ایسا معبود ہے جو سب کا رزّاق ہے، کسی سے رزق لینے کا محتاج نہیں، اور جس کی خدائی خود اُس کے اپنے بل بوتے پر چل رہی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کا مقابلہ جب بھی کیا گیا ہے کسی معقول بنیاد پر نہیں بلکہ اُسی ضد اور ہٹ دھرمی اور جاہلانہ غرور کی بنیاد پر کیا گیا ہے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی جا رہی ہے اور اس کی محرک بجز سرکشی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان سرکشوں کی طرف التفات نہ کریں اور اپنی دعوت و تذکیر کا کام کیے جائیں، کیونکہ وہ ان لوگوں کے لیے چاہے نافع نہ ہو، مگر ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔ رہے وہ ظالم جو اپنی سرکشی پر مصر رہیں تو ان سے پہلے اسی روش پر چلنے والے اپنے حصے کا عذاب پا چکے ہیں اور ان کے حصے کا عذاب تیار ہے۔

الطُّور

نام

پہلے ہی لفظ وَالطُّوْرِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

مضامین کی اندرونی شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی مکۂ معظمہ کے اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ ذاریات نازل ہوئی تھی۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ تو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعتراضات اور الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، مگر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ظلم وستم کی چکی زور شور سے چلنی شروع ہو گئی تھی۔

موضوع اور مباحث

اس کے پہلے رکوع کا موضوع آخرت ہے۔ سورۂ ذاریات میں اس کے امکان اور وجوب اور وقوع کے دلائل دیئے جا چکے تھے۔ اس لیے یہاں اُن کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے، البتہ آخرت کی شہادت دینے والے چند حقائق و آثار کی قسم کھا کر پورے زور کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی اور کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے برپا ہونے سے روک دے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آئے گی تو اس کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوگا اور اسے مان کر تقویٰ کی روش اختیار کر لینے والے کس طرح اللہ کے انعامات سے سرفراز ہوں گے۔

اس کے بعد دوسرے رکوع میں سردارانِ قریش کے اُس رویّے پر تنقید کی گئی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ آپؐ کو کبھی کاہن، کبھی مجنون اور کبھی شاعر قرار دیتے مگر عوام الناس کو آپؐ کے خلاف بہکاتے تھے، تاکہ لوگ آپ کے لائے ہوئے پیغام کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ کریں۔ وہ آپؐ کی ذات کو اپنے حق میں ایک بلائے ناگہانی

سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ کوئی آفت ان پر نازل ہو جائے تو ہمارا ان سے پیچھا چھوٹے۔ وہ آپؐ پر الزام لگاتے تھے کہ یہ قرآن آپ تو دگھڑ گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کر رہے ہیں اور یہ معاذ اللہ ایک فریب ہے جو آپؐ نے بنا رکھا ہے۔ وہ بار بار طنز کرتے تھے کہ خدا کو نبوّت کے لیے ملے بھی تو بس یہ صاحب ملے۔ وہ آپؐ کی دعوت و تبلیغ سے ایسی بیزاری کا اظہار کرتے تھے جیسے آپ کچھ مانگنے کے لیے اُن کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے آپؐ سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ وہ آپس میں بیٹھ بیٹھ کر سوچتے تھے کہ آپؐ کے خلاف کیا چال ایسی چلی جائے جس سے آپؐ کی دعوت کا خاتمہ ہو جائے اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے انہیں اس امر کا کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کیسے جاہلانہ عقائد میں مبتلا ہیں جن کی تاریکی سے لوگوں کو نکالنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم بالکل بے غرضانہ اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی رویّے پر تنقید کرتے ہوئے پے در پے کچھ سوالات کیے ہیں جن میں سے ہر سوال یا تو اُن کے کسی اعتراض کا جواب ہے یا اُن کی کسی جہالت پر تبصرہ۔ پھر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو آپ کی نبوّت کا قائل کرنے کے لیے کوئی معجزہ دکھانا قطعی لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایسے ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ انہیں خواہ کچھ بھی دکھا دیا جائے، یہ اُس کی کوئی تاویل کر کے ایمان لانے سے گُریز کر جائیں گے۔

اِس رکوع کے آغاز میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان مخالفین و معاندین کے الزامات و اعتراضات کی پروا کیے بغیر اپنی دعوت و تذکیر کا کام مسلسل جاری رکھیں اور آخر میں بھی آپ کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ صبر کے ساتھ ان مصیبتوں کا مقابلہ کیے چلے جائیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔ اِس کے ساتھ آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں اُٹھا کر اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ وہ برابر آپ کی نگہبانی کر رہا ہے۔ جب تک اُس کے فیصلے کی گھڑی آئے، آپ سب کچھ برداشت کرتے رہیں اور اپنے رب کی حمد و تسبیح سے وہ قوّت حاصل کرتے رہیں جو ایسے حالات میں اللہ کا کام کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

—— * ——

النَّجم

نام پہلے ہی لفظ وَالنَّجم سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی مضمون کے لحاظ سے سورۃ کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض علامت کے طور پر اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ اَوَّلُ سُورَۃٍ اُنْزِلَتْ فِیْھَا سَجْدَۃٌ النَّجْمُ (پہلی سورۃ جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی النجم ہے) اس حدیث کے جو اجزا اسود بن یزید، ابو اسحاق اور زُہیر بن معاویہ کی روایات میں حضرت ابن مسعود سے منقول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سورۃ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ایک مجمع عام میں (اور ابن مردُویہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سنایا تھا۔ مجمع میں کافر اور مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک جو مخالفت میں پیش پیش تھے سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیہ بن خلف کو دیکھا کہ اس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اُٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا کہ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ کفر کی حالت میں قتل ہوا۔

اس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مُطّلِب بن ابی وَداعہ ہیں جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نسائی اور مسند احمد میں ان کا اپنا بیان یہ نقل ہوا ہے کہ جب حضورؐ نے سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ فرمایا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا، اور اسی کی تلافی اب میں اس طرح کرتا ہوں کہ اس سورے کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے رجب ۵ ؁ نبوی میں صحابہؓ کرام کی ایک مختصر سی جماعت حبش کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ پھر جب اُسی سال رمضان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مجمع عام میں سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی اور کافر و مومن سب آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو حبش کے مہاجرین تک یہ قصہ اس شکل میں پہنچا کہ کفارِ مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس خبر کو سُن کر ان میں سے کچھ لوگ شوال ۵ ؁ نبوی میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ ظلم کی چکی اسی طرح چل رہی ہے جس طرح پہلے چل رہی تھی۔ آخر کار دوسری ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی جس میں پہلی ہجرت سے بھی زیادہ لوگ مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح یہ بات قریب قریب یقینی طور معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ رمضان ۵ ؁ نبوی میں نازل ہوئی ہے۔

تاریخی پس منظر

زمانۂ نزول کی اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ ابتدائے بعثت کے بعد سے پانچ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نجی صحبتوں اور مخصوص مجلسوں ہی میں اللہ کا کلام سنا سنا کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ اس پوری مدت میں آپ کو کبھی کسی مجمعِ عام میں قرآن سنانے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ کیونکہ کفار کی سخت مزاحمت اس میں مانع تھی۔ اُن کو اس امر کا خوب اندازہ تھا کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی تبلیغ میں کس بلا کی کشش اور قرآن مجید کی آیات میں کس غضب کی تاثیر ہے۔ اس لیے وہ کوشش کرتے تھے کہ اس کلام کو نہ خود سنیں، نہ کسی کو سننے دیں اور آپؐ کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا کر محض اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے آپؐ کی دعوت کو دبا دیں۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو وہ جگہ جگہ یہ مشہور کرتے پھر رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہک گئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف ان کا یہ مستقل طریق کار تھا کہ جہاں بھی آپؐ قرآن سنانے کی کوشش کریں وہاں شور مچا دیا جائے تاکہ لوگ یہ جان ہی نہ سکیں کہ وہ بات کیا ہے جس کی بنا پر آپ کو گمراہ اور بہکا ہوا آدمی قرار دیا جا رہا ہے۔

ان حالات میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرمِ پاک میں جہاں قریش کے

لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ یکایک تقریر کرنے کھڑے ہو گئے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ خطبہ جاری ہوا جو سورۂ نجم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کلام کی شدتِ تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپؐ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش ہی نہ رہا اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ فرمایا تو وہ بھی سجدے میں گر گئے تو بعد میں انہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی، اور لوگوں نے بھی انہیں اس پر مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے نہ صرف کان لگا کر سنا بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ بھی کر گزرے۔ آخر کار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی کے بعد محمد کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے تلک الغرانقۃ العُلیٰ، وان شفاعتھن لترتجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے) اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمد ہمارے طریقے پر واپس آ گئے ہیں، حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ اس پوری سورت کے سیاق و سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے جو اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے سُنے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم الحج، حواشی ۹۶ تا ۱۰۱)

موضوع اور مضمون

تقریر کا موضوع کفارِ مکہ کو اُس رویے کی غلطی پر متنبہ کرنا ہے جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔

کلام کا آغاز اس طرح فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہکے اور بھٹکے ہوئے آدمی نہیں ہیں، جیسا کہ تم ان کے متعلق مشہور کرتے پھر رہے ہو اور نہ یہ اسلام کی یہ تعلیم اور دعوت انہوں نے خود اپنے دل سے گھڑلی ہے جیسا کہ تم اپنے نزدیک سمجھے بیٹھے ہو بلکہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خالص وحی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔ جن حقیقتوں کو وہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں وہ ان کے اپنے قیاس و گمان کی آفریدہ نہیں ہیں بلکہ ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔ انہوں نے اس فرشتے کو خود دیکھا ہے جس کے ذریعہ سے یہ علم دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے رب کی عظیم نشانیوں کا براہِ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سوچ کر نہیں دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ ان سے تمہارا جھگڑنا

بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا آنکھوں والے سے اُس چیز پر جھگڑے جو اُسے نظر نہیں آتی اور آنکھوں والے کو نظر آتی ہے۔

اس کے بعد علی الترتیب تین مضامین ارشاد ہوئے ہیں:۔

اولاً سامعین کو سمجھایا گیا ہے کہ جس دین کی تم پیروی کر رہے ہو اس کی بنیاد محض گمان اور من مانے مفروضات پر قائم ہے۔ تم نے لات اور منات اور عُزّیٰ جیسی چند دیویوں کو معبود بنا رکھا ہے، حالانکہ الوہیت میں برائے نام بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے رکھا ہے، حالانکہ خود اپنے لیے تم بیٹی کو عار سمجھتے ہو۔ تم نے اپنے نزدیک یہ فرض کر لیا ہے کہ تمہارے یہ معبود اللہ تعالیٰ سے تمہارے کام بنوا سکتے ہیں، حالانکہ تمام ملائکہ مقربین مل کر بھی اللہ سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے۔ اس طرح کے عقائد جو تم نے اختیار کر رکھے ہیں، ان میں سے کوئی عقیدہ بھی کسی علم اور دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ کچھ خواہشات ہیں جن کی خاطر تم بعض اوہام کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ ایک بہت بڑی بنیادی غلطی ہے جس میں تم لوگ مبتلا ہو۔ دین وہی صحیح ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ اور حقیقت لوگوں کی خواہشات کی تابع نہیں ہوا کرتی کہ جسے وہ حقیقت سمجھ بیٹھیں وہی حقیقت ہو جائے۔ اس سے مطابقت کے لیے قیاس و گمان کام نہیں دیتا، بلکہ اس کے لیے علم درکار ہے۔ وہ علم تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو تم اس سے منہ موڑتے ہو اور اُلٹا اس شخص کو گمراہ ٹھیراتے ہو جو تمہیں صحیح بات بتا رہا ہے۔ اس غلطی میں تمہارے مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، بس دنیا ہی مطلوب بنی ہوئی ہے، اس لیے تمہیں حقیقت کی کوئی طلب نہیں ہے، نہ اس بات کی کوئی پروا کہ جن عقائد کی تم پیروی کر رہے ہو وہ حق کے مطابق ہیں یا نہیں۔

ثانیاً لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی ساری کائنات کا مالک و مختار ہے۔ راست رو وہ ہے جو اس کے راستے پر ہو، اور گمراہ وہ جو اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہو۔ گمراہ کی گمراہی اور راست رو کی راست روی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک کے عمل کو وہ جانتا ہے اور اس کے ہاں لازماً بُرائی کا بدلہ بُرا اور بھلائی کا بدلہ بھلا مل کر رہنا ہے۔ اصل فیصلہ اس پر نہیں ہوتا کہ تم اپنے زعم میں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو، اور اپنی زبان سے اپنی پاکیزگی کے کتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہو، بلکہ فیصلہ اس پر ہوتا ہے کہ خدا کے علم میں تم متقی ہو یا نہیں۔ اگر تم بڑے گناہوں سے اجتناب کرو

تو اس کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے وہ درگزر فرمائے گا۔

ثالثاً دینِ حق کے وہ چند بنیادی امور لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو قرآن مجید کے نزول سے صدہا برس پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بیان ہو چکے تھے، تاکہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا اور نرالا دین لے آئے ہیں بلکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ یہ وہ اصولی حقائق ہیں جو ہمیشہ سے خدا کے نبی بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ اُنہی صحیفوں سے یہ بات بھی نقل کر دی گئی ہے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوح اور قومِ لوط کی تباہی اتفاقی حوادث کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسی ظلم و طغیان کی پاداش میں اُن کو ہلاک کیا تھا جس سے باز آنے پر کفارِ مکہ کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔

یہ مضامین ارشاد فرمانے کے بعد تقریر کا خاتمہ اس بات پر کیا گیا ہے کہ فیصلے کی گھڑی قریب آ لگی ہے جسے کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔ اُس گھڑی کے آنے سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے ذریعہ سے تم لوگوں کو اُسی طرح خبردار کیا جا رہا ہے جس طرح پہلے لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا۔ اب کیا یہی وہ بات ہے جو تمہیں انوکھی لگتی ہے؟ جس کی تم ہنسی اُڑاتے ہو؟ جسے تم سننا نہیں چاہتے اور شور مچاتے ہو تاکہ کوئی اور بھی اسے نہ سننے پائے؟ اپنی اِس نادانی پر تمہیں رونا نہیں آتا؟ باز آجاؤ اپنی اس روش سے، جھک جاؤ اللہ کے سامنے اور اُسی کی بندگی کرو۔

یہی وہ مؤثر خاتمۂ کلام تھا جسے سُن کر کٹے سے کٹے منکرین بھی ضبط نہ کر سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کلامِ الٰہی کے یہ فقرے ادا کر کے سجدہ کیا تو وہ بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

القمر

نام پہلی ہی آیت کے فقرہ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں لفظ القمر آیا ہے۔

زمانہ نزول اس میں شق القمر کے واقعہ کا ذکر آیا ہے جس سے اس کا زمانہ نزول متعین ہو جاتا ہے۔ محدثین و مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے مکہ معظمہ میں منیٰ کے مقام پر پیش آیا تھا۔

موضوع اور مضمون اس میں کفارِ مکہ کو اس ہٹ دھرمی پر متنبہ کیا گیا ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی تھی۔ شق القمر کا حیرت انگیز واقعہ اس بات کا صریح نشان تھا کہ وہ قیامت جس کے آنے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، فی الواقع برپا ہو سکتی ہے، اور اس کی آمد کا وقت قریب آ لگا ہے۔ چاند جیسا عظیم الشان کرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے پھٹا تھا۔ اس کے دونوں ٹکڑے الگ ہو کر ایک دوسرے سے اتنی دُور چلے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا تھا۔ پھر آن کی آن میں وہ دونوں پھر مل گئے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ نظامِ عالم ازلی و ابدی اور غیر فانی نہیں ہے۔ وہ درہم برہم ہو سکتا ہے، بڑے بڑے ستارے اور سیارے پھٹ سکتے ہیں، بکھر سکتے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکرا سکتے ہیں، اور وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کا نقشہ قیامت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے قرآن میں کھینچا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ اس امر کا پتہ بھی دے رہا تھا کہ نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ

وقت قریب ہے جب قیامت برپا ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حیثیت سے لوگوں کو اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا، دیکھو اور گواہ رہو۔ مگر کفار نے اسے جادو کا کرشمہ قرار دیا اور اپنے انکار پر جمے رہے۔ اسی ہٹ دھرمی پر اس سورہ میں انہیں ملامت کی گئی ہے۔

کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ نہ سمجھانے سے مانتے ہیں، نہ تاریخ سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ آنکھوں سے صریح نشانیاں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ اُسی وقت مانیں گے جب قیامت فی الواقع برپا ہو جائے گی اور قبروں سے نکل کر یہ داورِ محشر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے۔

اس کے بعد اُن کے سامنے قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور آلِ فرعون کا حال مختصر الفاظ میں بیان کر کے فرمایا گیا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تنبیہات کو جھٹلا کر یہ قومیں کس دردناک عذاب سے دوچار ہوئیں، اور ایک ایک قوم کا قصہ بیان کرنے کے بعد بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ قرآن نصیحت کا آسان ذریعہ ہے جس سے اگر کوئی قوم سبق لے کر راہِ راست پر آ جائے تو اُن عذابوں کی نوبت نہیں آسکتی جو اِن قوموں پر نازل ہوئے۔ اب آخر یہ کیا حماقت ہے کہ اس آسان ذریعہ سے نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی اسی پر اصرار کرے کہ عذاب دیکھے بغیر نہ مانے گا۔

اسی طرح پچھلی قوموں کی تاریخ سے عبرت ناک مثالیں دینے کے بعد کفارِ مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جس طرزِ عمل پر دوسری قومیں سزا پا چکی ہیں۔ وہی طرزِ عمل اگر تم اختیار کرو تو آخر تم کیوں نہ سزا پاؤ گے؟ کیا تمہارے کچھ سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ تمہارے ساتھ دوسروں سے مختلف معاملہ کیا جائے؟ یا کوئی خاص معافی نامہ تمہارے پاس لکھا ہوا آگیا ہے کہ جس جرم پر دوسرے پکڑے گئے ہیں وہی تم کرو گے تو تمہیں نہ پکڑا جائے گا؟ اور اگر تم اپنی جمعیت پر پھولے ہوئے ہو تو عنقریب تمہاری یہ جمعیت شکست کھا کر بھاگتی نظر آئے گی اور اس سے زیادہ سخت معاملہ تمہارے ساتھ قیامت کے روز ہوگا۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت لانے کے لیے کسی بڑی تیاری کی حاجت نہیں ہے۔ اُس کا بس ایک حکم ہوتے ہی پلک جھپکاتے وہ برپا ہو جائے گی۔ مگر ہر چیز کی طرح نظامِ عالم اور نوعِ انسانی کی بھی ایک تقدیر ہے۔ اِس تقدیر کے لحاظ سے جو وقت اس کام کے

لیے مقرر ہے اسی وقت پر وہ ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جب کوئی چیلنج کرے اُس کو قائل کرنے کے لیے قیامت لاکھڑی کی جائے۔ اُس کو آتے نہ دیکھ کر تم سرکشی اختیار کرو گے تو اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ بھگتو گے۔ تمہارا کچا چٹھا خدا کے ہاں تیار ہو رہا ہے جس میں تمہاری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ثبت ہونے سے رہ نہیں گئی ہے۔

الرحمٰن

نام پہلے ہی لفظ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جو لفظ الرحمٰن سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم اس نام کو سورۃ کے مضمون سے بھی گہری مناسبت ہے، کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے مظاہر و ثمرات کا ذکر فرمایا گیا ہے

زمانۂ نزول علمائے تفسیر بالعموم اس سورہ کو مکی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس اور عِکرِمہ اور قَتادہ سے یہ قول منقول ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے لیکن اوّل تو انہی بزرگوں سے بعض دوسری روایات اس کے خلاف بھی منقول ہوئی ہیں۔ دوسرے اس کا مضمون مدنی سورتوں کی بہ نسبت مکی سورتوں سے زیادہ مشابہ ہے، بلکہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ مکہ کے بھی ابتدائی دَور کی معلوم ہوتی ہے اور مزید براں متعدد روایات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ ہی میں ہجرت سے کئی سال قبل نازل ہوئی تھی۔

مسند احمد میں حضرت اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں خانہ کعبہ کے اُس گوشے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا جس میں حجر اسود نصب ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جبکہ ابھی فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو) کا فرمانِ الٰہی نازل نہیں ہوا تھا۔ مشرکین اس نماز میں آپ کی زبان سے فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کے الفاظ سُن رہے تھے۔" اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ سورۃ الحجر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

اَلبزّار، ابن جریر، ابن المُنذِر، دارقُطنی (فی الافراد) ابن مَردُوْیَہ اور الخطیب (فی التاریخ) نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُورۂ رحمٰن خود

تلاوت فرمائی، یا آپ کے سامنے یہ سورۃ پڑھی گئی۔ پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ "کیا وجہ ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سن رہا ہوں جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا؟" لوگوں نے عرض کیا "وہ کیا جواب تھا؟" آپؐ نے فرمایا: "جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پڑھتا تو جن اُس کے جواب میں کہتے جاتے تھے کہ لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعْمَۃِ رَبِّنَا نُکَذِّبُ" ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔"

اسی سے ملتا جلتا مضمون ترمذی، حاکم اور حافظ ابوبکر بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے۔ اُن کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب لوگ سورۂ رحمٰن کے الفاظ سن کر خاموش رہے تو حضورؐ نے فرمایا لقد قرأتہا علی الجن لیلۃ الجن فکانوا احسن مردودًا منکم کنت کلما اتیت علی قولہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ قالوا لا بِشَیْءٍ مِّن نِعمِکَ ربنا نکذب فلک الحمد۔ یعنی "میں نے یہ سورۃ اُس رات جنوں کو سنائی تھی جس میں وہ قرآن سننے کے لیے جمع ہوئے تھے، وہ اس کا جواب تم سے بہتر دے رہے تھے جب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پہنچتا تھا کہ اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اے پروردگار، ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، حمد تیرے ہی لیے ہے۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورۂ احقاف (آیات ۲۹-۳۲) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جنوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اُس موقع پر حضورؐ نماز میں سورۂ رحمٰن تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے، جب آپ سفرِ طائف سے واپسی پر نخلہ میں کچھ مدت ٹھیرے تھے۔ اگرچہ بعض دوسری روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ جن آپ سے قرآن سن رہے ہیں بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہ آپؐ کی تلاوت سن رہے تھے، لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو جنوں کی سماعتِ قرآن پر مطلع فرمایا تھا اُسی طرح اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ سورۂ رحمٰن سنتے وقت وہ اس کا کیا جواب دیتے جا رہے تھے۔

ان روایات سے تو صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ رحمٰن، سورۂ حجر اور سورۂ احقاف سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ایک اور روایت ہمارے سامنے آتی ہے، جس سے پتہ چلتا

ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ ابن اسحاق حضرت عُروہ بن زبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو علانیہ باوازِ بلند قرآن پڑھتے نہیں سنا ہے۔ ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلام پاک سنا ڈالے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں۔ صحابہ نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو تاکہ اگر قریش کے لوگ اس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا مجھے یہ کام کر ڈالنے دو، میرا محافظ اللہ ہے۔ پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جبکہ قریش کے سردار وہاں اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ نے مقامِ ابراہیم پر پہنچ کر پورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور اُن کے منہ پر تھپڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی، پٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ان کے دم میں دم رہا قرآن سناتے چلے گئے۔ آخر کار جب وہ اپنا سوجا ہوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ آج سے بڑھ کے یہ خدا کے دشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے۔ تم کہو تو کل پھر انہیں قرآن سناؤں۔ سب نے کہا، بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سننا چاہتے تھے وہ تم نے انہیں سنا دیا (سیرۃ ابن ہشام جلد اول ص ۳۳۶)

موضوع اور مضمون

قرآن مجید کی یہ ایک ہی سورت ہے جس میں انسان کے ساتھ زمین کی دوسری با اختیار مخلوق، جنوں کو بھی براہِ راست خطاب کیا گیا ہے اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات، اُس کے بے حد و حساب احسانات، اس کے مقابلے میں اُن کی عاجزی و بے بسی اور اُس کے حضور اُن کی جواب دہی کا احساس دلا کر اُس کی نافرمانی کے انجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے اور فرماں برداری کے بہترین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح جن بھی ایک ذی اختیار اور جواب دہ مخلوق ہیں، جنہیں کفر و ایمان اور طاعت و عصیان کی آزادی بخشی گئی ہے اور اُن میں بھی انسانوں ہی کی طرح کافر و مومن اور مطیع و سرکش پائے جاتے ہیں، اور اُن کے اندر بھی ایسے گروہ موجود ہیں،

جو انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی پر ایمان لائے ہیں لیکن یہ سورۃ اس امر کی قطعی صراحت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی دعوت جن اور انس دونوں کے لیے ہے اور حضور کی رسالت صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔

سورۃ کے آغاز میں تو خطاب کا رُخ انسانوں کی طرف ہی ہے، کیونکہ زمین کی خلافت انہی کو حاصل ہے۔ خدا کے رسول انہی میں سے آئے ہیں اور خدا کی کتابیں انہی کی زبانوں میں نازل کی گئی ہیں، لیکن آگے چل کر آیت ۱۳ سے انسان اور جن دونوں کو یکساں مخاطب کیا گیا ہے اور ایک ہی دعوت دونوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔

سورۃ کے مضامین چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک خاص ترتیب سے ارشاد ہوئے ہیں:-

آیت ۱ سے ۴ تک یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ اس قرآن کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور یہ عین اُس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اِس تعلیم سے نوعِ انسانی کی ہدایت کا سامان کرے، کیوں کہ انسان کو ایک ذی عقل و شعور مخلوق کی حیثیت سے اُسی نے پیدا کیا ہے۔

آیت ۵، ۶ میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی میں چل رہا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی تابع فرمان ہے۔ یہاں کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی خدائی چل رہی ہو۔

آیت ۷، ۹ میں ایک دوسری اہم حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اِس پورے نظام کو ٹھیک ٹھیک توازُن کے ساتھ عدل پر قائم کیا ہے اور اس نظام کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس میں رہنے والے اپنے حدودِ اختیار میں بھی عدل ہی پر قائم ہوں اور توازن نہ بگاڑیں۔

آیت ۱۰ سے آیت ۲۵ تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائب و کمالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی اُن نعمتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جن سے انسان اور جن دونوں کو یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی غیر فانی اور لازوال نہیں ہے، اور چھوٹے سے بڑے تک کوئی موجود ایسا نہیں جو اپنے وجود اور ضروریاتِ وجود کے لیے خدا کا محتاج نہ ہو۔ زمین سے لے کر آسمانوں تک شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے اسی کی کارفرمائی سے ہو رہا ہے۔

آیت ۳۱ سے ۳۶ تک ان دونوں گروہوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم سے بازپُرس کی جائے گی۔ اس بازپُرس سے بچ کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ خدا کی خدائی تمہیں ہر طرف سے

گھیرے ہوئے ہے۔ اس سے نکل کر بھاگ جانا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اگر تم اِس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ اُس سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔

آیات ۳۷، ۳۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بازپرس قیامت کے روز ہونے والی ہے۔

آیت ۳۹ سے ۴۵ تک اُن مجرم انسانوں اور جنوں کا انجام بتایا گیا ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے رہے ہیں۔

اور آیت ۴۶ سے آخر سورت تک تفصیل کے ساتھ وہ انعامات بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں اُن نیک انسانوں اور جنوں کو عطا کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں خدا ترسی کی زندگی بسر کی ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کام کیا ہے کہ ہمیں ایک روز اپنے رب کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

یہ پوری تقریر خطابت کی زبان میں ہے۔ ایک پُرجوش اور نہایت بلیغ خطبہ ہے جس کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایک ایک کرشمے، اور اس کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت، اور اس کی سلطانی و قہاری کے مظاہر میں سے ایک ایک مظہر، اور اس کی جزا و سزا کی تفصیلات میں سے ایک ایک چیز کو بیان کر کے بار بار جن و انس سے سوال کیا گیا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ آگے چل کر ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ آلاء ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس کو اس خطبے میں مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور جن و انس سے یہ سوال ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

*

الواقعة

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَۃ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن عباس نے سورتوں کی جو ترتیب نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر الواقعہ اور اس کے بعد الشعرآء (الاتقان للسیوطی)۔ یہی ترتیب عکرمہ نے بھی بیان کی ہے۔ (بیہقی، دلائل النبوۃ)

اس کی تائید اُس قصّہ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورۂ طٰہٰ پڑھی جارہی تھی۔ اُن کی آہٹ سن کر ان لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیے حضرت عمر پہلے تو بہنوئی پر پل پڑے اور جب بہن اُن کو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمر کو سخت ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا "اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے، دیکھوں تو سہی اُس میں کیا لکھا ہے"۔ بہن نے کہا "آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں وانّہ لا یمسّھا الا الطاھر" "اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت سورۂ واقعہ نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اسی میں آیت لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ وارد ہوئی ہے اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر ہجرتِ حبشہ کے بعد ۵ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفّارِ مکّہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابلِ یقین قرار دیتے

تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جلا اٹھائے جائیں گے اور اُن کا محاسبہ ہوگا، اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہ گار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالم واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ یہ کسی کی طاقت ہوگی کہ اُسے آتے آتے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے اُس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے عام صالحین، تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہِ کبیرہ پر جمے رہے۔ ان تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۵۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ۵۷ سے ۷۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے در پے دلائل دیے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفّار انکار کر رہے تھے یعنی توحید اور آخرت۔ ان دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اُس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اُس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجّہ دلائی گئی ہے اور اُسے اس سوال پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیے ہوئے سامانِ زیست پر پل رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجا لانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لا سکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں اُن کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بدنصیبو، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹی بے اعتنائی برتتے ہو، قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل

ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوق کی دست رس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اِسے محمد صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں، حالانکہ لوحِ محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرّہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی لن ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا، اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زُعم درست ہے کہ بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے۔ تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پلٹا کیوں نہیں لاتا؟ جس طرح تو اِس معاملہ میں بے بس ہے۔ اُسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے، موت کے بعد مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مقربین میں سے ہو تو مقربین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا اور جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مقدر ہے۔

الحدید

نام

آیت ۲۵ کے فقرے وَاَنزَلنَا الحَدِیدَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

یہ بالاتفاق مدنی سورۃ ہے اور اس کے مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ غالباً یہ جنگِ اُحد اور صلح حُدیبیہ کے درمیان کسی زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ وہی زمانہ تھا جب مدینہ کی مختصر سی اسلامی ریاست کو ہر طرف سے کفار نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور سخت بے سروسامانی کی حالت میں اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پورے عرب کی طاقت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس حالت میں اسلام کو اپنے پیرؤں سے صرف جانی قربانی ہی درکار نہ تھی بلکہ مالی قربانی بھی درکار تھی اور اس سورۃ میں اسی قربانی کے لیے پرزور اپیل کی گئی ہے۔ اس قیاس کو آیت ۱۰ مزید تقویت پہنچاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جماعت کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ فتح کے بعد جو لوگ اپنے مال خرچ کریں گے اور خدا کی راہ میں جنگ کریں گے وہ اُن لوگوں کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جو فتح سے پہلے جان اور مال کی قربانیاں دیں اور اسی کی تائید حضرت اَنسؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابن مَردُوْیَہ نے نقل کیا ہے وہ آیت اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ کے متعلق فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے آغاز سے ۱۷ برس بعد اہلِ ایمان کو جھنجھوڑنے والی یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حساب سے اس کا زمانۂ نزول ۴ھ اور ۵ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین ہے۔ اسلام کی تاریخ کے اُس نازک ترین دور میں، جبکہ عرب کی جاہلیت سے اسلام کا فیصلہ کن معرکہ برپا تھا، یہ سورۃ اس غرض کے لیے نازل فرمائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو خاص طور پر مالی

قربانیوں کے لیے آمادہ کیا جائے اور یہ بات اُن کے ذہن نشین کرائی جائے کہ ایمان محض زبانی اقرار اور محض کچھ ظاہری اعمال کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے دین کے لیے مخلص ہونا اس کی اصل روح اور حقیقت ہے۔ جو شخص اس رُوح سے خالی ہو اور خدا اور اس کے دین کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور مفاد کو عزیز تر رکھے۔ اس کا اقرار ایمان کھوکھلا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت خدا کے ہاں نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ سامعین کو اچھی طرح یہ احساس ہو جائے کہ کس عظیم ہستی کی طرف سے اُن کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد حسبِ ذیل مضامین سلسلہ وار ارشاد ہوئے ہیں :-

ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی راہِ خدا میں مال صَرف کرنے سے پہلوتہی نہ کرے۔ ایسا کرنا صرف ایمان ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے بھی غلط ہے، کیونکہ یہ مال دراصل خدا ہی کا مال ہے جس پر تم کو خلیفہ کی حیثیت سے تصرّف کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ کل یہی مال دوسروں کے پاس تھا، اور کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ آخر کار اسے خدا ہی کے پاس رہ جانا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا وارث ہے۔ تمہارے کام اس مال کا کوئی حصّہ اگر آ سکتا ہے تو صرف وہ جسے تم اپنے زمانۂ تصرف میں خدا کے کام پر لگا دو۔

خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا اگرچہ ہر حال میں قابلِ قدر ہے مگر ان قربانیوں کی قدر و قیمت مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ایک موقع ہوتا ہے جب کفر کی طاقت بڑی زبردست ہو اور ہر وقت یہ خطرہ ہو کہ کہیں اسلام اس کے مقابلے میں مغلوب نہ ہو جائے۔ دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب کفر و اسلام کی کشمکش میں اسلام کی طاقت کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اہلِ ایمان کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں فتح نصیب ہو رہی ہو۔ یہ دونوں حالتیں اپنی اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، اِس لیے جو قربانیاں ان مختلف حالتوں میں دی جائیں وہ بھی اپنی قیمت میں برابر نہیں ہیں۔ جو لوگ اسلام کے ضعف کی حالت میں اُس کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائیں اور مال صَرف کریں اُن کے درجہ کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ جو اسلام کے غلبے کی حالت میں اُس کو مزید فروغ دینے کے لیے جان و مال قربان کریں۔

راہِ حق میں جو مال بھی خرچ کیا جائے وہ اللہ کے ذمّے قرض ہے۔ اور اللہ اسے نہ صرف یہ

کہ کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا بلکہ اپنی طرف سے مزید اجر بھی عنایت فرمائے گا۔

آخرت میں نور اُنہی اہلِ ایمان کو نصیب ہوگا جنہوں نے راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کیا ہو۔ رہے وہ منافق جو دنیا میں اپنے ہی مفاد کو دیکھتے رہے اور جنہیں اس بات کی کوئی پروا نہ رہی کہ حق غالب ہوتا ہے یا باطل، وہ خواہ دنیا کی اس زندگی میں مومنوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں مگر آخرت میں اُن کو مومنوں سے الگ کر دیا جائے گا، نور سے وہ محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

مسلمانوں کو اُن اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جانا چاہیے۔ جن کی عمریں دنیا پرستی میں بیت گئی ہیں، اور جن کے دل زمانۂ دراز کی غفلتوں سے پتھر ہو گئے ہیں، وہ مومن ہی کیا جس کا دل خدا کے ذکر سے نہ پگھلے اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے نہ جھکے۔

اللہ کے نزدیک صدیق اور شہید صرف وہ اہلِ ایمان ہیں جو اپنا مال کسی جذبۂ ریا کے بغیر صدقِ دل سے اس کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔

دنیا کی زندگی محض چند روز کی بہار اور ایک متاعِ غرور ہے، یہاں کا کھیل کود، یہاں کی دلچسپیاں، یہاں کی آرائش و زیبائش، یہاں کی بڑائیوں پر فخر اور یہاں کا دھن دولت، جس میں لوگ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں، سب کچھ ناپائیدار ہے، اس کی مثال اُس کھیتی کی سی ہے جو پہلے سرسبز ہوتی ہے، پھر زرد پڑ جاتی ہے اور آخر کار بھُس بن کر رہ جاتی ہے۔ پائیدار زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے، جہاں بڑے نتائج نکلنے والے ہیں۔ تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو یہ کوشش جنت کی طرف دوڑنے میں صرف کرو۔

دنیا میں راحت اور مصیبت جو بھی آتی ہے اللہ کے پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے کے مطابق آتی ہے۔ مومن کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ مصیبت آئے تو ہمت نہ ہار بیٹھے اور راحت آئے تو اِترا نہ جائے۔ یہ تو ایک منافق اور کافر کا کردار ہے کہ اللہ اس کو نعمت بخشے تو وہ اپنی جگہ پھُول جائے، فخر جتانے لگے، اور اُسی نعمت دینے والے خدا کے کام میں خرچ کرتے ہوئے خود بھی تنگ دلی دکھائے اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا مشورہ دے۔

اللہ نے اپنے رسول کھُلی کھُلی نشانیوں اور کتاب اور میزانِ عدل کے ساتھ بھیجے تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور اس کے ساتھ لوہا بھی نازل کیا تا کہ حق قائم کرتے اور باطل کا سر نیچا کرتے

کے لیے طاقت استعمال کی جائے۔ اِس طرح اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اُس کے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کی خاطر جان لڑا دیں۔ یہ مواقع اللہ نے تمہاری اپنی ہی ترقی اور سرفرازی کے لیے پیدا کیے ہیں، ورنہ اللہ اپنے کام کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے انبیاء آتے رہے جن کی دعوت سے کچھ لوگ راہِ راست پر آئے اور اکثر فاسق بنے رہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام آئے جن کی تعلیم سے لوگوں میں بہت سی اخلاقی خوبیاں پیدا ہوئیں مگر ان کی اُمت نے رہبانیت کی بدعت اختیار کر لی۔ اب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے، ان پر جو لوگ ایمان لائیں گے اور خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے، اللہ اُن کو اپنی رحمت کا دُہرا حصہ دے گا اور انہیں وہ نور بخشے گا جس سے دنیا کی زندگی میں وہ ہر ہر قدم پر ٹیڑھے راستوں کے درمیان سیدھی راہ صاف دیکھ کر چل سکیں گے۔ اہلِ کتاب چاہے اپنے آپ کو اللہ کے فضل کا ٹھیکہ دار سمجھتے رہیں مگر اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ ہے، اُسے اختیار ہے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔

یہ ہے اُن مضامین کا خلاصہ جو اس سورت میں ایک ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان ہوئے ہیں۔

*

اَلْمُجَادَلَۃ

نام اِس سورۃ کا نام المُجَادَلہ بھی ہے، اور المجَادِلہ بھی۔ یہ نام پہلی ہی آیت کے لفظ تُجَادِلُکَ سے ماخوذ ہے۔ چونکہ سورۃ کے آغاز میں اُن خاتون کا ذکر آیا ہے جنہوں نے اپنے شوہر کے ظہار کا قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے بار بار اصرار کیا تھا کہ آپ کوئی ایسی صورت بتائیں جس سے اُن کی اور اُن کے بچّوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس اصرار کو لفظِ مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے، اِس لیے یہی اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا۔ اِس کو اگر مُجَادَلہ پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ ہوں گے "بحث و تکرار"، اور مُجَادِلہ پڑھا جائے تو معنیٰ ہوں گے "بحث و تکرار کرنے والی"۔

زمانۂ نزول کسی روایت میں اس امر کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ مُجادلہ کا یہ واقعہ کب پیش آیا تھا، مگر ایک علامت اس سورہ کے مضمون میں ایسی ہے جس کی بنا پر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا زمانہ غزوۂ احزاب (شوال ۵ھ) کے بعد کا ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کے حقیقی بیٹا ہونے کی نفی کرتے ہوئے صرف یہ ارشاد فرما کر چھوڑ دیا تھا کہ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِىْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (اور اللہ نے تمہاری اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں نہیں بنا دیا ہے) مگر اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ظہار کرنا کوئی گناہ یا جُرم ہے اور نہ یہ بتایا گیا تھا کہ اس فعل کا شرعی حکم کیا ہے۔ بخلاف اِس کے اِس سورہ میں ظہار کا پورا قانون بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفصّل احکام اُس مجمل ہدایت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

موضوع اور مباحث اِس سورۃ میں مسلمانوں کو اُن مختلف مسائل کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں جو اُس وقت در پیش تھے۔

آغاز سورۃ سے آیت ۶ تک ظِہار کے شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو پوری سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے بعد بھی جاہلیت کے طریقوں پر قائم رہنا اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنا یا ان کی پابندی سے انکار کرنا، یا ان کے مقابلہ میں خود اپنی مرضی سے کچھ اور قاعدے اور قوانین بنا لینا، قطعی طور پر ایمان کے منافی حرکت ہے۔ جس کی سزا دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اس پر سخت باز پُرس ہونی ہے۔

آیات ۷ تا ۱۰ میں منافقین کی اِس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ وہ آپس میں خفیہ سرگوشیاں کر کے طرح طرح کی شرارتوں کے منصوبے بناتے تھے اور ان کے دلوں میں جو بغض چھپا ہوا تھا اس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کی طرح ایسے طریقے سے سلام کرتے تھے جس سے دعا کے بجائے بَد دُعا کا پہلو نکلتا تھا۔ اِس سلسلے میں مسلمانوں کو تسلّی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ سرگوشیاں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اِس لیے تم اللہ کے بھروسے پر اپنا کام کرتے رہو اور اس کے ساتھ ان کو یہ اخلاقی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ سچّے اہلِ ایمان کا کام گناہ اور ظلم و زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے لیے سرگوشیاں کرنا نہیں ہے، وہ اگر آپس میں بیٹھ کر تخلیے میں کوئی بات کریں بھی تو وہ نیکی اور تقویٰ کی بات ہونی چاہیے۔

آیت ۱۱ تا ۱۳ میں مسلمانوں کو مجلسی تہذیب کے کچھ آداب سکھائے ہیں اور بعض ایسے معاشرتی عیوب کو دُور کرنے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں جو پہلے بھی لوگوں میں پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی مجلس میں اگر بہت سے لوگ بیٹھے ہوں اور باہر سے کچھ لوگ آجائیں تو پہلے سے بیٹھے ہوئے اصحاب اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ذرا سمٹ کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کے لیے گنجائش پیدا کردیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے کھڑے رہ جاتے ہیں یا دہلیز میں بیٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں یا واپس چلے جاتے ہیں، یا یہ دیکھ کر کہ مجلس میں ابھی کافی گنجائش موجود ہے، حاضرین کے اوپر سے پھاندتے ہوئے اندر گھستے ہیں۔ یہ صورت حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اکثر پیش آتی رہتی تھی۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ اپنی مجلسوں میں خود غرضی اور تنگ دِلی کا مظاہرہ نہ کیا کریں بلکہ بعد کے آنے والوں کو کُھلے دل سے جگہ دے دیا کریں۔

اسی طرح ایک عیب لوگوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں (خصوصاً کسی اہم شخصیت کے ہاں) جاتے ہیں تو جم کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس بات کا کچھ خیال نہیں کرتے کہ ضرورت سے زیادہ اُس کا وقت

لینا اُس کے لیے باعثِ زحمت ہوگا۔ اگر وہ کہے کہ حضرت اب تشریف لے جایئے تو بُرا مانتے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر اُٹھ جائیے تو بد اخلاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ اشارے کنایے سے اُن کو بتایئے کہ اب کچھ دوسرے ضروری کاموں کے لیے اس کو وقت ملنا چاہیے تو سنی اَن سنی کر جاتے ہیں۔ لوگوں کے اس طرزِ عمل سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ پیش آتا تھا اور آپ کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کے شوق میں اللہ کے بندے اس بات کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ وہ بہت زیادہ قیمتی کاموں کا نقصان کر رہے ہیں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ تکلیف دہ عادت چھڑانے کے لیے حکم دیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کے لیے کہا جائے تو اُٹھ جایا کرو۔

ایک اور عیب لوگوں میں یہ بھی تھا کہ ایک ایک آدمی آکر خواہ مخواہ حضورؐ سے تخلیہ میں بات کرنے کی خواہش کرتا تھا یا مجلسِ عام میں یہ چاہتا تھا کہ آپؐ کے قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں آپ سے بات کرے، یہ چیز حضورؐ کے لیے بھی تکلیف دہ تھی اور دوسرے لوگ جو مجلس میں موجود ہوتے، ان کو بھی ناگوار ہوتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو شخص بھی آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے وہ صدقہ دے۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگوں کو اس بُری عادت پر متنبہ کیا جائے تاکہ وہ اسے چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ پابندی بس تھوڑی دیر تک باقی رکھی گئی اور جب لوگوں نے اپنا طرزِ عمل درست کر لیا تو اسے منسوخ کر دیا گیا۔

آیت ۱۴ سے آخر سورہ تک مسلم معاشرے کے لوگوں کو، جن میں مخلص اہلِ ایمان اور منافقین اور مذبذبین سب ملے جلے تھے، بالکل دو ٹوک طریقے سے بتایا گیا ہے کہ دین میں آدمی کے مخلص ہونے کا معیار کیا ہے۔ ایک قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اسلام کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر دین سے غداری کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے جس پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات اور وسوسے پھیلا کر اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ پر آنے سے روکتے ہیں، مگر چونکہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہیں اس لیے ان کا جھوٹا اقرار ایمان اُن کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔ دوسری قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اللہ کے دین کے معاملہ میں کسی اور کا لحاظ تو درکنار، خود اپنے باپ، بھائی، اولاد اور خاندان تک کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جو خدا اور رسول اور اس کے دین کا دشمن ہے اس کے لیے ان کے دل میں کوئی محبت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صاف فرما دیا ہے کہ پہلی قسم کے لوگ چاہے کتنی ہی قسمیں کھا کھا کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلائیں، درحقیقت وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور اللہ کی پارٹی میں شامل ہونے کا شرف صرف دوسری قسم کے مسلمانوں کو حاصل ہے، وہی سچے مومن ہیں، انہی سے اللہ راضی ہے، فلاح وہی پانے والے ہیں۔

الحَشر

نام دوسری آیت کے فقرے اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ الحشر آیا ہے۔

زمانۂ نزول بخاری و مسلم میں حضرت سعید بن جُبیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے سورۂ حشر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ غزوۂ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی جس طرح سورۂ انفال غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت سعید بن جُبیر کی دوسری روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ قُلْ سُوْرَۃُ النَّضِیْرِ یعنی یوں کہو کہ یہ سورۂ نضیر ہے۔ یہی بات مجاہد، قتادہ زُہری، ابن زید، یزید بن رُومان، محمد بن اسحاق وغیرہ حضرات سے بھی مروی ہے۔ ان سب کا متفقہ بیان یہ ہے کہ اس میں جن اہلِ کتاب کے نکالے جانے کا ذکر ہے ان سے مُراد بنی النضیر ہی ہیں۔ یزید بن رُومان، مجاہد اور محمد بن اسحاق کا قول یہ ہے کہ از اوّل تا آخر یہ پوری سورۃ اسی غزوہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ غزوہ کب واقع ہوا تھا؟ امام زُہری نے اس کے متعلق عُروہ بن زُبیر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ جنگِ بدر کے چھ مہینے بعد ہوا ہے، لیکن ابن سعد، ابن ہشام اور بلاذری اسے ربیع الاول ۴ھ ہجری کا واقعہ بتاتے ہیں اور یہی صحیح ہے کیونکہ تمام روایات اس امر میں متفق ہیں کہ یہ غزوہ بئرِ مُعُونہ کے سانحہ کے بعد پیش آیا تھا، اور یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بئرِ مُعُونہ کا سانحہ جنگِ اُحد کے بعد رونما ہوا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔

تاریخی پس منظر اس سورہ کے مضامین کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مدینۂ طیبہ اور حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ اس کے بغیر آدمی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں جان سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرکار اُن کے مختلف قبائل کے ساتھ جو معاملہ

کیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے؟

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے تو داپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے، اور عرب سے باہر کے یہودی مورخین و مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملت سے بچھڑ گئے تھے اور دنیا کے یہودی سرے سے اُن کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثار قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں اُن میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہودی عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی روایات پر ہے جو اہل عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخر عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے، اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالِقہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمانِ نبی کی تعمیل کی، مگر عمالِقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے واپس پہنچے۔ اُس وقت حضرتِ موسیٰؑ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعتِ موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً یثرب واپس آکر یہیں بس جانا پڑا (کتاب الاغانی ج ۱۹ ص ۹۴)

اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ بارہ سو برس قبلِ مسیح سے یہاں آباد ہیں، لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے گھڑا تھا کہ اہل عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی نسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ ؁ قبل مسیح میں ہوئی، جبکہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتر بتر کر دیا تھا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اُس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آکر وادی القریٰ، تیماء اور یثرب میں

آباد ہو گئے تھے۔ (فتوح البلدان۔ البلاذری) لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا، اور پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے بالکل نکال باہر کیا۔ اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھیر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سود خواری کے ذریعہ سے اُن پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء، وادی القریٰ، فدک اور خیبر پر اُن کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا، اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اُسی دور میں آکر یثرب پر قابض ہوئے۔

یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے۔ کیونکہ وہ کاہنوں (Cohens یا Priests) کے طبقہ میں سے تھے، انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آکر آباد ہوئے اُس وقت کچھ دوسرے قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اُس سیلاب عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں گزر چکا ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے غسانی شام میں، لخمی حیرہ (عراق) میں، بنی خزاعہ جدہ و مکہ کے درمیان، اوس و خزرج یثرب میں جاکر آباد ہوئے، یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اول اول اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چارو ناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں اُن کو قوت لا یموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ آخر کار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لاکر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اوس و خزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا۔ یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جاکر بسنے پر مجبور ہو گئے۔ تیسرے قبیلے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بن تھی۔ اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا۔ مگر یہاں

رہنے کے لیے اُسے قبیلۂ خزرج کی پناہ لینی پڑی اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر اور بنی قُریظہ نے قبیلۂ اوس کی پناہ لی تاکہ اطرافِ یثرب میں امن کے ساتھ رہ سکیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آغازِ ہجرت تک حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے۔

زبان، لباس، تہذیب، تمدّن، ہر لحاظ سے انہوں نے پوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے، ۱۲ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے ان میں سے بنی زُعُوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گنے چُنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے ان کی زبان اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انہیں مُمیّز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا، لیکن ان ساری باتوں کے باوجود عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے، اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے، یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی، لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو، یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہلِ عرب کو دینِ یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہلِ عرب کو وہ اُمّی Gentiles کہتے تھے جس کے معنیٰ صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان اُمّیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال و طیب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ انہیں دینِ یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایات

عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی، اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے عربوں پر اُن کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے۔ اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مُرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر انہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام ان کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ میخانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لاکر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قینُقاع زیادہ تر سنہار اور لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بیچ بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سُود خوری کا تھا جس کے جال میں انہوں نے گردوپیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار جنہیں قرض لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرح سُود پر قرضے دیتے اور پھر سُود در سُود کا چکّر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

ان کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں میں کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لیں، لیکن دوسری طرف ان کے مفاد ہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انہیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے، وہ اُن بڑی بڑی جائدادوں اور باغات اور سرسبز زمینوں پر انہیں قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سُود خواری ہی سے پیدا کی تھیں۔

مزید براں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقت ور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر بارہا انہیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریقِ مخالف سے ہوئے تھے۔ یثرب میں بنی قُریظہ اور بنی نَضیر اَوس کے حلیف تھے اور بنی قَینُقاع خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اَوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہوئی تھی، اُس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

یہ حالات تھے جب مدینے میں اسلام پہنچا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ آپؐ نے اس ریاست کو قائم کرتے ہی جو اوّلین کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اَوس اور خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی۔ اور دوسرا یہ تھا کہ اس مسلم معاشرے اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ سب متحدہ دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کے چند اہم فقرے یہ ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں کن اُمور کی پابندی قبول کی تھی۔

یہ کہ یہودی اپنا خرچ اُٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکا حملہ آور کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوں گے اور یہ کہ وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیرخواہی کریں گے اور ان کے درمیان نیکی و حق رسانی کا تعلق ہوگا نہ کہ گناہ اور زیادتی کا، اور یہ کہ کوئی اپنے حلیف کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا، اور یہ کہ مظلوم کی حمایت کی جائے گی، اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں

ان علی الیہود نفقتہم و علی المسلمین نفقتہم، و ان بینہم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفۃ، و ان بینہم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم، و انہ لم یاثم امرؤٌ بحلیفہ، و ان النصر للمظلوم، و ان الیہود ینفقون مع المؤمنین ما داموا محاربین، و ان یثرب حرام جوفہا لاھل ھذہ الصحیفۃ و انہ ما کان بین

اھل ھٰذہ الصحیفۃ من حدث او
اشتجار یخاف فسادہ فان مردّہ الی
اللہ عزوجل والیٰ محمد رسول اللہ...
وانہ لاتجار قریش ولامن نصرھا،
وان بینھم النصر علیٰ من دھم
یثرب۔ علیٰ کل اناس حصتھم من
جانبھم الذی قبلھم

(ابن ہشام ج ۲، ص ۱۴۷ تا ۱۵۰)

کے ساتھ مل کر اُس کے مصارف اُٹھائیں گے اور
یہ کہ اس معاہدے کے شرکا پر یثرب میں کسی نوعیت
کا فتنہ و فساد کرنا حرام ہے، اور یہ کہ اس معاہدے
کے شرکاء کے درمیان اگر کوئی ایسا قضیہ یا اختلاف
رونما ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس کا فیصلہ
اللہ کے قانون کے مطابق محمد رسول اللہ کریں گے....
اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی
اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکاءِ
معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے... ہر فریق اپنی جانب
کے علاقے کی مدافعت کا ذمّہ دار ہوگا۔"

یہ ایک قطعی اور واضح معاہدہ تھا جس کی شرائط یہودیوں نے خود قبول کی تھیں لیکن بہت جلدی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش کا اظہار شروع کر دیا اور ان کا عناد روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ اس کے بڑے بڑے وجوہ تین تھے:۔

ایک یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک رئیسِ قوم دیکھنا چاہتے تھے جو اُن کے ساتھ بس ایک سیاسی معاہدہ کر کے رہ جائے اور صرف اپنے گروہ کے دنیوی مفاد سے سروکار رکھے، مگر انہوں نے دیکھا کہ آپ تو اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ (جس میں خود ان کے اپنے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل تھا) اور معصیت چھوڑ کر اُن احکامِ الٰہی کی اطاعت اختیار کرنے اور اُن اخلاقی حدود کی پابندی کرنے کی طرف بلا رہے ہیں جن کی طرف خود ان کے انبیاء بھی دنیا کو بلاتے رہے ہیں۔ یہ چیز ان کو سخت ناگوار تھی، اُن کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ عالمگیر اصولی تحریک اگر چل پڑی تو اس کا سیلاب ان کی جامد مذہبیت اور ان کی نسلی قومیت کو بہالے جائے گا۔

دوسرے یہ کہ اوس و خزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ گرد و پیش کے عرب قبائل میں سے بھی جو لوگ اسلام کی اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں وہ سب مدینے کی اسلامی برادری میں شامل ہو کر ایک ملت بنتے جا رہے ہیں۔ انہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ صدیوں سے اپنی سلامتی

اور اپنے مفادات کی ترقی کے لیے انہوں نے عرب قبیلوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا الّو سیدھا کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ اب اس نئے نظام میں نہ چل سکے گی، بلکہ اب ان کو عربوں کی ایک متحدہ طاقت سے سابقہ پیش آئے گا جس کے آگے ان کی چالیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

تیسرے یہ کہ معاشرے اور تمدن کی جو اصلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے اس میں کاروبار اور لین دین کے تمام ناجائز طریقوں کا سدِّ باب شامل تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سود کو بھی آپ ناپاک کمائی اور حرام خوری قرار دے رہے تھے جس سے انہیں خطرہ تھا کہ اگر عرب پر آپؐ کی فرمانروائی قائم ہو گئی تو آپ اسے قانوناً ممنوع کر دیں گے، اس میں ان کو اپنی موت نظر آتی تھی۔

ان وجوہ سے انہوں نے حضورؐ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنا لیا۔ آپؐ کو زک دینے کے لیے کوئی چال، کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تامل نہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک و شبہات اور وسوسے ڈالتے تھے تاکہ وہ اس دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جاتے تھے تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جا سکیں۔ فتنے برپا کرنے کے لیے منافقین سے سازباز کرتے تھے۔ ہر اس شخص اور گروہ اور قبیلے سے رابطہ پیدا کرتے تھے جو اسلام کا دشمن ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالتے اور ان کو آپس میں لڑا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ اوس اور خزرج کے لوگ خاص طور پر اُن کے ہدف تھے جن سے اُن کے مدتہائے دراز کے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ جنگِ بُعاث کے تذکرے چھیڑ چھیڑ کر وہ اُن کو پرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اُخوت کا وہ رشتہ تار تار ہو جائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا، مسلمانوں کو مالی حیثیت سے تنگ کرنے کے لیے بھی وہ ہر قسم کی دھاندلیاں کرتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا پہلے سے لین دین تھا، ان میں سے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اگر اس سے کچھ لینا ہوتا تو تقاضے کر کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتے، اور اگر اسے کچھ دینا ہوتا تو اس کی رقم مار کھاتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ جب ہم نے تم سے معاملہ کیا تھا اس وقت تمہارا دین کچھ اور تھا، اب چونکہ تم نے اپنا دین بدل دیا ہے۔ اس لیے ہم پر تمہارا کوئی حق باقی نہیں ہے۔

اس کی متعدد مثالیں تفسیر طبری، نیسا بوری، تفسیر طبرسی اور تفسیر روح المعانی میں سورۂ آل عمران آیت ۵، کی تشریح کرتے ہوئے نقل کی گئی ہیں۔

معاہدے کے خلاف یہ کھلی کھلی معاندانہ روش تو جنگِ بدر سے پہلے ہی وہ اختیار کر چکے تھے مگر جب بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش پر فتحِ مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اٹھے اور اُن کے بغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اِس لیے انہوں نے فتحِ اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینہ میں یہ افواہیں اُڑانی شروع کر دی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے اور مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی اور اب ابوجہل کی قیادت میں قریش کا لشکر مدینے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے لیکن جب نتیجہ ان کی امیدوں اور تمناؤں کے خلاف نکلا تو وہ غم اور غصّے کے مارے پھٹ پڑے۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چیخ اُٹھا کہ خدا کی قسم اگر محمدؐ نے اِن اشرافِ عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔" پھر وہ مکہ پہنچا اور بدر میں جو سردارانِ قریش مارے گئے تھے اُن کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکہ والوں کو انتقام پر اُکسایا۔ پھر مدینے واپس آکر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفاء کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہارِ عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اُس کی شرارتوں سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاوّل ۳ھ میں محمد بن مَسلمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا (ابنِ سعد، ابنِ ہشام، تاریخ طبری)

یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگِ بدر کے بعد کھلم کھلا اپنا معاہدہ توڑ دیا، بنی قَینُقاع تھا، یہ لوگ خود شہر مدینہ کے اندر ایک محلے میں آباد تھے اور چونکہ یہ سنہار، لوہار اور ظروف ساز تھے، اِس لیے اِن کے بازار میں اہلِ مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردانِ جنگی ان کے اندر موجود تھے اور ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلۂ خزرج سے ان کے پُرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ بن اُبی اُن کا پشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والے مسلمانوں کو ستانا اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ان کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو برسرِ عام برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت

جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلہ میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر کے آپؐ نے ان کو راہِ راست پر آنے کی تلقین فرمائی، مگر انہوں نے جواب دیا۔ "اے محمدؐ، تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم نے انہیں مار لیا۔ ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔" گویا صاف صاف اعلانِ جنگ تھا۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال (اور بروایت بعض ذی القعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلہ کا محاصرہ کر لیا۔ صرف چند روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے تمام قابلِ جنگ آدمی باندھ لیے گئے۔ اب عبداللہ بن اُبَیّ ان کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپ انہیں معاف کر دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کی درخواست قبول کر کے یہ فیصلہ فرما دیا کہ بنی قینُقاع اپنا سب مال، اسلحہ، اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینے سے نکل جائیں۔ (ابنِ سعد، ابنِ ہشام، تاریخ طبری)

ان دو سخت اقدامات (یعنی بنی قینقاع کے اخراج اور کعب بن اشرف کے قتل) سے کچھ مدت تک یہودی اتنے خوفزدہ رہے کہ انہیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد شوال ۳ھ میں قریش کے لوگ جنگِ بدر کا بدلہ لینے کے لیے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینے پر چڑھ کر آئے اور ان یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کے لیے نکلے ہیں اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں تو انہوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اس طرح کی کہ مدینہ کی مدافعت میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوئے، حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکۂ اُحُد میں مسلمانوں کو نقصانِ عظیم پہنچا تو ان کی جراتیں اور بڑھ گئیں۔ یہاں تک کہ بنی نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہو گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بئرِ معونہ کے سانحہ (صفر ۴ھ) کے بعد عَمرو بن اُمیّہ ضَمری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غلطی سے بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا جو دراصل ایک معاہد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، مگر عمروؓ نے ان کو دشمن قبیلہ کے آدمی سمجھ لیا تھا۔ اس غلطی کی وجہ سے ان کا خون بہا مسلمانوں پر واجب آگیا تھا اور چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدے میں بنی نضیر بھی شریک تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ

کے ساتھ خود اُن کی بستی میں تشریف لے گئے تاکہ خونبہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔ وہاں انہوں نے آپ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اُس مکان کی چھت پر سے آپؐ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرادے جس کی دیوار کے سائے میں آپؐ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بر وقت خبردار کر دیا اور آپ فوراً وہاں سے اُٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔ حضورؐ نے ان کو بلا تاخیر یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آگئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ، اس کے بعد اگر تم یہاں ٹھیرے رہے تو جو شخص بھی تمہاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن اُبَیّ نے اُن کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا اور بنی قُرَیظہ اور بنی غطفان بھی تمہاری مدد کو آئیں گے، تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس جھوٹے بھروسے پر انہوں نے حضورؐ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ اس پر ربیع الاوّل ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا اور صرف چند روز کے محاصرہ کے بعد (جس کی مدت بعض روایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آئی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے کے لیے راضی ہو گئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ بھی وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے لے جائیں گے۔ اسی طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرالی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھیر گئے، باقی شام اور خیبر کی طرف نکل گئے۔

یہی واقعہ ہے جس سے اس سورہ میں بحث کی گئی ہے۔

موضوع اور مضمون

سورۃ کا موضوع، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، جنگ بنی نَضِیر پر تبصرہ ہے۔ اس میں بحیثیت مجموعی چار مضامین بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ پہلی چار آیتوں میں دنیا کو اس انجام سے عبرت دلائی گئی ہے جو ابھی ابھی بنی نَضِیر نے دیکھا تھا۔ ایک بڑا قبیلہ جس کے افراد کی تعداد اُس وقت مسلمانوں کی تعداد سے کچھ کم نہ تھی، جو مال و دولت میں مسلمانوں سے بہت بڑھا ہوا تھا جس کے پاس جنگی سامان کی بھی کمی نہ تھی، جس کی گڑھیاں بڑی مضبوط

تھیں، صرف چند روز کے محاصرے کی تاب بھی نہ لاسکا اور بغیر اس کے کہ کسی ایک آدمی کے قتل کی بھی نوبت آئی ہوتی وہ اپنی صدیوں کی جمی جمائی بستی چھوڑ کر جلاوطنی قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ مسلمانوں کی طاقت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے نبرد آزما ہوئے تھے، اور جو لوگ اللہ کی طاقت سے ٹکرانے کی جرأت کریں وہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

۲- آیت ۵ میں قانونِ جنگ کا یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگی ضروریات کے لیے دشمن کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے وہ فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی۔

۳- آیت ۶ سے ۱۰ تک یہ بتایا گیا ہے کہ اُن ممالک کی زمینوں اور جائیدادوں کا بندوبست کس طرح کیا جائے جو جنگ یا صلح کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آئیں۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مفتوحہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اِس لیے یہاں اس کا قانون بیان کر دیا گیا۔

۴- آیت ۱۱ سے ۱۷ تک منافقین کے اُس رویہ پر تبصرہ کیا گیا ہے جو انہوں نے جنگِ بنی نضیر کے موقع پر اختیار کیا تھا اور اُن اسباب کی نشان دہی کی گئی ہے جو درحقیقت ان کے اِس رویہ کی تہ میں کام کر رہے تھے۔

۵- آخری رکوع پورا کا پورا ایک نصیحت ہے جس کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جو ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہوں، مگر ایمان کی اصل روح سے خالی رہیں۔ اس میں اُن کو بتایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل تقاضا کیا ہے۔ تقویٰ اور فسق میں حقیقی فرق کیا ہے۔ جس قرآن کو ماننے کا دعویٰ کر رہے ہیں اس کی اہمیت کیا ہے اور جس خدا پر ایمان لانے کا وہ اقرار کرتے ہیں وہ کن صفات کا حامل ہے۔

———— * ————

الممتحنۃ

نام اِس سورہ کی آیت نمبر ۱۰ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اِس کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔ اس کا تلفظ مُمْتَحَنَہ بھی کیا جاتا ہے اور مُمْتَحِنَہ بھی۔ پہلے تلفظ کے لحاظ سے معنیٰ ہیں "وہ عورت جس کا امتحان لیا جائے" اور دوسرے تلفظ کے لحاظ سے معنیٰ ہیں "امتحان لینے والی سورۃ"۔

زمانۂ نزول اِس میں دو ایسے معاملات پر کلام فرمایا گیا ہے جن کا زمانہ تاریخی طور پر معلوم ہے۔ پہلا حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا ہے جنھوں نے فتح مکہ سے کچھ مدت پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعہ سے قریش کے سرداروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارادے کی اطلاع بھیجی تھی کہ آپ ان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور دوسرا معاملہ اُن مسلمان عورتوں کا ہے جو صلح حُدَیبیہ کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے لگی تھیں اور ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شرائط صلح کی رُو سے مسلمان مَردوں کی طرح کیا ان عورتوں کو بھی کفار کے حوالہ کر دیا جائے؟ ان دو معاملات کے ذکر سے یہ بات قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ صلح حُدَیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا معاملہ بھی ہے جس کا ذکر سورۃ کے آخر میں آیا ہے، اور وہ یہ کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان سے کن باتوں کا عہد لیں۔ اِس حصّے کے متعلق بھی قیاس یہی ہے کہ یہ بھی فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوا ہے، کیونکہ فتح مکہ کے بعد قریش کے مردوں کی طرح اُن کی عورتیں بھی بہت بڑی تعداد میں بیک وقت داخلِ اسلام ہونے والی تھیں اور اسی موقع پر یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ اجتماعی طور پر اُن سے عہد لیا جائے۔

موضوع اور مباحث

اِس سورۃ کے تین حصے ہیں :-

پہلا حصہ آغازِ سورہ سے آیت ۹ تک چلتا ہے اور سورۃ کے خاتمے پر آیت ۱۳ بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حضرت حاطِب بن ابی بَلْتَعَہؓ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے محض اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے دشمنوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی جسے اگر بروقت ناکام نہ کر دیا گیا ہوتا تو فتح مکّہ کے موقع پر بڑا کشت و خون ہوتا، مسلمانوں کی بھی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوتیں، قریش کے بھی بہت سے وہ لوگ مارے جاتے جو بعد میں اسلام کی عظیم خدمات انجام دینے والے تھے، وہ تمام فوائد بھی ضائع ہو جاتے جو مکّہ کو پُرامن طریقے سے فتح کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے، اور اتنے عظیم نقصانات صرف اس وجہ سے ہوتے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اپنے بال بچوں کو جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اِس شدید غلطی پر تنبیہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی مومن کو کسی حال میں اور کسی غرض کے لیے بھی اسلام کے دشمن کافروں کے ساتھ محبّت اور دوستی کا تعلق نہ رکھنا چاہیے، اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو کفر و اسلام کی کشمکش میں کفّار کے لیے مفید ہو۔ البتہ جو کافر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عملاً دشمنی اور ایذا رسانی کا برتاؤ نہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا حصہ آیات ۱۰-۱۱ پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک اہم معاشرتی مسئلہ کا فیصلہ کیا گیا ہے جو اُس وقت بڑی پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔ مکّہ میں بہت سی مسلمان عورتیں ایسی تھیں جن کے شوہر کافر تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاتی تھیں۔ اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان مرد ایسے تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور وہ مکّہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ اُن کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اُن کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ فرما دیا کہ مسلمان عورت کے لیے کافر شوہر حلال نہیں ہے اور مسلمان مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ مشرک بیوی کو اپنے نکاح میں رکھے۔ یہ فیصلہ بڑے اہم قانونی نتائج رکھتا ہے جن کی تفصیل

ہم آگے اپنے حواشی میں بیان کریں گے۔

تیسرا حصّہ آیت ۱۲ پر مشتمل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں اُن سے آپ اُن بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو جاہلیتِ عرب کے معاشرے میں عورتوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں اور اس بات کا اقرار کرائیں کہ آئندہ وہ بھلائی کے اُن تمام طریقوں کی پیروی کریں گی جن کا حکم اللہ کے رسول کی طرف سے ان کو دیا جائے۔

الصّٓف

نام چوتھی آیت کے فقرے یُقَاتِلُوْنَ فِی سَبِیْلِہٖ صَفًّا سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ صف آیا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے اس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً جنگِ اُحُد کے متصل زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ اس کے بین السطور میں جن حالات کی طرف اشارہ محسوس ہوتا ہے وہ اُسی دور میں پائے جاتے تھے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع ہے مسلمانوں کو ایمان میں اخلاص اختیار کرنے اور اللہ کی راہ میں جان لڑانے پر اُبھارنا، اس میں ضعیف الایمان مسلمانوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور اُن لوگوں کو بھی جو ایمان کا جھوٹا دعویٰ کر کے اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور اُن کو بھی جو مخلص تھے۔ بعض آیات کا خطاب پہلے دونوں گروہوں سے ہے۔ بعض میں صرف منافقین مخاطب ہیں اور بعض کا روئے سخن صرف مخلصین کی طرف ہے۔ اندازِ کلام سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں کون مخاطب ہے۔

آغاز میں تمام ایمان لانے والوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں وہ لوگ جو کہیں کچھ اور کریں کچھ، اور نہایت محبوب ہیں وہ لوگ جو راہِ حق میں لڑنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہوں۔

پھر آیت ۵ سے ۷ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے رسول اور اپنے دین کے ساتھ تمہاری روش وہ نہ ہونی چاہیے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام

کے ساتھ بنی اسرائیل نے اختیار کی۔ حضرت موسٰی کو وہ خدا کا رسول جاننے کے باوجود جیتے جی تنگ کرتے رہے اور حضرت عیسٰی سے کھلی کھلی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود وہ ان کو جھٹلانے سے باز نہ آئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اُس قوم کے مزاج کا سانچا ہی ٹیڑھا ہو کر رہ گیا اور اس سے ہدایت کی توفیق سلب ہو گئی۔ یہ کوئی قابلِ رشک حالت نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوم اس میں مبتلا ہونے کی تمنا کرے۔

پھر آیت ۸-۹ میں پوری تحدّی کے ساتھ اعلان کیا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافقین اللہ کے اِس نُور کو بجھانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لیں، یہ پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں پھیل کر رہے گا اور مشرکین کو خواہ کتنا ہی ناگوار ہو، رسولِ برحق کا لایا ہوا دین ہر دوسرے دین پر غالب آکر رہے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۰-۱۳ میں اہلِ ایمان کو بتایا گیا ہے کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ آخرت میں اس کا ثمرہ خدا کے عذاب سے نجات، گناہوں کی مغفرت اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنّت کا حصول ہے، اور دنیا میں اس کا انعام خدا کی تائید و نصرت اور فتح و ظفر ہے۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تلقین کی گئی ہے کہ جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ان کا ساتھ دیا تھا اُسی طرح وہ بھی "انصار اللہ" بنیں تاکہ کافروں کے مقابلہ میں اُن کو بھی اُسی طرح اللہ کی تائید حاصل ہو جس طرح پہلے ایمان لانے والوں کو حاصل ہوئی تھی۔

الجُمُعَة

نام

آیت ۹ کے فقرے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اس سُورہ میں نمازِ جمعہ کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، لیکن "جمعہ" بحیثیتِ مجموعی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ دوسری سُورتوں کے ناموں کی طرح یہ نام بھی علامت ہی کے طور پر ہے۔

زمانۂ نزول

پہلے رکوع کا زمانۂ نزول ۷ھ ہے اور غالباً یہ فتح خیبر کے موقع پر یا اس کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، اور ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم حضورؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جب یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ صلح حُدَیبیہ کے بعد اور فتح خیبر سے پہلے ایمان لائے تھے، اور خیبر کی فتح ابن ہشام کے بقول محرّم اور ابن سعد کے بقول جمادی الاُولیٰ ۷ھ میں ہوئی ہے۔ پس قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہودیوں کے اس آخری گڑھ کو فتح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائی ہوں گی، یا پھر ان کا نزول اس وقت ہوا ہوگا جب خیبر کا انجام دیکھ کر شمالی حجاز کی تمام یہودی بستیاں اسلامی حکومت کی تابع فرمان بن گئی تھیں۔

دوسرا رکوع ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہے کیونکہ حضورؐ نے مدینۂ طیبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، اور اس رکوع کی آخری آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اقامتِ جمعہ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد لازماً کسی ایسے زمانے ہی میں پیش آیا ہوگا جب لوگوں کو دینی اجتماعات کے آداب کی پوری تربیت ابھی نہیں ملی تھی۔

موضوع اور مضامین

جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اس سورہ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں، اسی لیے دونوں کے موضوع الگ ہیں اور مخاطب بھی الگ۔ اگرچہ ان کے درمیان ایک نوع کی مناسبت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک سورہ میں جمع کیا گیا ہے لیکن مناسبت سمجھنے سے پہلے ہمیں دونوں کے موضوعات کو الگ الگ سمجھ لینا چاہیے

پہلا رکوع اُس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے پچھلے چھ سال کے دوران میں انہوں نے کی تھیں۔ پہلے مدینہ میں ان کے تین تین طاقتور قبیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پوری طرح تباہ ہو گیا ہے اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے۔ مگر غزوۂ احزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڑھ خیبر رہ گیا تھا جہاں مدینے سے نکلے ہوئے یہودیوں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ ان آیات کے نزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہو گیا اور یہودیوں نے خود درخواست کر کے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیا۔ اس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک، سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اُسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار، جس کا نام سننا تک انہیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ایک مرتبہ پھر اُن کو خطاب فرمایا اور غالباً یہ آخری خطاب تھا جو قرآن مجید میں ان سے کیا گیا۔ اس میں انہیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔

۱۔ تم نے اِس رسول کو اِس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اُس قوم میں مبعوث ہوا تھا۔ جسے تم حقارت کے ساتھ "اُمی" کہتے ہو، تمہارا زعم باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمہاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمہاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے، کیونکہ یہ منصب تمہاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور "اُمیوں" میں کبھی کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن اللہ نے انہی اُمیوں میں سے ایک رسول اُٹھایا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اُس کی کتاب سنا رہا ہے، نفوس کا تزکیہ کر رہا ہے اور ان لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔

یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔ اُس کے فضل پر تمہارا اجارہ نہیں ہے، جسے تم دلوانا چاہو اسی کو وہ دے اور جسے تم محروم رکھنا چاہو اسے وہ محروم رکھے۔

(۲) تم کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی، نہ ادا کی، تمہارا حال اُس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کس چیز کا بار اُٹھائے ہوئے ہے، بلکہ تمہاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا۔ مگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے اور اس پر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھ دی گئی ہے، گویا تمہاری رائے یہ ہے کہ تم خواہ اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو، بہرحال اللہ اس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمہارے سوا کسی کو نہ بنائے۔

(۳) تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمہیں اگر یقین ہوتا کہ اُس کے ہاں تمہارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمہیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو، تمہاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو، تمہارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مروگے تو اللہ کے ہاں اُس سے زیادہ ذلیل و خوار ہوگے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔

یہ ہے پہلے رکوع کا مضمون، اس کے بعد دوسرا رکوع جو کئی سال پہلے نازل ہوا تھا، اس سورہ میں لا کر اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سبت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جمعہ عطا فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرمانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا۔ یہ رکوع اُس وقت نازل ہوا تھا جب مدینے میں ایک روز عین نمازِ جمعہ کے وقت ایک تجارتی قافلہ آیا اور اس کے ڈھول تاشوں کی آواز سن کر ۱۲ آدمیوں کے سوا تمام حاضرین مسجد نبویؐ سے قافلے کی طرف دوڑ گئے۔ حالانکہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس پر یہ حکم دیا گیا کہ جمعہ کی اذان ہونے کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت اور ہر دوسری مصروفیت حرام ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اُس وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے

ذکر کی طرف دوڑیں، البتہ جب نماز ختم ہو جائے تو انہیں حق ہے کہ اپنے کاروبار چلانے کے لیے زمین میں پھیل جائیں۔ احکام جمعہ کے بارے میں یہ رکوع ایک مستقل سورۃ بھی بنایا جا سکتا تھا اور کسی دوسری سورۃ میں بھی شامل کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا کرنے کے بجائے خاص طور پر اُسے یہاں اُن آیات کے ساتھ لاکر ملایا گیا جن میں یہودیوں کو اُن کے انجام بد کے اسباب پر متنبہ کیا گیا ہے۔ اس کی حکمت ہمارے نزدیک وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔

———*———

الْمُنٰفِقُوْن

نام پہلی آیت کے فقرے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں منافقین ہی کے طرزِ عمل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ سورۃ غزوہ بنی المُصْطَلِق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یا تو دورانِ سفر میں نازل ہوئی ہے، یا حضور کے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اس کا نزول ہوا ہے، اور ہم سورۂ نور کے دیباچہ میں یہ بات تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ غزوہ بنی المُصطلِق شعبان ۶ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس طرح اس کی تاریخِ نزول ٹھیک ٹھیک متعین ہو جاتی ہے۔

تاریخی پس منظر جس خاص واقعہ کے بارے میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مدینے کے منافقین پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ جو واقعہ اُس موقع پر پیش آیا تھا وہ محض ایک حادثہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا سلسلۂ واقعات تھا جو بالآخر اس نوبت تک پہنچا۔

مدینۂ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اَوس اور خزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت و سیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاج پوشی کی رسم ادا کریں۔ حتیٰ کہ اس کے لیے تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔ یہ قبیلۂ خزرج کا ایک رئیس عبداللہ بن اُبَیّ بن سَلُول تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ خزرج میں اس کی بزرگی بالکل متفق علیہ تھی، اور اَوس و خزرج اس سے پہلے کبھی ایک شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے۔ (ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۳۴)

اِس صورتِ حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے با اثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینۂ طیبہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ اُس وقت حضرت عباس بن عُبادہ بن نَضلہؓ انصاری اِس دعوت کو صرف اس مصلحت سے مؤخر کرنا چاہتے تھے کہ عبد اللہ بن اُبَیّ بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے تاکہ مدینہ بالاتفاق اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا اس نے اس مصلحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکاء میں دونوں قبیلوں کے ۷۵ آدمی شامل تھے۔ ہر خطرہ مول لے کر حضورؐ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے (ابن ہشام ج ۲، ص ۸۹) اِس واقعہ کی تفصیلات ہم سورۂ انفال کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

اِس کے بعد جب حضورؐ مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبد اللہ بن اُبَیّ بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اِس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اُن بہت سے حامیوں کے ساتھ، جن میں دونوں قبیلوں کے شیوخ اور سردار شامل تھے، داخلِ اسلام ہو گیا، حالانکہ دل ان سب کے جل رہے تھے اور خاص طور پر ابنِ اُبَیّ کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبد اللہ بن اُبَیّ اُٹھ کر کہتا کہ "حضرات، یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے، لہٰذا آپ ان کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سُنیں اور ان کی اطاعت کریں۔" (ابنِ ہشام جلد ۳ صفحہ ۱۱۱) دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور گروہِ اہلِ ایمان سے سخت بغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابن اُبَیّ نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپ نے حضرت سعد بن عُبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ، اس شخص کے ساتھ نرمی برتیے۔ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاجِ شاہی تیار کر رہے

تھے، اب یہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے۔" (ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۳۷-۲۳۸)

جنگ بدر کے بعد جب یہود بنی قَینُقاع کی صریح بد عہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر چڑھائی کی تو یہ شخص اُن کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کی زرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ "یہ سات سو مردانِ جنگی جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپ انہیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں، خدا کی قسم، میں آپ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔" (ابن ہشام، ج ۳، ص ۵۱، ۵۲)

جنگِ اُحُد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے اُلٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔ ان ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضورؐ کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریکِ کار تھے۔ اسی بنا پر جنگِ اُحد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضورؐ کے خطبہ سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ، تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔" مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ علانیہ اِس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا "یہ کیا حرکت کر رہے ہو، واپس چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرو۔" اس نے بگڑ کر جواب دیا "میں ان سے کوئی استغفار نہیں کرانا چاہتا۔" (ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۱۱)

۴ھ میں غزوۂ بنی النَّضِیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور دوسری طرف یہ

منافقین اندر رہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود کھول دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کے دوسرے دور میں گزر چکا ہے۔

لیکن اُس کی اور اُس کے ساتھیوں کی اتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتھا اس کے ساتھ تھا۔ اَوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اُس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوۂ اُحُد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے ان دشمنوں سے بھی جنگ مول لے لی جاتی۔ اسی بنا پر اُن کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضورؐ ایک مدت تک ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے، نہ ہمت کہ علانیہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لیتے، یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ مل کر کھلّم کھلا میدان میں آجاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی آیات ۱۲-۱۴ میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اِس لیے وہ مسلمان بنے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے وہ لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو اُن نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے اور فتنہ پردازی کے اُن مواقع سے بھی فائدہ اُٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انہیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھی منافقین کو غزوۂ بنی المصطلق کی مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اُٹھا دیے جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے، مگر قرآنِ پاک کی تعلیم اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اہلِ ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اُس کی بدولت ان دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہوگیا، اور یہ منافقین اُلٹے خود ہی رسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے اور دوسرا فتنہ یہ ہے جس کا اس سورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اِس واقعہ کو بخاری، مُسلم، احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ، عبدالرزاق، ابن جریر طبری، ابن سعد اور محمد بن اسحاق نے بکثرت سندوں سے نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں اُس مہم کا نام نہیں لیا گیا ہے جس میں یہ پیش آیا تھا: اور بعض میں اسے غزوۂ تبوک کا واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر مغازی اور سیَر کے علما اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ غزوۂ بنی المُصطلق کے موقع پر پیش آیا تھا صورتِ واقعہ تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے:۔

بنی المُصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکرِ اسلام اُس بستی میں ٹھیرا ہوا تھا جو مُریسیع نامی کنویں پر آباد تھی کہ یکایک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہوگیا۔ ان میں سے ایک کا نام جہجاہ بن مسعود غفاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور اُن کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے اور دوسرے صاحب سنان بن وَبر الجُہَنی لے تھے۔ جن کا قبیلہ خزرج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا۔ زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ اور جہجاہ نے سنان کے ایک لات رسید کر دی جسے اپنی قدیم یمنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا اور جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابن اُبَی نے اس جھگڑے کی خبر سنتے ہی اوس اور خزرج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ اُدھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے، قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی اور اُسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے، اور اُسے شکست دے کر ابھی اُسی کے علاقے میں ٹھیرے ہوئے تھے، لیکن یہ شور سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے اور آپ نے فرمایا: مابالُ دعوی الجاھلیة؟ مالکم ولدعوة الجاھلیة؟ دعوھا فانھا مُنتِنَة ـــ "یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں؟ اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اسے چھوڑ دو یہ بڑی گندی چیز

لے دونوں اصحاب کے نام مختلف روایات میں مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے یہ نام ابن ہشام کی روایت سے لیے ہیں۔

ہے۔[1] اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سنان نے جہجاہ کو معاف کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نفاق تھا، عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس پہنچا اور ان لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ "اب تک تو تم سے اُمیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافعت کر رہے تھے، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلے میں ان کنگلوں[2] کے مددگار بن گئے ہو۔" ابن اُبَیّ پہلے ہی کھول رہا تھا۔ ان

---

[1] یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو اس موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمائی۔ اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی اگر اپنے جھگڑے میں لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہیں تو وہ کہیں مسلمانو، آؤ اور ہماری مدد کرو، یا یہ کہ لوگو، ہماری مدد کے لیے آؤ۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے قبیلے، یا برادری یا نسل و رنگ، یا علاقے کے نام پر لوگوں کو پکارتا ہے تو یہ جاہلیت کی پکار ہے اور اس پکار پر لبیک کہہ کر آنے والے اگر یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اور حق و انصاف کی بنا پر مظلوم کی حمایت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروہ کے آدمی کی حمایت میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں تو یہ جاہلیت کا فعل ہے جس سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گندی اور گھناؤنی چیز قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تمہارا اس جاہلیت کی پکار سے کیا واسطہ؟ تم اسلام کی بنیاد پر ایک ملت بنے تھے، اب یہ انصار اور مہاجر کے نام پر تمہیں کیسے پکارا جا رہا ہے، اور اس پکار پر تم کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ علامہ سُہَیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ فقہائے اسلام نے کسی جھگڑے یا اختلاف میں جاہلیت کی پکار بلند کرنے کو ایک فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ ایک گروہ اس کی سزا پچاس ضرب تازیانہ قرار دیتا ہے، دوسرا گروہ پچاس ضرب تجویز کرتا ہے، اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کی سزا حالات کی مناسبت سے دی جانی چاہیے۔ بعض حالات میں صرف زجر و توبیخ کافی ہے۔ بعض دوسرے حالات میں ایسی پکار بلند کرنے والے کو قید کرنا چاہیے اور اگر یہ زیادہ شر انگیز ہو تو اس کے مرتکب کو سزائے تازیانہ دینی چاہیے۔

[2] مدینہ کے منافقین اُن تمام لوگوں کو جو اسلام قبول کر کر کے مدینہ میں آ رہے تھے "جلابیب" کہا کرتے تھے۔ لغوی معنی تو اس لفظ کے گلیم پوش یا موٹے جھوٹے کپڑے پہننے والے کے ہیں۔ مگر اصل مفہوم جس میں وہ لوگ غریب مہاجرین کی تذلیل کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے، کنگلے کے لفظ سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا "یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی حریف بن گئے۔ ہماری اور ان قریش کے کنگلوں (یا اصحاب محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔"

مجلس میں اتفاق سے حضرت زید بن ارقم بھی موجود تھے جو اس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں سن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے جو کچھ سنا تھا من وعن دہرا دیا۔[1] حضورؐ نے فرمایا شاید تم ابن اُبیّ سے ناراض ہو، ممکن ہے تم سے سننے میں کچھ غلطی ہوگئی ہو، ممکن ہے تمہیں شبہ ہوگیا ہو کہ ابن اُبیّ یہ کہہ رہا ہے، مگر زید نے عرض کیا۔ نہیں حضورؐ، خدا کی قسم میں نے اس کو یہ باتیں کہتے سنا ہے۔ اس پر حضورؐ نے ابن اُبیّ کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضورؐ، لڑکے کی بات ہے، شاید اسے وہم ہوگیا ہو، یہ ہمارا شیخ اور بزرگ ہے، اس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زید کو بھی ملامت کی کہ وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضورؐ زید کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن اُبیّ کو بھی، اس لیے آپ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے آکر عرض کیا "مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ یا اگر مجھے یہ اجازت دینا مناسب خیال نہیں فرماتے تو خود انصار ہی میں سے معاذ بن جبل یا عبّاد بن بشر، یا سعد بن معاذ، یا محمد بن مَسلمہ کو حکم دیجیے[2] کہ وہ اسے قتل کر دیں۔" مگر حضورؐ نے

---

[1] فقہاء نے اس سے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ ایک شخص کی بری بات دوسرے شخص تک پہنچانا اگر کسی دینی، اخلاقی یا ملّی مصلحت کے لیے ہو تو یہ چغلی کی تعریف میں نہیں آتا۔ شریعت میں جس چغل خوری کو حرام کیا گیا ہے وہ فساد کی غرض سے اور لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لیے چغلی کھانا ہے۔

[2] مختلف روایات میں مختلف انصاری بزرگوں کے نام آئے ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے عرض کیا

فرمایا" ایسا نہ کرو۔ لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو ہی قتل کر رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضورؐ کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل ۳۰ گھنٹے چلتے رہے، یہاں تک کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے، پھر آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر ٹکاتے ہی سو گئے۔ یہ آپ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مُریسیع کے کنوئیں پر پیش آیا تھا اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائیں۔ راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اُسید بن حُضَیر آپؐ سے ملے اور عرض کیا" یا رسول اللہ، آج آپ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لیے موزوں نہ تھا۔ اور آپؐ کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟" حضورؐ نے جواب دیا۔ "تم نے سنا نہیں کہ تمہارے ان صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟" انہوں نے پوچھا "کون صاحب؟" فرمایا "عبداللہ بن اُبَیّ۔" انہوں نے پوچھا" اس نے کیا کہا؟" فرمایا "اس نے کہا ہے کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔" انہوں نے عرض کیا" یا رسول اللہ، خدا کی قسم عزت والے تو آپ ہیں اور ذلیل وہ ہے۔ آپ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں۔"

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابن ابی اُبَیّ کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابن اُبَیّ سے کہا جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگے مگر اس نے ترُخ کر جواب دیا۔ "تم نے کہا کہ ان پر ایمان لاؤ، میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں" ان باتوں سے اس کے خلاف مومنینِ انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اُس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن اُبَیّ کے صاحبزادے جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، تلوار سُونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے "آپ نے کہا تھا کہ مدینہ واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم آپ مدینے میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اجازت نہ دیں۔"

تھا کہ آپ ان میں سے کسی شخص سے یہ خدمت لیں اگر مجھ سے اس لیے یہ کام لینا مناسب خیال نہیں فرماتے کہ میں مہاجر ہوں، میرے ہاتھوں اس کے مارے جانے سے فتنے بھڑک اُٹھنے کا امکان ہے۔

اس پر ابن اُبَی چیخ اُٹھا۔ "خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔" لوگوں نے یہ خبر حضورؐ تک پہنچائی اور آپؐ نے فرمایا۔ "عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے۔" عبداللہ نے کہا۔ "اُن کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "کیوں عمرؓ، اب تمہارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اس کو قتل کرنے کی اجازت دیجیے، اُس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑک اٹھتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل تک کیا جا سکتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا "خدا کی قسم اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی۔[۱]

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ سورت، اغلب یہ ہے کہ حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

---

[۱] اس سے دو اہم شرعی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ جو طرزِ عمل ابن اُبَی نے اختیار کیا تھا، اگر کوئی شخص مسلم ملت میں رہتے ہوئے اُس طرح کا رویہ اختیار کرے تو وہ قتل کا مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قانوناً کسی شخص کے مستحقِ قتل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرور اسے قتل کر ہی دیا جائے۔ ایسے کسی فیصلے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کا قتل کسی عظیم تر فتنے کا موجب تو نہ بن جائے گا۔ حالات سے آنکھیں بند کر کے قانون کا اندھا دُھند استعمال بعض اوقات اُس مقصد کے خلاف بالکل الٹا نتیجہ پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے قانون استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک منافق اور مفسد آدمی کے پیچھے کوئی قابلِ لحاظ سیاسی طاقت موجود ہو تو اسے سزا دے کر مزید فتنوں کو سر اُٹھانے کا موقع دینے سے بہتر یہ ہے کہ حکمت اور تدبّر کے ساتھ اُس اصل سیاسی طاقت کا استیصال کر دیا جائے جس کے بل پر وہ شرارت کر رہا ہو۔ یہی مصلحت تھی جس کی بنا پر حضورؐ نے عبداللہ بن اُبَی کو اس وقت بھی سزا نہ دی جب آپ اسے سزا دینے پر قادر تھے، بلکہ اُس کے ساتھ برابر نرمی کا سلوک کرتے رہے، یہاں تک کہ دو تین سال کے اندر مدینہ میں منافقین کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

التَّغَابُن

نام آیت نمبر ۹ کے فقرے ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُن سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورۃ جس میں لفظ تغابُن آیا ہے۔

زمانۂ نزول مقاتل اور کلبی کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ مکّی ہے اور کچھ مدنی۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ ابتدا سے آیت ۱۳ تک مکّی ہے اور آیت ۱۴ سے آخر سورۃ تک مَدنی۔ مگر مفسرین کی اکثریت پوری سورۃ کو مَدنی قرار دیتی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے اس کا زمانۂ نزول متعین کیا جا سکتا ہو لیکن مضمونِ کلام پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ مدینۂ طیبہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس میں کچھ رنگ مکّی سورتوں کا سا اور کچھ مَدنی سورتوں کا سا پایا جاتا ہے۔

موضوع اور مضمون اس سورہ کا موضوع ایمان وطاعت کی دعوت اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم ہے۔ کلام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلی چار آیتوں کا خطاب تمام انسانوں سے ہے، پھر آیت ۵ سے ۱۰ تک اُن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو قرآن کی دعوت کو نہیں مانتے، اور اس کے بعد نمبر ۱۱ سے آخر تک کی آیات کا رُوئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس دعوت کو مانتے ہیں۔

تمام انسانوں کو خطاب کر کے چند فقروں میں انہیں چار بنیادی حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے:۔

اوّل یہ کہ یہ کائنات، جس میں تم رہتے ہو، بے خدا نہیں ہے، بلکہ اس کا خالق اور مالک اور

فرمانروا ایک ایسا قادرِ مطلق خدا ہے جس کے کامل اور بے عیب ہونے کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں ہے، بلکہ اس کے خالق نے اِسے سَراسر برحق پیدا کیا ہے، یہاں اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ایک فضول تماشا ہے جو عبث ہی شروع ہوا اور عبث ہی ختم ہو جائے گا۔

تیسرے یہ کہ تمہیں جس بہترین صورت کے ساتھ خدا نے پیدا کیا ہے اور پھر جس طرح کفر و ایمان کا اختیار تم پر چھوڑ دیا ہے، یہ کوئی لاحاصل اور لایعنی کام نہیں ہے کہ تم خواہ کفر اختیار کرو یا ایمان دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ دراصل خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتے ہو۔

چوتھے یہ کہ تم ایک غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں ہو۔ آخر کار تمہیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے، اور اُس ہستی سے تمہیں سابقہ پیش آنا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے واقف ہے، جس سے تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے، جس پر دِلوں کے چھپے ہوئے خیالات تک روشن ہیں۔

کائنات اور انسان کی حقیقت کے بارے میں یہ چار بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد کلام کا رُخ اُن لوگوں کی طرف مڑتا ہے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اور اُنہیں تاریخ کے اِس منظر کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو پوری انسانی تاریخ میں مسلسل نظر آتا ہے کہ قوموں پر قومیں اُٹھتی ہیں، اور بالآخر تباہی سے دوچار ہوتی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے اس منظر کی ہزار توجیہیں کرتا رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اصل حقیقت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب صرف دو تھے۔

ایک یہ کہ اس نے جن رسولوں کو اُن کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا، اُن کی بات ماننے سے انہوں نے انکار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ خود ہی اپنے فلسفے گھڑ گھڑ کر ایک گمراہی سے دوسری گمراہی میں بھٹکتے چلی گئیں۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے آخرت کے عقیدے کو بھی رَد کر دیا اور اپنے زُعم میں یہ سمجھ لیا کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے جس میں ہمیں اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہو۔ اس چیز نے ان کے پورے رویۂ زندگی کو بگاڑ کر رکھ دیا اور

ان کے اخلاق و کردار کی گندگی اس حد تک بڑھتی چلی گئی کہ آخر کار خدا کے عذاب ہی نے آکر دنیا کو ان کے وجود سے پاک کیا۔

تاریخِ انسانی کے یہ دو سبق آموز حقائق بیان کر کے منکرین حق کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ہوش میں آئیں اور اگر پچھلی قوموں کا سا انجام نہیں دیکھنا چاہتے تو اللہ اور اُس کے رسول اور اُس نورِ ہدایت پر ایمان لے آئیں جو اللہ نے قرآن مجید کی صورت میں نازل فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آخر کار وہ دن آنے والا ہے جب تمام اوّلین و آخرین ایک جگہ جمع کیے جائیں گے اور تم میں سے ہر ایک کا غبن سب کے سامنے کھل جائے گا۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام انسانوں کی قسمت کا فیصلہ اسی بنیاد پر کیا جائے گا کہ ایمان و عملِ صالح کی راہ کس نے اختیار کی تھی، اور کفر و تکذیب کی راہ پر کون چلا تھا۔ پہلا گروہ ابدی جنت کا حق دار ہوگا اور دوسرے گروہ کے حصے میں دائمی جہنم آئے گی۔

اِس کے بعد ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کو مخاطب کر کے چند اہم ہدایات اُنھیں دی جاتی ہیں :-

ایک یہ کہ دنیا میں جو مصیبت بھی آتی ہے، اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ ایسے حالات میں جو شخص ایمان پر ثابت قدم رہے، اللہ اُس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے، ورنہ گھبراہٹ یا جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو کر جو آدمی ایمان کی راہ سے ہٹ جائے، اس کی مصیبت تو اللہ کے اذن کے بغیر دور نہیں ہو سکتی، البتہ وہ ایک اور مصیبت، جو سب سے بڑی مصیبت ہے، مول لے لیتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کا دل اللہ کی ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مومن کا کام صرف ایمان لے آنا ہی نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد اسے عملاً اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اطاعت سے اگر وہ روگردانی اختیار کرے گا تو اپنے نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پہنچا کر بری الذمہ ہو چکے ہیں۔

تیسرے یہ کہ مومن کا اعتماد اپنی طاقت یا دنیا کی کسی طاقت پر نہیں بلکہ صرف اللہ پر ہونا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ مومن کے لیے اُس کا مال اور اُس کے اہل و عیال ایک بہت بڑی آزمائش ہیں

کیونکہ زیادہ تر انہی کی محبت انسان کو ایمان وطاعت کی راہ سے منحرف کرتی ہے۔ اِس لیے اہلِ ایمان کو اپنے اہل وعیال سے ہوشیار رہنا چاہیے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کے حق میں راہِ خدا کے رہزن نہ بننے پائیں اور اُنہیں مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہیئے تاکہ اُن کا نفس زر پرستی کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

پانچویں یہ کہ ہر انسان اپنی استطاعت کی حد تک ہی مکلّف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کام کرے۔ البتہ مومن کو جس بات کی کوشش کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اپنی حد تک خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے میں وہ کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے اور اس کی گفتار، کردار اور معاملات اس کی اپنی کوتاہی کے باعث حدود اللہ سے متجاوز نہ ہو جائیں۔

———*———

اَلطَّلَاق

نام

اس سورہ کا نام ہی الطلاق نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں طلاق ہی کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اسے سورۃ النساءِ القُصرٰی بھی کہا ہے، یعنی چھوٹی سورۂ نساء۔

زمانۂ نزول

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صراحت فرمائی ہے، اور سورۃ کے مضمون کی اندرونی شہادت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ اس کا نزول لازماً سورۂ بقرہ کی اُن آیات کے بعد ہوا ہے جن میں طلاق کے احکام پہلی مرتبہ دیے گئے تھے۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے۔ بہرحال روایات سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب سورۂ بقرہ کے احکام کو سمجھنے میں لوگ غلطیاں کرنے لگے اور عملاً بھی اُن سے غلطیوں کا صدور ہونے لگا، تب اللہ تعالیٰ نے اُن کی اصلاح کے لیے یہ ہدایات نازل فرمائیں۔

موضوع اور مضمون

اس سورۃ کے احکام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن ہدایات کو پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے جو طلاق اور عدت کے متعلق اس سے پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکی ہیں۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ ۲۲۹)

"طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے۔"

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ .... وَبُعُوْلَتُهُنَّ

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (البقرہ - ۲۲۸) "اور مطلقہ عورتیں (طلاق کے بعد) تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں...... اور اُن کے شوہر اس مدت میں اُن کو اپنی (زوجیت) میں) واپس لے لینے کے حق دار ہیں اگر وہ اصلاح پر آمادہ ہوں۔"

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ... (البقرہ ۲۳۰)-

"پھر اگر وہ (تیسری بار) اُس کو طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اُس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ اس عورت کا نکاح کسی اور سے ہو جائے......"

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب - ۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کرسکو۔"

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ - ۲۳۴) "اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں چار مہینے دس دن تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔"

ان آیات میں جو قواعد مقرر کیے گئے تھے وہ یہ تھے:-

(۱) ایک مرد زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے سکتا ہے۔

(۲) ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق رہتا ہے اور عدت گزر جانے کے بعد وہی مرد و عورت پھر نکاح کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اس کے لیے تحلیل کی کوئی شرط نہیں ہے لیکن اگر مرد تین طلاق دے دے تو عدت کے اندر رجوع کا حق ساقط ہو جاتا ہے، اور دوبارہ نکاح بھی اُس وقت نہیں ہو سکتا جب تک عورت کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو جائے اور وہ بھی اپنی مرضی سے اس کو طلاق نہ دے دے۔

(۳) مدخولہ عورت، جس کو حیض آتا ہو، اُس کی عدت یہ ہے کہ اُسے طلاق کے بعد تین مرتبہ حیض آجائے۔ ایک طلاق یا دو طلاق کی صورت میں اس عدت کے معنی یہ ہیں کہ عورت ابھی تک اُس شخص کی زوجیت میں ہے اور وہ عدت کے اندر اُس سے رجوع کرسکتا ہے لیکن اگر مرد تین طلاق

دے چکا ہو تو یہ عدّت رجوع کی گنجائش کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اِس لیے ہے کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے عورت کسی اور شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔

(۴) غیر مدخولہ عورت، جسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے، اُس کے لیے کوئی عدّت نہیں ہے، وہ چاہے تو طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔

(۵) جس عورت کا شوہر مَر جائے اس کی مدّت چار مہینے دس دن ہے۔

اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ سورۂ طلاق ان قواعد میں سے کسی قاعدے کو منسوخ کرنے یا اُس میں ترمیم کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ دو مقاصد کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو طلاق کا جو اختیار دیا گیا ہے اسے استعمال کرنے کے ایسے حکیمانہ طریقے بتائے جن سے حتی الامکان علیحدگی کی نوبت نہ آنے پائے، اور علیحدگی ہو تو بدرجۂ آخر ایسی حالت ہو جبکہ باہمی موافقت کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہوں، کیونکہ خدا کی شریعت میں طلاق کی گنجائش صرف ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر رکھی گئی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اس بات کو سخت ناپسند فرماتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جو ازدواجی تعلق قائم ہو چکا ہو وہ پھر کبھی ٹوٹ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ما احلّ اللہ شیئاً ابغض الیہ من الطلاق "اللہ نے کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کیا ہے جو طلاق سے بڑھ کر اسے ناپسند ہو۔" (ابوداؤد) اور ابغض الحلال الی اللہ عزّ و جلّ الطلاق "تمام حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔" (ابوداؤد)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے احکام کے بعد جو مزید مسائل جواب طلب باقی رہ گئے تھے ان کا جواب دے کر اسلام کے عائلی قانون کے اِس شعبہ کی تکمیل کر دی جائے۔ اِس سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن مدخولہ عورتوں کو حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا جنہیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، طلاق کی صورت میں ان کی عدّت کیا ہوگی، اور جو عورت حاملہ ہو اسے اگر طلاق دے دی جائے یا اس کا شوہر مَر جائے تو اس کی عدّت کی مدّت کیا ہے، اور مختلف قسم کی مطلّقہ عورتوں کے نفقہ اور سکونت کا انتظام کس طرح ہوگا اور جس بچّے کے والدین طلاق کے ذریعہ سے الگ ہو چکے ہوں اس کی رضاعت کا انتظام کس طرح کیا جائے۔

التَّحرِیم

نام

پہلی ہی آیت کے الفاظ لِمَ تُحَرِّمُ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اس کے مضامین کا عنوان نہیں بلکہ اس نام سے مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جس میں تحریم کے واقعہ کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول

اس میں تحریم کے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق احادیث کی روایات میں دو خواتین کا ذکر آیا ہے جو اُس وقت حضورؐ کے حرم میں تھیں۔ ایک حضرت صفیہؓ، دوسری حضرت ماریہ قبطیہؓ۔ ان میں سے ایک، یعنی حضرت صفیہؓ فتح خیبر کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں اور خیبر کی فتح بالاتفاق ۷ھ میں ہوئی ہے۔ دوسری خاتون حضرت ماریہؓ کو ۷ھ میں مصر کے فرمانروا مقوقس نے حضورؐ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور ان کے بطن سے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے یہ بات قریب قریب متعین ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کا نزول ۷ھ یا ۸ھ کے دُوران میں کسی وقت ہوا ہے۔

موضوع اور مُباحث

یہ ایک بڑی اہم سُورۃ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے متعلق بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند مہمات مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

ایک یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار خود اللہ کے نبیؐ کی طرف بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو، یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطور خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز

نبی بھی نہیں ہے، کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی سی بات بھی جو کسی دوسرے کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ اس کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاءِ الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے، تا کہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب بلکہ نبی کے اُسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائے اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشائے الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

تیسری بات جو مذکورہ بالا نکتہ سے خود بخود نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ذرا سی بات پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کر دی گئی بلکہ اسے ریکارڈ پر بھی لے آیا گیا، تو یہ چیز قطعی طور پر ہمارے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیتی ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں جو اعمال و افعال اور جو احکام و ہدایات بھی ہمیں اب ملتے ہیں، اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت یا اصلاح ریکارڈ پر موجود نہیں ہے وہ سراسر برحق ہیں، اور اللہ کی مرضی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی بات جو اس کلام میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس رسولِ مقدس کی عزت و حرمت کو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کے حق میں لازمۂ ایمان قرار دیتا ہے اُسی کے متعلق اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ اللہ کی حلال کی ہوئی ایک چیز اپنے اوپر حرام کر لی، اور جن ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ خود تمام اہلِ ایمان کی ماں قرار دیتا ہے اور جن کے احترام کا اس نے خود مسلمانوں کو حکم دیا ہے انہی کو اس نے بعض غلطیوں پر اس سورہ میں شدت سے تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر نبی پر یہ گرفت اور ازواجِ مطہرات کو یہ تنبیہ بھی خفیہ طور پر نہیں کی گئی بلکہ اس کتاب میں درج کر دی گئی جسے تمام اُمت کو ہمیشہ ہمیشہ تلاوت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں اس ذکر کا منشا نہ یہ تھا، نہ یہ ہو سکتا تھا

کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اُمہات المومنین کو اہلِ ایمان کی نگاہوں سے گرا دینا چاہتا تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی یہ سورۃ پڑھ کر کسی مسلمان کے دل سے ان کا احترام اُٹھ نہیں گیا ہے۔ اب قرآن میں یہ ذکر لانے کی مصلحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اپنے بزرگوں کے احترام کی صحیح حدوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ نبی، نبی ہے، خدا نہیں ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہ ہو۔ نبی کا احترام اس بنا پر نہیں ہے کہ اس سے لغزش کا صدور ناممکن ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مرضیِ الٰہی کا مکمل نمائندہ ہے اور اس کی ادنیٰ سی لغزش کو بھی اللہ نے اصلاح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اس سے ہمیں یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ نبی کا چھوڑا ہوا اُسوۂ حسنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمائندگی کر رہا ہے۔ اسی طرح صحابۂ کرام ہوں یا ازواجِ مطہرات، یہ سب انسان تھے، فرشتے یا فوق البشر نہ تھے، اُن سے غلطیوں کا صدور ہو سکتا تھا، اُن کو جو مرتبہ بھی حاصل ہوا اس وجہ سے ہوا کہ اللہ کی رہنمائی اور اللہ کے رسول کی تربیت نے ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اُن کا جو کچھ بھی احترام ہے، اسی بنا پر ہے، نہ کہ اس مفروضے پر کہ وہ کچھ ایسی ہستیاں تھیں جو غلطیوں سے بالکل مُبرّا تھیں۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحابہ یا ازواجِ مطہرات سے بشریت کی بنا پر جب بھی کسی غلطی کا صدور ہوا اُس پر ٹوکا گیا۔ اُن کی بعض غلطیوں کی اصلاح حضورؐ نے کی جس کا ذکر احادیث میں بکثرت مقامات پر آیا ہے اور بعض غلطیوں کا ذکر قرآن مجید میں کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کی اصلاح کی تاکہ مسلمان کبھی بزرگوں کے احترام کا کوئی مبالغہ آمیز تصور نہ قائم کر لیں، جو انہیں انسانیت کے مقام سے اُٹھا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مقام پر پہنچا دے۔ آپ قرآنِ پاک کا مطالعہ آنکھیں کھول کر کریں تو اس کی پے در پے مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ سورۂ آلِ عمران میں جنگِ اُحد کا ذکر کرتے ہوئے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اللہ نے (تائید و نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ جبکہ اس کے اذن سے تم ان کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم حکم کی نافرمانی کر بیٹھے، تم میں سے کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا طلب گار، تب اللہ نے تمہیں اُن کے مقابلہ میں پسپا کر دیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں معاف

کر دیا۔ اللہ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔" (آیت ۱۵۲)

سُورۂ نور میں حضرت عائشہ پر تہمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا :۔

"ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم لوگوں نے اِسے سُنا تھا اُس وقت مومن مرد اور عورتیں، سب اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو صریح بہتان ہے ؟ ...... اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم وکرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا۔ ذرا غور کرو، جب تمہاری زبان سے دوسری زبان اس قصے کو لیتی چلی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا، تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔" (آیات ۱۲ تا ۱۷)

سُورۂ احزاب میں ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

"اے نبی اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دِلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طلب گار ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔" (آیات ۲۸، ۲۹)

سُورۂ جمعہ میں صحابہؓ کے متعلق فرمایا :

"جب انھوں نے کاروبارِ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور (اے نبی) تم کو (خطبے میں) کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔" (آیت ۱۱)

سُورۂ مُمتَحِنہ میں ایک بدری صحابی حضرتِ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی کہ انھوں نے فتحِ مکہ سے پہلے حضورؐ کے حملے کی خفیہ اطلاع کفارِ قریش کو بھیج دی تھی۔

یہ ساری مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں، اُسی قرآن میں جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ اور ازواجِ مطہرات کے فضل و شرف کو خود بیان فرمایا ہے اور انہیں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا

پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا ہے۔ بزرگوں کے احترام کی یہی مبنی بر اعتدال تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو انسان پرستی کے اُس ہاویہ میں گرنے سے بچایا جس میں یہود و نصاریٰ گر گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کے موضوعات پر جن اکابر اہلِ سُنّت نے کتابیں مرتب کی ہیں ان میں جہاں صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات اور دوسرے بزرگوں کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی کمزوریوں اور لغزشوں اور غلطیوں کے واقعات بیان کرنے میں بھی تامّل نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ آج کے مدعیانِ احترام کی بہ نسبت وہ ان بزرگوں کے زیادہ قدر شناس تھے اور ان سے زیادہ حدودِ احترام کو جانتے تھے۔

پانچویں بات جو اس سورہ میں کھول کر بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین بالکل بے لاگ ہے۔ اس میں ہر شخص کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے ایمان اور اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُس کے لیے قطعاً نافع نہیں ہے اور کسی بُری سے بُری ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس معاملے میں خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے سامنے تین قسم کی عورتوں کو بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثال حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی ہے جو اگر ایمان لاتیں اور اپنے جلیل القدر شوہروں کا ساتھ دیتیں تو ان کا مقام اُمتِ مسلمہ میں وہی ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا ہے، لیکن چونکہ انہوں نے اس کے برعکس رویہ اختیار کیا، اس لیے انبیاء کی بیویاں ہونا ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ جہنم کی مستحق ہوئیں۔ دوسری مثال فرعون کی بیوی کی ہے جو اگرچہ ایک بدترین دشمنِ خدا کی بیوی تھیں لیکن چونکہ وہ ایمان لے آئیں اور انہوں نے قومِ فرعون کے عمل سے اپنے عمل کا راستہ الگ کر لیا، اس لیے فرعون جیسے اکفر الکافرین کی بیوی ہونا بھی اُن کے لیے کسی نقصان کا موجب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کا مستحق بنا دیا۔ تیسری مثال حضرت مریم علیہا السلام کی ہے جنہیں یہ مرتبۂ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمائش میں انہیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا اس کے لیے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت مریم کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو ایسی سخت آزمائش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوارے پنے کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو معجزے کے طور پر حاملہ کر دیا گیا ہو اور اُسے بتا دیا گیا ہو کہ اُس کا رب اُس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب حضرت مریمؑ نے اس پر کوئی واویلا نہ کیا بلکہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ

برداشت کرنا قبول کرلیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت کرنا ناگزیر تھا۔ تب اللہ نے ان کو سیدۃ النساء فی الجنۃ (مسند احمد) کے مرتبہ عالی پر سرفراز فرمایا۔

ان امور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت جو اس سورۃ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف وہی علم نہیں آتا تھا جو قرآن میں درج ہوا ہے بلکہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے دوسری باتوں کا علم بھی دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی صریح دلیل اس سورہ کی آیت ۳ ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات میں سے ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور انھوں نے وہ کسی اور کو بتا دی اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا۔ پھر جب حضورؐ نے اس غلطی پر اپنی اُن بیوی کو تنبیہ فرمائی اور انھوں نے پوچھا کہ آپ کو میری یہ غلطی کس نے بتائی تو حضورؐ نے جواب دیا کہ مجھے علیم وخبیر ہستی نے اس کی خبر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پورے قرآن میں کہاں وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ "اے نبی، تم نے اپنی بیوی سے راز میں جو بات کہی تھی وہ اُس نے کسی اور پر، یا فلاں شخص پر ظاہر کر دی ہے؟" اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس سے منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔

المُلْک

نام پہلے فقرے تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ کے لفظ الملک کو اِس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے مگر مضامین اور اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکّہ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اِس میں ایک طرف مختصر طریقے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسری طرف بڑے مؤثر انداز میں اُن لوگوں کو چونکا دیا گیا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مکّہ معظمہ کی ابتدائی سُورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو پیش کرتی ہیں مگر تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ تاکہ وہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ ان میں زیادہ تر زور اِس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی غفلت دُور کی جائے، ان کو سوچنے پر مجبور کیا جائے اور ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

پہلی پانچ آیتوں میں انسان کو احساس دِلایا گیا ہے کہ وہ جس کائنات میں رہتا ہے، وہ ایک انتہائی منظم اور محکم سلطنت ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص یا خلل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سلطنت کو عدم سے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے اور اس کی تدبیر و انتظام اور فرمانروائی کے تمام اختیارات بھی بالکلیہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اُس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس انتہائی حکیمانہ نظام میں وہ بے مقصد

پیدا نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ اسے یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اور اس امتحان میں وہ اپنے حُسنِ عمل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے۔

آیت ۶ سے ۱۱ تک کفر کے وہ ہولناک نتائج بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں نکلنے والے ہیں اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو بھیج کر تمہیں اسی دنیا میں ان نتائج سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر یہاں تم انبیاء کی بات مان کر اپنا رویہ درست نہ کرو گے تو آخرت میں خود تمہیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سزا تم کو دی جا رہی ہے فی الواقع تم اُس کے مستحق ہو۔

آیت ۱۲ سے ۱۴ تک یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہاری ہر کھلی اور چھپی بات حتیٰ کہ تمہارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہٰذا اخلاق کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ انسان ان دیکھے خدا کی بازپُرس سے ڈر کر بُرائی سے بچے، خواہ دُنیا میں کوئی طاقت اُس پر گرفت کرنے والی ہو یا نہ ہو اور دُنیا میں اُس سے کسی نقصان کا امکان ہو یا نہ ہو، یہ طرزِ عمل جو لوگ اختیار کریں گے وہی آخرت میں بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

آیت ۱۵ سے ۲۳ تک اُن پیش پا اُفتادہ حقیقتوں کی طرف، جنہیں انسان دُنیا کے معمولات سمجھ کر قابلِ توجہ شمار نہیں کرتا، پے در پے اشارے کر کے اُن پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے، فرمایا گیا ہے کہ اس زمین کو دیکھو جس پر تم اطمینان سے چل پھر رہے ہو اور جس سے اپنا رزق حاصل کر رہے ہو۔ خدا ہی نے اسے تمہارے لیے تابع کر رکھا ہے، ورنہ کسی وقت بھی اِس زمین میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے کہ تم پیوندِ خاک ہو جاؤ، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمہیں تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو، خدا ہی تو ہے جو اُنہیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ اپنے تمام ذرائع و وسائل پر نگاہ ڈال کر دیکھو، خدا اگر تمہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو کون تمہیں اُس سے بچا سکتا ہے اور خدا اگر تمہارے لیے رزق کے دروازے بند کر دے تو کون اُنہیں کھول سکتا ہے؟ یہ ساری چیزیں تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے موجود ہیں، مگر انہیں تم حیوانات کی طرح دیکھتے ہو جو مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اُس سماعت و بینائی اور اُن سوچنے سمجھنے والے دماغوں سے کام نہیں لیتے جو انسان ہونے کی حیثیت سے خدا نے تمہیں دیئے ہیں۔ اسی وجہ سے راہِ راست تمہیں نظر نہیں آتی۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک بتایا گیا ہے کہ آخر کار تمہیں لازماً اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ تمہیں اُس کے آنے کا وقت اور تاریخ بتائے، اُس کا کام بس یہ ہے کہ تمہیں اُس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کردے۔ تم آج اُس کی بات نہیں مانتے اور مطالبہ کرتے ہو کہ وہ وقت لاکر تمہیں دکھا دیا جائے، مگر جب وہ آجائے گا اور تم آنکھوں سے اسے دیکھ لوگے تو تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تم سے کہا جائے گا کہ یہی وہ چیز جسے جلدی لے آنے کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔

آیت ۲۸ اور ۲۹ میں کفارِ مکہ کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف کرتے تھے، وہ حضورؐ کو کوستے تھے اور آپؐ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے ہلاکت کی دعائیں مانگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ تمہیں راہِ راست کی طرف بلانے والے خواہ ہلاک ہوں یا اللہ اُن پر رحم کرے، اِس سے آخر تمہاری قسمت کیسے بدل جائے گی؟ تم اپنی فکر کرو۔ خدا کا عذاب اگر تم پر آجائے تو کون تمہیں بچائے گا؟ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اُس پر توکل کیا ہے، انہیں تم گمراہ سمجھ رہے ہو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بات کھل جائے گی کہ حقیقت میں گمراہ کون تھا۔

آخر میں لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے اور اسی پر سوچنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں جہاں تمہاری زندگی کا انحصار اُس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آیا ہے، وہاں اگر یہ پانی زمین میں اُتر کر غائب ہو جائے تو خدا کے سوا کون تمہیں یہ آبِ حیات لا کر دے سکتا ہے۔

*

القلم

نام اِس کا نام سورۂ "ن" بھی ہے اور القلم بھی۔ دونوں الفاظ سورۃ کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔

زمانۂ نزول یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اس میں تین مضامین بیان ہوئے ہیں۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب، اُن کو تنبیہ اور نصیحت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔

آغازِ کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں، حالانکہ جو کتاب تم پیش کر رہے ہو اور اخلاق کے جس اعلیٰ مرتبے پر تم فائز ہو وہ خود ان کے اس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرزانہ کون۔ لہٰذا مخالفت کا جو طوفان تمہارے خلاف اٹھایا جا رہا ہے اس کا دباؤ ہرگز قبول نہ کرو۔ دراصل یہ ساری باتیں اِس لیے کی جا رہی ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح دب کر ان سے مصالحت Compromise کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

پھر عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے نام لیے بغیر مخالفین میں سے ایک نمایاں شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے اہلِ مکہ خوب جانتے تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق بھی سب کے سامنے تھے اور ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ آپ کی مخالفت میں مکہ کے جو سردار پیش پیش ہیں اُن میں کس سیرت و کردار کے لوگ شامل ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۷ سے ۳۳ تک ایک باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے جنہوں نے اللہ سے نعمت پاکر اس کی ناشکری کی اور اُن کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اُس کی نصیحت بروقت نہ مانی، آخر کار وہ اُس نعمت سے محروم ہوگئے اور اُن کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب اُن کا سب کچھ برباد ہوچکا تھا۔ مثال دے کر اہلِ مکہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تم بھی اُسی آزمائش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے، اگر ان کی بات نہ مانو گے تو دنیا میں بھی عذاب بھگتو گے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

پھر آیت ۳۴ سے ۴۷ تک مسلسل کفار کو فہمائش کی گئی ہے جس میں کہیں تو خطاب براہِ راست اُن سے ہے اور کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے دراصل تنبیہ اُن کو کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کی بھلائی لازماً اُنہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرماں برداروں کا انجام وہ ہو جو مجرموں کا ہونا چاہیے۔ کفار کی یہ غلط فہمی بے بنیاد ہے کہ خدا اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو وہ خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں حالانکہ اس کے لیے انہیں کوئی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جارہی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں، قیامت کے روز وہ سجدہ کرنا چاہیں بھی تو نہ کرسکیں گے اور ذلت کا انجام انہیں دیکھنا پڑے گا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ انہیں جو ڈھیل دی جارہی ہے اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس تکذیب کے باوجود جب اُن پر عذاب نہیں آرہا ہے تو وہ صحیح راستے پر ہیں، حالانکہ وہ بے خبری میں ہلاکت کی راہ پر چلے جارہے ہیں۔ ان کے پاس رسول کی مخالفت کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بے غرض مبلّغ ہے۔ اپنی ذات کے لیے ان سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے، اور وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتے کہ انہیں اُس کے رسول نہ ہونے اور اُس کی باتوں کے غلط ہونے کا علم حاصل ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغِ دین کی راہ میں پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جائیں اور اُس بے صبری سے بچیں جو یونس علیہ السلام کے لیے ابتلا کی موجب بنی تھی۔

الحاقّہ

نام

سورۃ کے پہلے ہی لفظ کو اس آیت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

یہ بھی مکّۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو شروع ہو چکی تھی مگر اس نے ابھی زیادہ شدّت اختیار نہ کی تھی۔ مسند احمد میں حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا مگر آپ مجھ سے پہلے مسجد حرام میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں سورۃ الحاقہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے "یہ ایک رسول کریم کا قول ہے کسی شاعر کا قول نہیں"۔ میں نے اپنے دل میں کہا "شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے"۔ اسی وقت زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے "اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔" "یہ سُن کر اسلام میرے دل میں گہرا اُتر گیا"۔ حضرت عمرؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اُن کے قبولِ اسلام سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد بھی ایک مدت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے، اور وقتاً فوقتاً متعدد واقعات اُن کو اسلام سے متاثر کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اپنی بہن کے گھر میں اُن کے دل پر وہ آخری ضرب لگی جس نے ان کو ایمان کی منزل پر پہنچا دیا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۂ مریم۔ جلد پنجم، دیباچہ سورۂ واقعہ)۔

موضوع اور مضمون

اس کا پہلا رکوع آخرت کے بیان میں ہے، اور دوسرا رکوع قرآن کے مُنَزَّل من اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کے بارے میں۔

پہلے رکوع کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آکر رہتی ہے۔ پھر آیت ۴ سے ۱۲ تک یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا ہے وہ آخر کار خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہی ہیں۔ اس کے بعد آیت ۱۷ تک قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی۔ پھر آیت ۱۸ سے ۲۷ تک وہ اصل مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد نوعِ انسانی کے لیے ایک دوسری زندگی مقدّر فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس روز تمام انسان اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ جہاں اُن کا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی تھی کہ ایک دن اُنہیں اپنے رب کو اپنا حساب دینا ہے، اور جنہوں نے دنیا کی زندگی میں نیک عمل کر کے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے پیشگی سامان مہیا کر لیا تھا وہ اپنا حساب پاک دیکھ کر خوش ہو جائیں گے، اور انہیں جنّت کا ابدی عیش نصیب ہوگا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے نہ خدا کا حق مانا نہ بندوں کا حق ادا کیا۔ انہیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ جہنّم کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

دوسرے رکوع میں کفارِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اس قرآن کو ایک شاعر اور کاہن کا کلام کہتے ہو، حالانکہ یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے جو ایک رسولِ کریم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ رسول اس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس میں اپنی من گھڑت کوئی چیز شامل کر دے تو ہم اُس کی رگِ گردن (یا رگِ دل) کاٹ دیں۔ یہ ایک یقینی برحق کلام ہے اور جو لوگ اسے جھٹلائیں گے انہیں آخر کار پچھتانا پڑے گا۔

المعارِج

نام تیسری آیت کے لفظ ذی المعارِج سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نزول بھی قریب قریب انہی حالات میں ہوا ہے جن میں سورۂ الحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون اس مضمون میں اُن کفار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمہیں جھٹلا کر ہم عذابِ جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس سورۃ کی ساری تقریر اسی چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتدا میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا۔ اور جب وہ واقع ہوگا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر واقع ہوگا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے مذاق اُڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت، جس کے جلدی لے آنے کا مطالبہ یہ لوگ ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو ان مجرمین کا کیسا بُرا حشر ہوگا۔ اس وقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو فدیہ میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ نکلیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔

اس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر اُن کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ موڑا ہے

اور مال سمیٹ سمیٹ کر اور سینت سینت کر رکھا ہے وہ جہنّم کے مستحق ہوں گے اور جنہوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے، اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، امانت میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی پر قائم رہے ہیں وہ جنّت میں عزّت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکّہ کے اُن کفّار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ کا مذاق اُڑانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ اِن کے تمسخر کی پروا نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلّت دیکھنے پر مُصر ہیں تو انہیں اپنے بیہودہ مشغلوں میں پڑا رہنے دیں، اپنا بُرا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

نوح

نام

" نوح " اس سورۃ کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں از اوّل تا آخر حضرت نوح علیہ السّلام ہی کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

یہ بھی مکّہ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے مگر اس کے مضمون کی داخلی شہادت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں کفارِ مکّہ کی مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون

اس میں حضرت نوحؑ کا قصّہ محض قصّہ گوئی کی خاطر بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس سے مقصود کفارِ مکّہ کو متنبہ کرنا ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی رویّہ اختیار کر رہے ہو جو حضرت نوحؑ کے ساتھ ان کی قوم نے اختیار کیا تھا اور اس رویّے سے اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں بھی وہی انجام دیکھنا پڑے گا جو اُن لوگوں نے دیکھا۔ یہ بات پوری سورۃ میں کہیں صاف الفاظ میں نہیں کی گئی ہے لیکن جس موقع پر اور جن حالات میں یہ قصّہ اہلِ مکّہ کو سنایا گیا ہے اس پس منظر میں خود بخود یہ مضمون اس سے مترشح ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر مامور فرمایا تھا اُس وقت کیا خدمت اُن کے سپرد کی گئی تھی۔

آیات ۲، ۴ میں مختصراً بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کیا اور اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا بات پیش کی۔

پھر مدت ہائے دراز تک دعوت و تبلیغ کی زحمتیں اُٹھانے کے بعد جو روداد حضرت نوحؑ

نے اپنے رب کے حضور پیش کی وہ آیات ۵-۲۰ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں وہ عرض کرتے ہیں کہ کس کس طرح انہوں نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کا مقابلہ کس ہٹ دھرمی سے کیا۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ کی آخری گزارش آیات ۲۱-۲۴ میں درج کی گئی ہے جس میں وہ اپنے رب سے عرض کرتے ہیں کہ یہ قوم میری بات قطعی طور پر رد کر چکی ہے۔ اس نے اپنی نکیل اپنے رئیسوں کے ہاتھ میں دے دی ہے اور انہوں نے بہت بڑا مکر کا جال پھیلا رکھا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ان لوگوں سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جائے۔ یہ حضرت نوحؑ کی طرف سے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ صدیوں تک انتہائی صبر آزما حالات میں تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب وہ اپنی قوم سے پوری طرح مایوس ہو گئے تو انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ اب اس قوم کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ یہ رائے ٹھیک اللہ تعالیٰ کے اپنے فیصلے کے مطابق تھی۔ چنانچہ اس کے متصلاً بعد آیت ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ اس قوم پر اس کے کرتوتوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہو گیا۔

آخری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا درج کی گئی ہے جو انہوں نے عین نزولِ عذاب کے وقت پر اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس میں وہ اپنے لیے اور سب اہلِ ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اور اپنی قوم کے کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو زمین پر بسنے کے لیے جیتا نہ چھوڑا جائے کیونکہ اب ان کے اندر کوئی خیر باقی نہیں رہی ہے، ان کی نسل سے جو بھی اٹھے گا کافر اور فاجر ہی اٹھے گا۔

اس سورہ کا مطالعہ کرتے ہوئے حضرت نوحؑ کے قصے کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہئیں جو اس سے پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکی ہیں۔ ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، ۷۱-۷۳۔ ہود، ۲۵ تا ۴۹۔ المومنون ۲۳ تا ۳۱۔ الشعراء، ۱۰۵ تا ۱۲۲۔ العنکبوت، ۱۴-۱۵۔ الصافات، ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، ۹ تا ۱۶۔

الجِنّ

نام

"الجِنّ" اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضامین کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں جنوں کے قرآن سُن کر جانے اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازارِ عکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی، اُس وقت جنوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ اسی واقعہ کا ذکر اس سورہ میں کیا گیا ہے۔

اکثر مُفسّرین نے اس روایت کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حضورؐ کے مشہور سفرِ طائف کا واقعہ ہے جو ہجرت سے تین سال پہلے سنہ ۱۰ نبوی میں پیش آیا تھا، لیکن یہ قیاس متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ طائف کے اُس سفر میں جنوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اُس کا قصہ سورۂ احقاف آیات ۲۹-۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن آیات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر جو جن قرآن مجید سن کر ایمان لائے تھے وہ پہلے سے حضرت موسیٰ اور سابق کتبِ آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اِس سورہ کی آیات ۲ - ۷ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر سننے والے جن مشرکین اور منکرینِ آخرت و رسالت میں سے تھے۔ پھر یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے اُس سفر میں حضرت زید بن حارثہؓ کے سوا اور کوئی حضورؐ کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف اس کے اس سفر کے متعلق ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس میں چند صحابہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ مزید برآں روایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اُس سفر میں جنوں نے قرآن اُس وقت سُنا تھا جب حضورؐ طائف سے مکہ واپس تشریف لاتے ہوئے نخلہ میں ٹھیرے

تھے، اور اس سفر میں ابنِ عباس کی روایت کے مطابق جنوں کے قرآن سننے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپ مکہ سے عُکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ اِن وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ دو الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

جہاں تک سورۂ احقاف کا تعلق ہے، اُس میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں روایات متفق ہیں کہ وہ ۱۰ نبوی کے سفر طائف میں پیش آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دُوسرا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا، اِس کا کوئی جواب ہمیں ابن عباسؓ کی روایت سے نہیں ملتا، نہ کسی اور تاریخی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عُکاظ کے بازار میں کب تشریف لے گئے تھے۔ البتہ اس سورہ کی آیات ۸، ۱۰ پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نبوّت کے ابتدائی دَور کا واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن عالَمِ بالا کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمان میں سُن گُن لینے کا کوئی نہ کوئی موقع پا لیتے تھے مگر اس کے بعد یکایک انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پہرے لگ گئے ہیں اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کہیں اُن کو ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں ٹھیر کر وہ کوئی بھنک پا سکیں۔ اس سے اُن کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ زمین میں ایسا کیا واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کے لیے یہ سخت انتظامات کیے گئے ہیں۔ غالباً اُسی وقت سے جنوں کے بہت سے گروہ اس تلاش میں پھرتے رہے ہوں گے اور اُن میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن سُن کر یہ رائے قائم کی ہوگی کہ یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر جنوں پر عالَمِ بالا کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

جن کی حقیقت

اِس سورے کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تاکہ ذہن کسی اُلجھن کے شکار نہ ہوں۔ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پُرانے زمانے کے اَوہام و خرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ یہ رائے انہوں نے کچھ اس بنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور اُنہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن

کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ مگر انہوں نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو اُن کو محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے اُسے لازماً محسوس ہونا چاہیے۔ وہ درحقیقت خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اختیار کر لیا جائے تو ایک جن ہی کیا انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اُس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آتی ہو اور اُس کے لیے خدا تک کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرزِ فکر سے متاثر ہیں مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے۔ جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو بلکہ کہیں تو اِس سے مُراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے، کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے اُن کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، آیت ۳۸، ہود، ۱۱۹ - حٰم السجدہ آیات ۲۵، ۲۹۔ الاحقاف ۱۸۔ الذاریات ۵۶۔ الناس ۶ اور سورۂ رحمان تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورۂ اعراف آیت ۱۲، سورۂ حجر آیات ۲۶، ۲۷ اور سورۂ رحمان کی آیات ۱۴، ۱۵ میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادہ تخلیق آگ۔

سورۂ حجر آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے۔

اسی بات پر قصّۂ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورۂ کہف آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سُورۂ اعراف آیت ۲۷ میں بالفاظِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان اُن کو نہیں دیکھتے۔

سُورۂ حِجر آیات ۱۶، ۱۸۔ سُورۂ صافات، آیات ۶، ۱۰ اور سُورۂ مُلک آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہابِ ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اس سے مشرکینِ عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدائی کے اَسرار تک انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید سُورۂ سبا آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سُورۂ بقرہ آیات ۳۰-۳۴ اور سُورۂ کہف آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں جن کی ایک مثال ہمیں سُورۂ نمل آیت ۷ میں ملتی ہے لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک با اختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت و معصیت اور کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اس پر ابلیس کا قصّہ اور سُورۂ احقاف اور سُورۂ جن میں بعض جنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دَلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اُسی وقت سے شیاطینِ جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اس پر مسلّط ہو کر زبردستی اُس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اُس کے دل میں وَسوَسے ڈالتے ہیں، اُس کو بہکاتے ہیں اور بدی و

گمراہی کو اس کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔
النساء، ۱۱۷تا ۱۲۰، الاعراف، ۱۱ تا ۱۷، ابراہیم، ۲۲، الحجر ۳۰ تا ۴۲، النحل ۹۸ تا ۱۰۰، بنی اسرائیل ۶۱ تا ۶۵

اِن تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ اُن کی پُر اسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں، حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی گئی ہے، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

موضوع اور مباحث

اِس سُورہ میں پہلی آیت سے لے کر آیت ۱۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن مجید سُن کر کیا اثر لیا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے دوسرے جنوں سے کیا کیا باتیں کہیں۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی ساری گفتگو نقل نہیں کی ہے بلکہ صرف وہ خاص خاص باتیں نقل فرمائی ہیں جو قابلِ ذکر تھیں۔ اسی لیے طرزِ بیان ایک مسلسل گفتگو کا سا نہیں ہے بلکہ اُن کے مختلف فقروں کو اگر آدمی بغور پڑھے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اُن کے ایمان لانے کے اس واقعے اور اپنی قوم کے ساتھ اُن کی اس گفتگو کا ذکر قرآن میں کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے حواشی میں ان کے اقوال کی جو تشریحات کی ہیں وہ اس کا مقصد سمجھنے میں مزید مددگار ہوں گی۔

اِس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ تک لوگوں کو فہمائش کی گئی ہے کہ وہ شرک سے باز آجائیں اور راہِ راست پر ثابت قدمی کے ساتھ چلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہو گی، ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہو گا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفارِ مکہ کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول دعوت الی اللہ کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے، وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ لوگوں کو نفع یا نقصان پہنچا دینا اُس کے اختیار میں ہے۔ پھر آیات ۲۴۔ ۲۵ میں کفار کو متنبہ کیا گیا کہ آج وہ رسول کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ایک وقت آئے گا جب

انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے۔ وہ وقت دُور ہے یا قریب رسول کو اس کا علم نہیں ہے مگر بہر حال اسے آنا ضرور ہے۔ آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ یہ علم اُن امور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائضِ رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور یہ علم ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

المُزَّمِّل

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ **المُزَّمِّل** کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول

اس سورۃ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔

پہلا رکوع بالاتفاق مکی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکی زندگی کے کس دور میں نازل ہوا ہے، اس کا جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا، لیکن اس رکوع کے مضامین کی داخلی شہادت اس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

اولاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ راتوں کو اُٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں تاکہ آپ کے اندر نبوت کے بارِ عظیم کو اُٹھانے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حضورؐ کی نبوت کے ابتدائی دور ہی میں نازل ہوا ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس منصب کے لیے آپ کی تربیت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً اِس میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت قرآن مجید کا کم از کم اتنا حصہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قرأت کی جا سکے۔

ثالثاً اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رکوع اُس زمانے میں نازل ہوا

ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں آپ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ ہی میں نازل ہوا ہے، لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اس رکوع کے مضامین سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس میں قتال فی سبیل کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

موضوع اور مضامین

پہلی سات آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس کارِ عظیم کا بار آپ پر ڈالا گیا ہے، اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں اور اس کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ راتوں کو اٹھ کر آپ آدھی آدھی رات، یا اس سے کچھ کم و بیش نماز پڑھا کریں۔

آیت ۸ سے ۱۴ تک حضورؐ کو تلقین کی گئی ہے کہ سب سے کٹ کر اس خدا کے ہو رہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے، اپنے سارے معاملات اسی کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیں۔ مخالفین جو باتیں آپ کے خلاف بنا رہے ہیں ان پر صبر کریں، ان کے منہ نہ لگیں اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں کہ وہی ان سے نمٹ لے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۵ سے ۱۹ تک مکہ کے اُن لوگوں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے، متنبہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اُسی طرح تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا۔ پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ آیا تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلو گے؟

یہ پہلے رکوع کے مضامین ہیں۔ دوسرا رکوع حضرت سعید بن جُبیرؓ کی روایت کے مطابق اُس کے دس سال بعد نازل ہوا اور اس میں نمازِ تہجد کے متعلق اُس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز

کا تعلق ہے وہ تو جتنی بآسانی پڑھی جاسکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پنجوقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضۂ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خلوصِ نیت کے ساتھ صرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بھلائی کے کام تم دنیا میں انجام دو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اُن کی حیثیت اُس سامان کی سی ہے جو ایک مُسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے سے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤ گے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے، اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اُس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے بلکہ اللہ کے ہاں تمہیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بہت بڑا اَجر بھی ملے گا۔

المُدَّثِّر

نام یہلی ہی آیت کے لفظ المُدَّثِّر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے، مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول اس کی پہلی سات آیات مکہ معظمہ کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ ہیں بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ سے منقول ہیں اُن میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی اوّلین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن اُمّت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلّم ہے کہ پہلی وحی جو حضورؐ پر نازل ہوئی وہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے مَا لَمْ يَعْلَمْ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدّت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر کچھ وقفہ کے بعد جب از سرِ نو نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس کا آغاز سورۂ مدثّر کی انہی آیات سے ہوا تھا۔ امام زُہریؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں :۔

> ایک مدّت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانہ میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپؐ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے لیکن جب کبھی آپؐ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپؐ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا، اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور ہو جاتی تھی" (ابن جریر)

اس کے بعد امام زُہری خود حضرت جابر بن عبداللہ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ :

"رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فَتْرَۃُ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا کہ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، سر اُٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اُڑھاؤ مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اُس وقت اللہ نے وحی نازل کی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ...... پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔" (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن جریر)

سورۃ کا باقی ماندہ حصہ آیت ۸ سے آخر تک اُس وقت نازل ہوا جب اسلام کی عُلانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اس کا مفصل واقعہ سیرت ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سُورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ :

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا۔ اس پیغام میں آپؐ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربے سے پڑا ہے اس کا اثر دُور ہو جائے اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوّت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقفے کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس سورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم

دیا گیا کہ آپ اُٹھیں اور خلقِ خدا کو اُس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے اور اس دنیا میں جہاں دوسروں کی بڑائی کے ڈنکے بج رہے ہیں خدا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپ کو کرنا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو، اور آپ تمام دنیاوی فائدوں سے قطع نظر کر کے کامل اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری فقرے میں آپ کو تلقین کی گئی کہ اس فریضہ کی انجام دہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں اُن پر آپ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اِس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآن مجید کی پے در پے نازل ہوتے والی سورتوں کو آپ نے سنانا شروع کیا تو مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آگیا۔ اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور موثر کلام سنانا شروع کر دیا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اِس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی اُن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا، اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا، نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں، ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ کون باور

کرے گا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کرسکتا ہے؟ لوگوں نے کہا: "اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہوسکتا۔ لوگ بولے تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا۔ وہ ساحر بھی نہیں ہیں، جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں اُن سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمدؐ پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمر دار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہوگیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا۔ اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کررہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جُدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کرلیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے اُس سے ہوشیار رہنا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کردیا۔ (سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ اس قصے کا یہ حصہ کہ ابوجہل کے اصرار پر ولید نے یہ بات کہی تھی۔ عکرمہ کی روایت سے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصہ میں تبصرہ کیا گیا ہے، اُس کے مضامین کی ترتیب یہ ہے:-

آیت ۸ سے ۱۰ تک منکرین حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا بُرا انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور اُن کا جواب اُس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں

اُن کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف وہ دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخر کار یہ بات بنا کر لایا کہ خلقِ خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اُس کی اس صریح بدباطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے، حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۴۸ تک دوزخ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

پھر آیت ۴۹-۵۳ میں کفّار کے مرض کی اصل جڑ بتا دی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے بے خوف ہیں اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اسی طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے انکارِ آخرت کے ساتھ ایمان کی راہ پر وہ ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی ضرورت نہیں پڑ گئی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پوری کرتا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے، خدا اس کا مستحق ہے کہ لوگ اس کی نافرمانی سے ڈریں اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کر لے اسے وہ معاف کر دیتا ہے خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

القیٰمۃ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقِیٰمَۃ کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورہ کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں قیامت پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ کسی روایت سے اس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوتا، لیکن اس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۱۵ کے بعد یکایک سلسلۂ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ "اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارا ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔" اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا سے آیت ۱۵ تک چلا آ رہا تھا۔ یہ جملۂ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی اور روایات کی رُو سے بھی اِس بنا پر دورانِ کلام میں وارد ہوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سورہ حضورؐ کو سُنا رہے تھے اُس وقت آپ اِس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے دُہراتے جا رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نزولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآن مجید میں اس کی دو مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک سُورۂ طٰہٰ میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ "اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے (آیت ۱۱۴) دوسرے سُورۂ اعلیٰ میں

یہاں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ "ہم عنقریب تم کو پڑھوا دیں گے، پھر تم بھولو گے نہیں۔" (آیت ۶) بعد میں جب حضورؐ کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے قرآن میں ان تین مقامات کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون

یہاں سے آخر کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر اپنے مضمون اور انداز بیان سے اُس زمانے کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سورتوں میں ایسے پُرزور اور موثر طریقے سے نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہل مکہ کو ان کی گمراہیوں پر متنبہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بوکھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضورؐ کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لیے انہوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورۂ مدثر کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔

اس سورہ میں منکرینِ آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے، اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے، بلکہ اس کا اصل محرک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو وہ آ کر رہے گا، تمہارا سب کیا دھرا تمہارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا اور حقیقت میں تو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہو گا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لیے اپنی حرکات کے لیے کتنے ہی بہانے اور عذرات تراشتا رہے۔

*

الدّھر

نام اس سورۃ کا نام "الدھر" بھی ہے اور "الانسان" بھی۔ دونوں نام پہلی ہی آیت کے الفاظ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ اور حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ سے ماخوذ ہیں۔

زمانۂ نزول اکثر مفسرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں۔ علامہ زمخشری، امام رازی، قاضی بیضاوی، علامہ نظام الدین نیساپوری، حافظ ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اسے مکی ہی لکھا ہے، اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جمہور کا قول ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین نے پوری سورۃ کو مدنی کہا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ہے تو مکی، مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔

جہاں تک اس سورۃ کے مضامین اور اندازِ بیان کا تعلق ہے، مدنی سورتوں کے مضامین اور اندازِ بیان سے بہت مختلف ہے، بلکہ اس پر غور کرنے سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ معظمہ کے بھی اس دَور میں نازل ہوئی ہے جو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد ہوا تھا۔ رہیں آیات ۸ تا ۱۰ (وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ سے لے کر یَوْماً عَبُوْساً قَمْطَرِیْراً تک) تو وہ پوری سورۃ کے سلسلۂ بیان میں اس طرح پیوست ہیں کہ سیاق و سباق کے ساتھ کوئی اُن کو پڑھے تو ہرگز یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ان سے پہلے اور بعد کا مضمون تو ۱۵-۱۶ سال پہلے نازل ہوا تھا اور اس کے کئی سال بعد نازل ہونے والی یہ تین آیتیں یہاں لا کر ثبت کر دی گئیں۔

دراصل جس بنا پر اس سورۃ کے، یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ

حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچوں کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی خادمہ فِضّہؓ نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرما دی تو یہ سب شکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ دونوں تندرست ہو گئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ حضرت علیؓ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے تین صاع جَو قرض لیے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کر کے حاصل کیے) پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے بعد کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک یتیم آگیا اور اس نے سوال کیا۔ اُس روز بھی سارا کھانا انہوں نے اُس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آکر وہی سوال کر دیا اور اُس روز کا بھی پورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؓ دونوں بچوں کو لیے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دیکھا کہ بھوک کی شدت سے تینوں باپ بیٹوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپؐ ان کے ساتھ اُٹھ کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نڈھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لیجیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اہلِ بیت کے معاملہ میں آپ کو مبارک باد دی ہے۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ پوری سورۃ آپ کو پڑھ کر سنائی۔ (ابن مہران کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ سے لے کر آخر تک کی آیات سنائیں، مگر ابن مَردُوْیَہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ ..... حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اِس قصے کا اُس میں کوئی ذکر نہیں ہے) یہ پورا قصہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البَسیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اُسی سے زِمَخْشَری، رازی، اور نَیسابوری وغیرہم نے اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت اوّل تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے اور پھر درایت کے لحاظ سے دیکھیے تو بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی آکر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے۔ پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی ابھی بیماری سے اُٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے انہیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہم دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہوگا۔ اس کے علاوہ قیدیوں کے معاملہ میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دَور میں کبھی نہیں رہا کہ انہیں بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جائے، وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کو خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی اور کسی شخص کے سپرد کیے جاتے تو وہ شخص انہیں کھلانے پلانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس لیے مدینۂ طیبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک مانگنے کے لیے نکلتا۔ تاہم ان تمام نقلی اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اس قصّے کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نیک عمل کا صُدُور ہوا تو جبریلؑ نے آکر حضورؐ کو خوش خبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے اہلِ بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہوا ہے کیونکہ انہوں نے ٹھیک وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سورۂ دہر کی ان آیات میں فرمائی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اسی موقع پر ہوئی تھیں۔ شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو در اصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مُراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اِس واقعہ پر ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سُیُوطی نے اتقان میں حافظ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو۔" آگے چل کر وہ امام بدر الدین زرکشی کا قول اُن کی کتاب البُرہان فی علوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ "صحابہؓ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے

کہ ان میں سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اِس معاملہ پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اُس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیانِ واقعہ کی۔" (الاتقان فی علوم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)

موضوع اور مضمون

اِس سورہ کا موضوع انسان کو اس دنیا میں اُس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی اس حیثیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر شکر کا رویّہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کفر کی راہ چلے تو کس انجام سے دوچار ہوگا۔ قرآن کی بڑی سورتوں میں تو یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن ابتدائی مکی دَور کی سورتوں کا یہ خاص اندازِ بیان ہے کہ جو باتیں بعد کے دَور میں مفصل ارشاد ہوئی ہیں، وہی اِس دَور میں بڑے مختصر مگر انتہائی موثر طریقے سے ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقرے استعمال کیے گئے ہیں جو سننے والوں کی زبان پر خود بخود چڑھ جائیں۔

اِس میں سب سے پہلے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب وہ کچھ نہ تھا، پھر ایک مخلوط نطفے سے اُس کی ایسی حقیر سی ابتدا کی گئی کہ اُس کی ماں تک کو خبر نہ تھی کہ اُس کے وجود کی بنا پڑ گئی ہے اور کوئی اُس خورد بینی وجود کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے جو آگے چل کر اِس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے، اس کے بعد انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اس طرح کر کے تجھے یہ کچھ ہم نے اِس لیے بنایا ہے کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش گوش رکھنے والا بنایا گیا اور تیرے سامنے شکر اور کفر کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے گئے تاکہ یہاں کام کرنے کا جو وقت تجھے دیا گیا ہے اس میں تو دِکھا دے کہ اس امتحان سے تو شاکر بندہ بن کر نکلا ہے یا کافر بندہ بن کر۔

پھر صرف ایک آیت میں دو ٹوک طریقے سے بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اِس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے اُنہیں آخرت میں کیا انجام دیکھنا ہوگا۔

اس کے بعد آیت نمبر ۵ سے ۲۲ تک مسلسل اُن انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ اپنے رَب کے ہاں نوازے جائیں گے جنہوں نے یہاں بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ اِن آیات

میں صرف اُن کی بہترین جزا بتانے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُن کے وہ کیا اعمال ہیں جن کی بنا پر وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے۔ مکی دور کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابلِ قدر ہیں اور کہیں اعمال و اخلاق کی اُن برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ دونوں اس لحاظ سے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ ان کا کیا اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں نکلتا ہے، بلکہ صرف اس حیثیت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کی اَبدی اور پائیدار زندگی میں اُن کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا قطع نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بُری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔

یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے، اس کے بعد دوسرے رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ دراصل یہ ہم ہی ہیں جو اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تم پر نازل کر رہے ہیں اور اس سے مقصود حضورؐ کو نہیں بلکہ کفّار کو خبردار کرنا ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نازل کرنے والے "ہم" ہیں اور ہماری حکمت ہی اس کی مقتضی ہے کہ اسے یک بارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کریں۔ دوسری بات حضورؐ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ تمہارے رب کا فیصلہ صادر ہونے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، اس دوران میں تم پر خواہ کچھ ہی گزر جائے، بہرحال تم صبر کے ساتھ اپنا فریضۂ رسالت انجام دیے چلے جاؤ اور کبھی ان بدعمل اور منکرِ حق لوگوں میں سے کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ تیسری بات آپ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ شب و روز اللہ کو یاد کرو، نماز پڑھو اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارو، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے کفر کی طغیانی کے مقابلہ میں اللہ کی طرف بُلانے والوں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

پھر ایک فقرے میں کفّار کے غلط رویّے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آخرت کو بھول کر دنیا پر فریفتہ ہو گئے ہیں، اور دوسرے فقرے میں اُن کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم خود نہیں بن گئے ہو، ہم نے تمہیں بنایا ہے، یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں تم نے خود اپنے لیے نہیں

بنا لیے ہیں، ان کے بنانے والے بھی ہم ہی ہیں اور یہ بات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے کہ جو کچھ ہم تمہارے ساتھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، تمہاری شکلیں بگاڑ سکتے ہیں، تمہیں ہلاک کر کے کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لا سکتے ہیں، تمہیں مار کر دوبارہ جس شکل میں چاہیں تمہیں پیدا کر سکتے ہیں۔

آخر میں کلام اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ یہ ایک کلمۂ نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے مگر دنیا میں انسان کی چاہت ہی سب کچھ نہیں ہے، کسی کی چاہت کبھی پوری نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہے اور اللہ کی چاہت اندھا دھند نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اپنے علم اور حکمت کی بنا پر چاہتا ہے۔ اس علم اور حکمت کی بنا پر جسے وہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور جسے وہ ظالم پاتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب کا انتظام اس نے کر رکھا ہے۔

المُرسَلٰت

نام پہلی ہی آیت کے لفظ وَالْمُرْسَلٰتِ کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا پورا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ مکّۂ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی دو سورتیں سورۂ قیامہ اور سورۂ دہر، اور اس کے بعد کی دو سورتیں سورۂ نبأ اور سورۂ نازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جس کو ان میں مختلف پیرایوں سے اہلِ مکّہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع قیامت اور آخرت کا اثبات اور اُن نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو ان حقائق کے انکار اور اقرار سے آخر کار برآمد ہوں گے۔

پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ ان میں استدلال یہ ہے کہ جس قادرِ مطلق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے، اُس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی اور جو صریح حکمت اس انتظام میں کارفرما نظر آ رہی ہے، وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عبث اور بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور آخرت نہ ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ سارا کارخانۂ ہستی سَراسَر فضول ہے۔

اہلِ مکّہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو، اسے لا کر دکھاؤ تب ہم اسے مانیں گے۔ آیت ۸ سے ۱۵ تک ان کے اس مطالبے کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ

کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں ہے کہ جب کوئی مسخرا اسے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے، وہ تمام نوعِ انسانی، اور اس کے تمام افراد کے مقدمے کے فیصلے کا دن ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اُسی وقت پر وہ آئے گا اور جب آئے گا تو یہ ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اُس وقت اُن کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت اُنہی رسولوں کی شہادت پر اُن کے مقدمے کا فیصلہ ہوگا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں۔ پھر انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کیا ہے۔

آیت ۱۶ سے ۲۸ تک مسلسل قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجوب کے دلائل دیے گئے ہیں، ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدائش، اور جس زمین پر وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالمِ آخرت کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔ انسانی تاریخ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ آخرکار بگڑیں اور تباہی سے دوچار ہوئیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آخرت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کا رویہ اگر متصادم ہو تو اُس کا انجام وہی ہوتا ہے جو اُس اندھے کا انجام ہوتا ہے جو سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے مقابلے میں بگ ٹٹ چلا جا رہا ہو۔ اور اس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانینِ طبیعی Phsical Laws ہی کار فرما نہیں ہیں بلکہ ایک قانونِ اخلاقی Moral Law بھی کام کر رہا ہے جس کے تحت خود اس دنیا میں بھی مکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے لیکن دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مکافات چونکہ اپنی کامل و مکمل صورت میں واقع نہیں ہو رہی ہے اس لیے کائنات کا اخلاقی قانون لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب بھرپور طریقے سے واقع ہو اور اُن تمام بھلائیوں اور برائیوں کی پوری جزا و سزا دی جائے جو یہاں جزا سے محروم رہ گئی ہیں یا سزا سے بچ نکلی ہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو، اور انسان کی پیدائش دنیا میں جس طرح ہوتی ہے اس پر اگر انسان غور کرے تو اس کی عقل — بشرطیکہ وہ سلیم ہو — اس بات کو ماننے سے انکار نہیں نہیں کر سکتی کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفہ سے ابتدا کر کے اُسے پورا آدمی بنایا ہے۔ اُس کے لیے

اُسی آدمی کو پھر پیدا کر دینا یقیناً ممکن ہے۔ زندگی بھر انسان جس زمین پر رہتا ہے، مرنے کے بعد اس کے اجزائے جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے۔ اسی زمین پر اُن کا ایک ایک ذرہ موجود رہتا ہے۔ اسی زمین کے خزانوں سے وہ بنتا اور پھلتا پھولتا اور پرورش پاتا ہے اور پھر اسی زمین کے خزانوں میں واپس جمع ہو جاتا ہے جس خدا نے اُسے پہلے زمین کے ان خزانوں سے نکالا تھا وہی اُن میں جمع ہو جانے کے بعد اُسے پھر سے نکال لا سکتا ہے۔ اُس کی قدرت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ زمین پر جو اختیارات اُس نے تمہیں دیے ہیں اُن کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۸ سے ۴۰ تک آخرت کے منکرین کا اور ۴۱ سے ۴۵ تک اُن لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اُس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار کی اُن بُرائیوں سے اجتناب کیا ہے جو چاہے آدمی کی دنیا بناتی ہوں مگر اس کی عاقبت خراب کر دینے والی ہوں۔

آخر میں منکرینِ آخرت اور خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اُڑا لو، آخر کار تمہارا انجام سخت تباہ کن ہوگا اور بات اس پر ختم کی گئی ہے کہ اس قرآن سے بھی جو شخص ہدایت نہ پائے اسے پھر دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔

النَّبَا

نام دوسری آیت کے فقرے عَنِ النَّبَاِ العَظِیمِ کے لفظ اَلنَّبَا کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورۃ کے مضامین کا عنوان بھی ہے، کیونکہ نبا سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور سورۃ میں بحث اسی پر کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول جیسا کہ ہم سورۂ مُرسلات کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سورۂ قیامت سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور یہ سب مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا مضمون بھی وہی ہے جو سورۂ مُرسلات کا ہے۔ یعنی قیامت اور آخرت کا اثبات اور اُس کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا۔

مکہ معظمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں، ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپؐ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اِس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہو گا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنّت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان تینوں باتوں میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکّہ کو سخت ناگوار تھی لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ

کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے، اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اس لیے جھگڑا صرف اس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات میں اور الوہیت کی ذات میں اُن کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو مکّے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اس امر سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضورؐ نے دعوائے رسالت سے پہلے انہی کے درمیان گزاری تھی۔ اس میں انہوں نے کبھی آپ کو جھوٹا یا فریب کار، یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضورؐ سارے معاملات میں تو راست باز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکّہ کے لیے در اصل اتنی زیادہ اُلجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اُڑایا، اُسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا، اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصوّر ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتار دیا جائے کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں اُن کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں اُن کا معیارِ اقدار بدل سکتا، اور وہ دُنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام اُن کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دِلوں میں بٹھانے پر صَرف کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصوّر بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے، اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصر اً دیے گئے ہیں۔

اِس دَور کی سورتوں میں آخرت کے مضمون کی اِس تکرار کا سبب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اِس سورۃ کے مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس میں سب سے پہلے اُن چرچوں اور چہ میگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت کی خبر سُن کر مکّہ کے ہر کوچہ و بازار اور اہلِ مکّہ کی ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد انکار کرنے والوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا تمہیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمہارے لیے فرش بنا رکھا ہے؟ کیا یہ بلند و بالا پہاڑ تمہیں نظر نہیں آتے جنہیں ہم نے زمین میں گاڑ رکھا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہم نے تمہیں مَردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اپنی نیند کو نہیں دیکھتے جس کے ذریعہ سے ہم نے تم کو دُنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کیا تم رات اور دن کی آمد و رفت کو نہیں دیکھتے جسے ٹھیک تمہاری ضرورت کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟ کیا تم اپنے اوپر آسمانوں کے مضبوط بندھے ہوئے نظام کو نہیں دیکھتے؟ کیا یہ سورج تمہیں نظر نہیں آتا جس کی بدولت تمہیں روشنی اور حرارت مُیسّر آرہی ہے؟ کیا تم اُن بارشوں کو نہیں دیکھتے جو بادلوں سے بَرس رہی ہیں اور اُن کے ذریعہ سے غلّے اور سبزیاں اور گھنے باغ اُگ رہے ہیں؟ یہ ساری چیزیں کیا تمہیں یہی بتا رہی ہیں کہ جس قادرِ مطلق نے اِن کو پیدا کیا ہے اُس کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے سے عاجز ہے اور اِس پورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کار فرما ہے کیا اِس کو دیکھتے ہوئے تمہاری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اِس کارخانے کا ایک ایک جُز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پورا کارخانہ بے مقصد ہے؟ آخر اس سے زیادہ لغو اور بے معنیٰ بات کیا ہو سکتی ہے۔ اس کارخانے میں انسان کو پیش دست Foreman کے منصب پر مامور کر کے اسے یہاں بڑے وسیع اختیارات تو دے دیے جائیں مگر جب وہ اپنا کام پورا کر کے یہاں سے رخصت ہو تو اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے؟ نہ کام بنانے پر پنشن اور انعام، نہ کام بگاڑنے پر باز پُرس اور سزا؟

یہ دلائل دینے کے بعد پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقرر وقت پر آکر رہے گا۔ صور میں بس ایک پھونک مارنے کی دیر ہے، وہ سب کچھ جس کی تمہیں خبر

دی جارہی ہے سامنے آجائے گا، اور تم آج چاہے مانو یا نہ مانو، اُس وقت جہاں جہاں بھی تم مرے پڑے ہوگے، وہاں سے فوج در فوج اپنا حساب دینے کے لیے نکل آؤ گے۔ تمہارا انکار اس واقعہ کو پیش آنے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد آیت ۲۱ سے ۳۰ تک بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے، ان کا ایک ایک کرتوت گن گن کر ہمارے ہاں لکھا ہوا ہے، اور اُن کی خبر لینے کے لیے جہنم گھات لگائے ہوئے تیار ہے جہاں ان کے اعمال کا بھرپور بدلہ انہیں دے دیا جائے گا۔ پھر آیت ۳۱ سے ۳۶ تک اُن لوگوں کی بہترین جزا بتائی گئی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو ذمہ دار و جواب دہ سمجھ کر دنیا میں اپنی آخرت درست کرنے کی پہلے ہی فکر کر لی ہے اور انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انہیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائے گا بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہاں کسی کے اڑ کر بیٹھ جانے اور اپنے متوسلین کو بخشوا کر چھوڑنے کا کیا سوال، کوئی بلا اجازت زبان تک نہ کھول سکے گا، اور اجازت بھی شرط کے ساتھ ملے گی کہ جس کے حق میں سفارش کا اذن ہو صرف اسی کے لیے سفارش کرے اور سفارش میں کوئی بے جا بات نہ کہے۔ نیز سفارش کی اجازت صرف اُن لوگوں کے حق میں دی جائے گی جو دنیا میں کلمۂ حق کے قائل رہے اور محض گناہ گار ہیں۔ خدا کے باغی اور حق کے منکر کسی سفارش کے مستحق نہ ہوں گے۔

پھر کلام کو اِس تنبیہ پر ختم کیا گیا ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جارہی ہے اُس کا آنا برحق ہے، اُسے دُور نہ سمجھو، وہ قریب ہی آلگا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔ لیکن اِس تنبیہ کے باوجود جو اُس کا انکار کرے گا اس کا سارا کیا دھرا اُس کے سامنے آجائے گا اور پھر وہ پچھتا پچھتا کر کہے گا کہ کاش میں دُنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اُس وقت اُس کا یہ احساس اسی دنیا کے بارے میں ہوگا جس پر وہ آج لٹو ہو رہا ہے۔

النّازِعات

نام پہلے ہی لفظ والنّٰزِعٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ سورۂ نباء (عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع قیامت اور زندگی بعد موت کا اثبات ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر تنبیہ بھی کہ خدا کے رسول کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آغازِ کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے، اور اللہ کے احکام کو بلا تاخیر بجالانے والے اور حکمِ الٰہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھاکر یہ یقین دِلایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آکر رہے گی کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے انہی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی بھی جاسکتی ہے اور جو فرشتے آج اللہ کے حکم کی تعمیل بِلا تاخیر بجالاتے اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں، وہی فرشتے کل اُسی کے حکم سے کائنات کا یہ نظام درہم برہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اِس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دُشوار کام ہی نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ بس ایک جھٹکا دُنیا کے اس نظام کو درہم برہم کردے گا اور ایک دوسرا جھٹکا اس کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ دوسری

دنیا میں یکایک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ۔ اُس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے تھے، خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہوں گے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

پھر حضرت موسیٰ اور فرعون کا قِصّہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ رسول کو جُھٹلانے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو رَدّ کرنے اور چالبازیوں سے اس کو شکست دینے کی کوشش کا کیا انجام فرعون دیکھ چکا ہے۔ اُس سے عبرت حاصل کر کے اِس روش سے باز نہ آؤ گے تو وہی انجام تمہیں بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے منکرین سے پوچھا گیا ہے کہ تمہیں دوبارہ پیدا کر دینا زیادہ سخت کام ہے یا اس عظیم کائنات کو پیدا کرنا جو عالمِ بالا میں اپنے بے حد و حساب ستاروں اور سیاروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے؟ جس خدا کے لیے یہ کام مشکل نہ تھا اس کے لیے تمہاری بارِ دِگر تخلیق کیوں کر مشکل ہوگی؟ صرف ایک فقرے میں امکانِ آخرت کی یہ مُسکِت دلیل پیش کرنے کے بعد زمین اور اُس کے سر و سامان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین میں انسان اور حیوان کی زیست کے لیے فراہم کیا گیا ہے اور جس کی ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ اشارہ کر کے اس سوال کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ آیا اس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمّہ داریاں سونپ کر اس کا محاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت نظر آتا ہے، یا یہ کہ وہ زمین میں ہر طرح کے کام کر کے مَر جائے اور خاک میں مِل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے اور کبھی اُس سے حساب نہ لیا جائے کہ اِن اختیارات کو اس نے کیسے استعمال کیا اور ان ذمّہ داریوں کو کس طرح ادا کیا؟ اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے آیات ۳۴-۴۱ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آخرت برپا ہو گی تو انسان کے دائمی اور ابدی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہو گا کہ کس نے دنیا میں حدِّ بندگی سے تجاوز کر کے اپنے خدا سے سرکشی کی اور دنیا ہی کے فائدوں اور لذّتوں کو مقصود بنا لیا، اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کی ناجائز خواہشات

کو پورا کرنے سے احتراز کیا۔ یہ بات خود بخود اوپر کے سوال کا صحیح جواب ہر اُس شخص کو بتا دیتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر ایمان داری کے ساتھ اس پر غور کرے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا بالکل عقلی، منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ اِسی بنیاد پر آخر کار اُس کا محاسبہ کیا جائے اور اسے جزا یا سزا دی جائے۔

آخر میں کفّارِ مکّہ کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ قیامت آئے گی کب؟ یہ سوال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کرتے تھے۔ جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اُس کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسول کا کام خبردار کر دینا ہے کہ وہ وقت آئے گا ضرور۔ اب جس کا جی چاہے اس کے آنے کا خوف کر کے اپنا رَویّہ دُرست کرے اور جس کا جی چاہے بے خوف ہو کر شُترِ بے مہار کی طرح چلتا رہے، جب وہ وقت آجائے گا تو وہی لوگ جو اِس دنیا کی زندگی پر مَرے مٹتے تھے اور اسی کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہ محسوس کریں گے کہ دُنیا میں وہ صرف گھڑی بھر ٹھیرے تھے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ اِس چند روزہ زندگی کی خاطر انہوں نے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل برباد کر لیا۔

عَبَسَ

نام پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مفسّرین و محدّثین نے بالاتفاق اِس سورہ کا سببِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس میں مکّۂ معظم کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابنِ اُمّ مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی۔ اور آپؐ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سُورۃ نازل ہوئی۔ اِس تاریخی واقعہ سے اِس سُورہ کا زمانۂ نزول بآسانی متعیّن ہو جاتا ہے۔

اوّلاً یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن امّ مکتوم بالکل ابتدائی دور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اَسْلَمَ بِمَكَّةَ قَدِيمًا، اور ھُوَ مِمَّنْ اَسْلَمَ قَدِيمًا، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکّۂ معظم میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لا چکے تھے اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضورؐ کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے آکر عرض کیا تھا: یارسول اللہ، ارشدنی، یارسول اللہ، مجھے سیدھا راستہ بتایئے" (ترمذی، حاکم، ابن حِبّان، ابن جریر، ابو یعلیٰ) حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت ہے کہ وہ آکر قرآن کی

ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضورؐ سے عرض کیا یا رسُولَ اللہ علّمنی ممّا علّمک اللہ، یارسول اللہ، مجھے وہ علم سکھایئے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے" (ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضورؐ کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابن زید آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی کا مطلب لَعَلَّہٗ یُسْلِم "شاید کہ وہ اسلام قبول کرے" بیان کرتے ہیں (ابن جریر) اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ "تمہیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُن کے لیے نافع ہو"؟ اور یہ کہ "جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو" اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضورؐ ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ اُن کی یہ طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات اُن کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انہیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اِس فہرست میں ہمیں عُتبہ، شَیبہ، ابوجہل، اُمیّہ بن خلف، اُبَیّ بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِن لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپ کے ساتھ اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورۃ بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورۃ پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عِتاب کفّارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبّر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتاتے

کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بے چارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اُس کا رُجحان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سورۃ سے آیت ۱۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۷ سے براہِ راست عتاب کا رُخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رویّے پر اُنہیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خالق و رازق پروردگار کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس روش کا کیسا ہولناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

التَّکوِیر

نام پہلی آیت کے لفظ کُوِّرَتْ سے ماخوذ ہے۔ کُوِّرَتْ تکویر سے صیغہ ماضی مجہول ہے جس کے معنی ہیں لپیٹی گئی۔ اس نام سے مراد یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لپیٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول مضمون اور انداز بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کے دو موضوع ہیں۔ ایک آخرت، دوسرے رسالت۔

پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے جب سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اڑنے لگیں گے، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اٹھیں گے۔ پھر سات آیتوں میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جب روحیں از سرِ نو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی، نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، جرائم کی بازپرس ہوگی، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنت سب چیزیں نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ آخرت کا یہ سارا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہہ کر انسان کو سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس وقت ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کا مضمون لیا گیا ہے۔ اس میں اہلِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں ہے، نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے، بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے ایک بزرگ، عالی مقام اور امانت دار پیغامبر کا بیان ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے آسمان کے افق پر دن کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس تعلیم سے منہ موڑ کر آخر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟

الانفطار

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْفَطَرَتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنفطار مصدر ہے جس کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا اور سورۂ تکویر کا مضمون ایک دوسرے سے نہایت مشابہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت ہے۔ مُسند احمد، ترمذی، ابن المنذر، طبرانی، حاکم اور ابن مَرْدُوْیَہ کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا: مَنْ سَرَّہٗ اَنْ ینظر الی یوم القیٰمۃ کانہ رأی عین فلیقرأ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ، وَ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ "جو شخص چاہتا ہو کہ روزِ قیامت کو اس طرح دیکھ لے جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سورۂ تکویر اور سورۂ انفطار، اور سورۂ اِنشقاق کو پڑھ لے۔"

اِس میں سب سے پہلے روزِ قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آجائے گا تو ہر شخص کے سامنے اس کا کیا دھرا سب آجائے گا۔ اس کے بعد انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس رب نے تجھ کو وجود بخشا اور جس کے فضل و کرم کی وجہ سے آج تو سب مخلوقات سے بہتر جسم اور اعضاء لیے پھرتا ہے، اس کے بارے میں یہ دھوکا تجھے

کہاں سے لگ گیا کہ وہ صرف کرم ہی کرنے والا ہے، انصاف کرنے والا نہیں ہے؟ اُس کے کرم کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ تو اس کے انصاف سے بے خوف ہو جائے۔ پھر انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ، تیرا پورا نامۂ اعمال تیار کیا جا رہا ہے۔ اور نہایت معتبر کاتب ہر وقت تیری تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ آخر میں پورے زور کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یقیناً روزِ جزا برپا ہونے والا ہے جس میں نیک لوگوں کو جنّت کا عیش اور بد لوگوں کو جہنّم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، فیصلے کے اختیارات بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

المطفّفین

نام پہلی ہی آیت وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے اندازِ بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اہل مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے درپے سورتیں نازل ہو رہی تھیں، اور اس کا نزول اس زمانے میں ہوا ہے جب اہلِ مکہ نے سڑکوں پر، بازاروں میں اور مجلسوں میں مسلمانوں پر آوازے کسنے اور ان کی توہین و تذلیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، مگر ظلم و ستم اور مار پیٹ کا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض بُری طرح پھیلا ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے (نسائی، ابن ماجہ، ابن مَرْدُوْیَہ، ابن جریر، بیہقی فی شُعَبُ الایمان)۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم سورۂ دہر کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، صحابہ اور تابعین کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملہ پر چسپاں ہوتی ہو اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ اسلیے ابن عباس کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بُری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے اُن کے معاملات درست ہو گئے۔

موضوع اور مضامین اس کا موضوع بھی آخرت ہے۔

پہلی چھ آیتوں میں اُس عام بے ایمانی پر گرفت کی گئی ہے جو کاروباری لوگوں میں بکثرت

پھیلی ہوئی تھی کہ دوسروں سے لینا ہوتا تھا تو پورا ناپ کر اور تول کر لیتے تھے، مگر جب دوسروں کو دینا ہوتا تو ناپ تول میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ گھٹا دیتے تھے۔ معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے اس ایک خرابی کو، جس کی قباحت سے کوئی انکار نہ کر سکتا تھا، بطورِ مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک روز خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے اُس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راستبازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانتداری کو "اچھی پالیسی" سمجھ کر بعض چھوٹے چھوٹے معاملات میں دیانت برت بھی لے تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک "مفید پالیسی" ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچّی اور مستقل دیانتداری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف خدا کے خوف اور آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں دیانت ایک "پالیسی" نہیں بلکہ "فریضہ" قرار پاتی ہے اور آدمی کے اُس پر قائم رہنے اور نہ رہنے کا انحصار دنیا میں اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔

اِس طرح اخلاق کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا تعلق نہایت مؤثر اور دل نشین طریقہ سے واضح کرنے کے بعد آیت ۷ سے ۱۷ تک بتایا گیا ہے کہ بدکار لوگوں کے نامۂ اعمال پہلے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے رجسٹر Black List میں درج ہو رہے ہیں اور آخرت میں ان کو سخت تباہی سے دوچار ہونا ہے۔ پھر آیت ۱۸ سے ۲۸ تک نیک لوگوں کا بہترین انجام بیان کیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اعمال نامے بلند پایہ لوگوں کے رجسٹر میں درج ہو رہے ہیں جس پر مقرب فرشتے مامور ہیں۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تسلّی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کفار کو خبردار بھی کیا گیا ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تذلیل کر رہے ہیں، قیامت کے روز یہی مجرم لوگ اپنی اِس روش کا بہت بُرا انجام دیکھیں گے اور یہی ایمان لانے والے ان مجرموں کا بُرا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔

اَلْاِنْشِقَاق

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اِنْشَقَّتْ سے ماخوذ ہے۔ اِنشقاق مصدر ہے جس کے معنی پھٹ جانے کے ہیں اور اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر آیا ہے

زمانۂ نزول یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اسکے مضمون کی داخلی شہادت یہ بتا رہی ہے کہ ابھی ظلم وستم کا دور شروع نہیں ہوا تھا، البتہ قرآن کی دعوت کو مکہ میں برملا جھٹلایا جا رہا تھا اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور انہیں اپنے خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا پڑے گا۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔

پہلی پانچ آیتوں میں نہ صرف قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے برحق ہونے کی دلیل بھی دے دی گئی ہے۔ اُس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس روز آسمان پھٹ جائے گا، زمین پھیلا کر ہموار میدان بنادی جائے گی، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے (یعنی مردہ انسانوں کے اجزائے بدن اور اُن کے اعمال کی شہادتیں) سب کو نکال کر وہ باہر پھینک دے گی، حتیٰ کہ اس کے اندر کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ آسمان و زمین کے لیے اُن کے رب کا حکم یہی ہوگا اور چونکہ دونوں اُس کی مخلوق ہیں اس لیے وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے، اُن کے لیے حق یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کریں۔

اس کے بعد آیت ۶ سے ۱۹ تک بتایا گیا ہے کہ انسان کو خواہ اِس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ اُس منزل کی طرف چار و ناچار چلا جا رہا ہے جہاں اُسے اپنے رب کے آگے پیش ہونا ہے۔

پھر سب انسان دو حصوں میں بٹ جائیں گے؛ ایک، وہ جن کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائیگا۔ وہ کسی سخت حساب فہمی کے بغیر معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کا نامۂ اعمال پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ کسی طرح انہیں موت آ جائے، مگر مرنے کے بجائے وہ جہنّم میں جھونک دیے جائیں گے۔ ان کا یہ انجام اس لیے ہوگا کہ وہ دنیا میں اس غلط فہمی پر مگن رہے کہ کبھی خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔ حالانکہ ان کا رب اس کے سارے اعمال کو دیکھ رہا تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان اعمال کی باز پرس سے چھوٹ جائیں۔ اُن کا دنیا کی زندگی سے آخرت کی جزاو سزا تک درجہ بدرجہ پہنچنا اُتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج ڈوبنے کے بعد شفق کا نمودار ہونا، دن کے بعد رات کا آنا اور اس میں انسان اور حیوانات کا اپنے اپنے بسیروں کی طرف پلٹنا اور چاند کا ہلال سے بڑھ کر ماہِ کامل بننا یقینی ہے۔

آخر میں اُن کفّار کو دردناک سزا کی خبر دے دی گئی ہے جو قرآن کو سُن کر خدا کے آگے جھکنے کے بجائے الٹی تکذیب کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کو بے حساب اجر کا مژدہ سنا دیا گیا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں۔

البُرُوج

نام پہلی آیت کے لفظ اَلْبُرُوْج کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ مکۂ معظمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی ہے جب ظلم و ستم پوری شدّت کے ساتھ برپا تھا اور کفارِ مکّہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع کفّار کو اُس ظلم و ستم کے برے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے، اور اہلِ ایمان کو یہ تسلّی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اَصحابُ الاُخدود کا قصّہ سنایا گیا ہے جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک پھینک کر جلا دیا تھا۔ اور اس قصّے کے پیرائے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اصحاب الاُخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے اُسی طرح سردارانِ مکّہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان لانے والوں نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کر لیا تھا اور ایمان سے پھرنا قبول نہیں کیا تھا، اُسی طرح اب بھی اہلِ ایمان کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر

کافر بگڑتے اور اہلِ ایمان اصرار کرتے ہیں وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے، اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے، اور وہ دونوں گروہوں کے حال دیکھ رہا ہے۔ اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف اُن کے کفر کی سزا جہنّم کی صورت میں ملے، بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے چرکے دینے کی شکل میں بھگتنی پڑے۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لاکر نیک عمل کرنے والے جنّت میں جائیں، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ پھر کفّار کو خبردار کیا گیا ہے کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے، اگر تم اپنے جتھے کی طاقت کے زعم میں مبتلا ہو تو تم سے بڑے جتھے فرعون اور ثمود کے پاس تھے، ان کے لشکروں کا جو انجام ہوا ہے اس سے سبق حاصل کرو۔ خدا کی قدرت تم پر اس طرح محیط ہے کہ اُس کے گھیرے سے تم نکل نہیں سکتے، اور قرآن، جس کی تکذیب پر تم تلے ہوئے ہو، اُس کی ہر بات اٹل ہے، وہ اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کا لکھا کسی کے بدلے نہیں بدل سکتا۔

الطّارق

نام پہلی ہی آیت کے لفظ الطارق کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضمون کا اندازِ بیان مکۂ معظمہ کی ابتدائی سورتوں سے ملتا جلتا ہے، مگر یہ اُس زمانے کی نازل شدہ ہے جب کفّارِ مکّہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ہر طرح کی چالیں چل رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اس میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جسے کفار کی کوئی چال اور تدبیر زک نہیں دے سکتی۔

سب سے پہلے آسمان کے تاروں کو اِس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔ پھر انسان کو خود اس کی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح نطفے کی ایک بوند سے اس کو وجود میں لایا گیا اور جیتا جاگتا انسان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو خدا اِس طرح اُسے وجود میں لایا ہے وہ یقیناً اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور یہ دوبارہ پیدائش اِس غرض کے لیے ہو گی کہ انسان کے اُن تمام رازوں کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر دنیا میں پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ اُس وقت اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انسان نہ اپنے بل بوتے پر بچ سکے گا اور نہ کوئی اس کی مدد کو آسکے گا۔

خاتمۂ کلام پر ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش کا برسنا اور زمین سے درختوں

اور فصلوں کا اُگنا کوئی کھیل نہیں بلکہ ایک سنجیدہ کام ہے، اُسی طرح قرآن میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں وہ بھی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں بلکہ پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ کفار اس غلط فہمی میں ہیں کہ اُن کی چالیں اِس قرآن کی دعوت کو زک دے دیں گی، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ اللہ بھی ایک تدبیر میں لگا ہوا ہے اور اسکی تدبیر کے آگے کفار کی چالیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ پھر ایک فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی اور در پردہ کفار کو یہ دھمکی دے کر بات ختم کردی گئی ہے کہ آپؐ ذرا صبر سے کام لیں اور کچھ مدت کفار کو اپنی سی کر لینے دیں، زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی چالیں قرآن کو زک دیتی ہیں یا قرآن اُسی جگہ غالب آکر رہتا ہے جہاں یہ اُسے زک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

الاعلیٰ

نام پہلی ہی آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کے لفظ اَلْاَعْلیٰ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اِس کے مضمون سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، اور آیت نمبر ۶ کے یہ الفاظ بھی کہ "ہم تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولوگے" یہ بتاتے ہیں کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نزولِ وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں اُس کے الفاظ بھول نہ جاؤں۔ اِس آیت کے ساتھ اگر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ اور سورۂ قیامہ کی آیات ۱۶-۱۹ کو ملا کر دیکھا جائے، اور تینوں آیتوں کے اندازِ بیان اور موقع و محل پر غور کیا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اِس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ آپ فکر نہ کریں، ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپ اِسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد، دوسرے موقع پر جب سورۂ قیامہ نازل ہو رہی تھی، حضور بے اختیار الفاظِ وحی کو دہرانے لگے۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ "اے نبی، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اس کی قرأت غور سے سنتے رہو، پھر اِس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔" آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقع پر حضورؐ کو پھر بتقاضائے بشریت اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ آیتیں جو متواتر نازل ہوئی ہیں ان میں سے کوئی چیز میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپ اُن کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر فرمایا گیا "اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔" اِس کے بعد پھر کبھی اِس کی نوبت نہیں آئی کہ حضورؐ کو ایسا کوئی خطرہ

لاحق ہوتا، کیونکہ ان مقامات کے سوا کوئی چوتھا مقام قرآن میں ایسا نہیں ہے جہاں اِس معاملہ کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہو۔

موضوع اور مضمون

اس چھوٹی سی سورۃ کے تین موضوع ہیں۔ توحید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور آخرت۔

پہلی آیت میں توحید کی تعلیم کو اس ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کی جائے، یعنی اُس کو کسی ایسے نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا مخلوقات سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی فاسد عقائد پیدا ہوئے ہیں اُن سب کی جڑ اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی نہ کوئی غلط تصور ہے جس نے اُس ذاتِ پاک کے لیے کسی غلط نام کی شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا عقیدے کی تصحیح کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کو صرف اُن اسماءِ حسنیٰ ہی سے یاد کیا جائے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہیں۔

اِس کے بعد تین آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ تمہارا رب، جس کے نام کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اُس کا تناسب قائم کیا، اُس کی تقدیر بنائی، اُسے وہ کام انجام دینے کی راہ بتائی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے اُس کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہے ہو کہ وہ زمین پر نباتات کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر انہیں خس و خاشاک بھی بنا دیتا ہے۔ کوئی ہستی نہ بہار لانے پر قادر ہے نہ خزاں کو آنے سے روک سکتی ہے۔

پھر دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ اِس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ قرآن جو آپ پر نازل کیا جا رہا ہے، یہ لفظ بہ لفظ آپ کو یاد کیسے رہے گا۔ اِس کو آپ کے حافظے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے، اور اس کا محفوظ رہنا آپ کے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم چاہیں تو اسے بھُلا دیں۔

اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سپرد ہر ایک کو راہِ راست پر لے آنے کا کام نہیں کیا گیا ہے بلکہ آپ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے، اور تبلیغ کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو اُسے نصیحت کی جائے اور جو اس کے لیے تیار نہ ہو اُس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ جس کے دل میں گمراہی کے انجامِ بد کا خوف ہو گا وہ حق بات کو سن کر

قبول کرے گا اور جو بدبخت اُسے سُننے اور قبول کرنے سے گریز کرے گا وہ اپنا بُرا انجام خود دیکھ لے گا۔

آخر میں کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ فلاح صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کریں، اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھیں۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں ساری فکر بس اِسی دنیا کے آرام و آسائش اور فائدوں اور لذتوں کی ہے، حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف قرآن ہی میں نہیں بتائی جا رہی ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی انسان کو اِسی حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔

الغاشیۃ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ الغاشیۃ کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورۃ کا پورا مضمون اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب حضورؐ تبلیغِ عام شروع کر چکے تھے اور مکّے کے لوگ بالعموم اُسے سُن سُن کر نظر انداز کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اِس کے موضوع کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ زیادہ تر دو ہی باتیں لوگوں کے ذہن نشین کرنے پر مرکوز تھی۔ ایک توحید، دوسرے آخرت۔ اور اہلِ مکّہ اِن دونوں باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب اِس سورہ کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کیجیے۔

اس میں سب سے پہلے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے اچانک اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ تمہیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب سارے عالم پر چھا جانے والی ایک آفت نازل ہوگی؟ اس کے بعد فوراً ہی یہ تفصیل بیان کرنی شروع کر دی گئی ہے کہ اُس وقت سارے انسان دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر دو مختلف انجام دیکھیں گے۔ ایک وہ جو جہنّم میں جائیں گے اور اُنہیں ایسے اور ایسے سخت عذاب جھیلنے ہوں گے۔ دوسرے وہ جو عالی مقام جنّت میں جائیں گے اور اُن کو ایسی اور ایسی نعمتیں میسّر ہوں گی۔

اس طرح لوگوں کو چونکانے کے بعد یکلخت مضمون تبدیل ہوتا ہے اور سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ جو قرآن کی تعلیمِ توحید اور خبرِ آخرت کو سن کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، اپنے سامنے کی

اُن چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے ہر وقت اِنہیں سابقہ پیش آتا ہے ؛ عرب کے صحرا میں جن اونٹوں پر ان کی زندگی کا انحصار ہے، کبھی یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ کیسے ٹھیک اُنہی خصوصیات کے مطابق بن گئے جیسی خصوصیات کے جانوروں کی ضرورت اِن کی صحرائی زندگی کے لیے تھی ؟ اپنے سفروں میں جب یہ چلتے ہیں تو اِنہیں یا آسمان نظر آتا ہے، یا پہاڑ، یا زمین۔ اِنہی تین چیزوں پر یہ غور کریں۔ اوپر یہ آسمان کیسے چھا گیا ؟ سامنے یہ پہاڑ کیسے کھڑے ہو گئے ؟ نیچے یہ زمین کیسے بچھ گئی ؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادر مطلق صانع حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے ؟ اگر یہ مانتے ہیں کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی قدرت کے ساتھ ان چیزوں کو بنایا ہے، اور کوئی دوسرا اِن کی تخلیق میں شریک نہیں ہے، تو اُسی کو اکیلا رب ماننے سے اِنہیں کیوں انکار ہے ؟ اور اگر یہ مانتے ہیں کہ وہ خدا یہ سب کچھ پیدا کرنے پر قادر تھا، تو آخر کس معقول دلیل سے اِنہیں یہ ماننے میں تامّل ہے کہ وہی خدا قیامت لانے پر بھی قادر ہے ؟ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے ، جنت اور دوزخ بنانے پر بھی قادر ہے ؟

اِس مختصر اور نہایت معقول استدلال سے بات سمجھانے کے بعد کفّار کی طرف سے رُخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا جاتا ہے اور آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، تم اِن پر جبّار ہو کر تو مسلط کیے نہیں گئے ہو کہ زبردستی اِن سے منوا کر ہی چھوڑو۔ تمہارا کام نصیحت کرنا ہے، سو تم نصیحت کیے جاؤ۔ آخر کار اِنہیں آنا ہمارے ہی پاس ہے۔ اُس وقت ہم اِن سے پورا پورا حساب لیں گے اور نہ ماننے والوں کو بھی بھاری سزا دیں گے۔

الفَجْر

نام پہلے ہی لفظ وَالفَجر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکۂ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی چکی چلنی شروع ہو چکی تھی۔ اِس بنا پر اہلِ مکہ کو عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اثبات ہے جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے۔ اِس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب وار استدلال کیا گیا ہے، اس کو اُسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ جس بات کا تم انکار کر رہے ہو اُس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں اِن چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس باقاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور ان کی قسم کھا کر یہ سوال اِس معنی میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اِس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اِس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس خدا نے قائم کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس کرے؟

اس کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے بطورِ مثال عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گذر گئے اور زمین میں انہوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر پڑ گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں

نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی چوپٹ راجہ کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرمانروائے حکیم و دانا اس پر حکمرانی کر رہا ہے جس کی حکمت اور عدل کا یہ تقاضا خود اس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے کہ عقل اور اخلاقی حس دے کر جس مخلوق کو اس نے یہاں تصرف کے اختیارات دیے ہیں اس کا محاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عرب جاہلیت کی حالت تو اس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خصوصیت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک، لوگوں کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حصول یا فقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دیے بیٹھے تھے اور اس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس روش پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا یہ طرزِ عمل کہ یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس مپرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، جس کا بس چلتا ہے مُردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حق داروں کو دھتا بتا دیتا ہے، اور مال کی حرص لوگوں کو ایک ایسی نہ بجھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مقصود لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرزِ عمل ہے ان کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو۔

پھر کلام کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہو گا اور ضرور ہو گا اور وہ اُس روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو گی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں وہ بات آجائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ منکر انسان ہاتھ ملتا رہ جائیگا کہ کاش میں نے دنیا میں اِس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی البتہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہو گا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاء پیش کر رہے تھے، خدا ان سے راضی ہو گا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہونگے، انہیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔

البلد

نام

پہلی ہی آیت لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ کے لفظ البلد کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اس کا مضمون اور انداز بیان مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں کا سا ہے مگر ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتہ دیتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ وہ تھا جب کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر تل گئے تھے اور آپ کے خلاف ہر ظلم و زیادتی کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون

اس سورے میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے اور یہ قرآن کا کمالِ ایجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے شکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اس چھوٹی سی سورۃ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں، ان کو دیکھنے اور ان پر چلنے کے وسائل بھی اسے فراہم کر دیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہر مکہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے مصائب اور پوری اولاد آدم کی حالت کو اس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدائش ہی مشقت کی حالت میں ہوئی ہے۔ اس مضمون کو اگر سورۂ نجم کی آیت ۳۹ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا

کا مشعی ۰ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اِس کارگاہ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے۔

اِس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصورات میں سے ایک چیز کو بطور مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بڑائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبریائی کی نمائش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے وہ خود بھی اپنی اِن شاہ خرچیوں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں، حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اُس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی بلکہ نفس کو خوب لذت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اِس گھاٹی پر چڑھنے کی بہ نسبت کھڈ میں لڑھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمائش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال یتیموں اور مسکینوں کی مدد پر خرچ کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خلق پر رحم کھانے والا ہو۔ اِس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

الشمس

نام پہلے ہی لفظ الشمس کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مضمون اور اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا اور اُن لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورت کے آغاز سے شروع ہو کر آیت ۱۰ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۱ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصہ میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں، اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں۔ یہ دونوں نہ اپنی شکل میں یکساں ہیں اور نہ اُن کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو جسم، حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر دنیا میں بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعہ سے اُس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، بھلے اور بُرے کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس اُتار دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اِس پر ہے کہ اس کے اندر تمیز، اور فیصلے کی جو قوتیں اللہ نے رکھ دی ہیں ان کو استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں

ے کس کو ابھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ اگر وہ اچھے رُجحانات کو ابھارے اور بُرے رُجحانات سے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر وہ نفس کی اچھائی کو دبائے اور بُرائی کو ابھارے تو نامراد ہوگا۔

دوسرے حصّے میں قوم ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیّت سمجھائی گئی ہے۔ رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور بُرائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر و شر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُس فطری الہام کی مدد کے لیے انبیاء علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ایسے ہی ایک نبی، حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے نفس کی برائی میں غرق ہو کر اتنی سرکش ہو گئی کہ اُس نے اُن کو جُھٹلا دیا، اور اُس کا منہ مانگا معجزہ جب انہوں نے ایک اونٹنی کی شکل میں پیش کیا تو اُن کی تنبیہ کے باوجود اُس قوم کے ایک شریر ترین آدمی نے ساری قوم کی خواہش اور طلب کے مطابق اسے بھی قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔

ثمود کا یہ قصّہ پیش کرتے ہوئے پوری سورت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے قوم قریش، اگر تم ثمود کی طرح اپنے نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاؤ گے تو وہی انجام دیکھو گے جو ثمود نے دیکھا ہے۔ مکّہ میں اُس وقت حالات وہی موجود تھے جو صالح علیہ السلام کے مقابلہ میں قوم ثمود کے اشرار نے پیدا کر رکھے تھے۔ اس لیے اُن حالات میں یہ قصّہ سنا دینا بجائے خود اہلِ مکّہ کو یہ سمجھا دینے کے لیے کافی تھا کہ ثمود کی یہ تاریخی نظیر اُن پر کس طرح چسپاں ہو رہی ہے۔

اللَّیل

نام پہلے ہی لفظ وَالَّیْلِ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون سورۂ شمس سے اس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے جسے سورۂ شمس میں ایک طریقے سے سمجھایا گیا ہے اور اس سورہ میں دوسرے طریقے سے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آغاز سے آیت ۱۱ تک ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۲ سے آخر تک۔

پہلے حصہ میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد، اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی و عمل بھی کر رہے ہیں، وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح دن رات سے اور نر مادہ سے مختلف ہے۔ اس کے بعد قرآن کی مختصر سورتوں کے عام اندازِ بیان کے مطابق تین اخلاقی خصوصیات ایک نوعیت کی، اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی و عمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لے کر بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جنہیں سن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات کس طرزِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی خصوصیات اس کے برعکس کس دوسرے طرزِ زندگی کی علامات ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت نپے تلے فقروں میں بیان کیے گئے ہیں کہ سنتے ہی آدمی کے دل میں

اتر جائیں اور زبان پر چڑھ جائیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے، خدا ترسی و پرہیزگاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے۔ دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بخل کرے، خدا کی رضا اور ناراضی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھٹلا دے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرزِ عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں ہیں، بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں اسی قدر ان کے نتائج بھی متضاد ہیں۔ پہلے طرزِ عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور بدی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور دوسرے طرزِ عمل کو جو بھی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے بکٹ اور سخت راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔ اس بیان کو ایک نہایت مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال جس کے پیچھے آدمی جان دیے دیتا ہے، آخر قبر میں تو اُس کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، مرنے کے بعد یہ اُس کے کس کام آئے گا؟

دوسرے حصے میں بھی اسی اختصار کے ساتھ تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے دُنیا کی اِس امتحان گاہ میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُس نے یہ بتا دینا اپنے ذمّہ لیا ہے کہ زندگی کے مختلف راستوں میں سے سیدھا راستہ کونسا ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اپنا رسول اور اپنی کتاب بھیج کر اُس نے اپنی یہ ذمّہ داری ادا کر دی ہے، کیونکہ رسولؐ اور قرآن، دونوں ہدایت دینے کے لیے سب کے سامنے موجود تھے۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ دنیا مانگو گے تو وہ بھی اسی سے ملے گی اور آخرت مانگو گے تو اس کا دینے والا بھی وہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے کہ تم اُس سے کیا مانگتے ہو۔ تیسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو بدبخت اُس بھلائی کو جھٹلائے گا جسے رسول اور کتاب کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے، اور اُس سے منہ پھیرے گا اُس کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار ہے۔ اور جو خدا ترس آدمی پورے بے غرضی کے ساتھ محض اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر اپنا مال راہِ خیر میں صرف کرے گا اس کا رب اُس سے راضی ہوگا اور اسے اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

الضُّحٰی

نام پہلے ہی لفظ وَالضُّحیٰ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا تھا جس سے حضور سخت پریشان ہو گئے تھے اور بار بار آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ کسی ناراضی کی بنا پر نہیں روکا گیا تھا، بلکہ اس میں وہی مصلحت کار فرما تھی جو روزِ روشن کے بعد رات کا سکون طاری کرنے میں کار فرما ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی تیز روشنی اگر آپ پر برابر پڑتی رہتی تو آپ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکتے، اس لیے بیچ میں وقفہ دیا گیا تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ یہ کیفیت حضورؐ پر نبوت کے ابتدائی دور میں گزرتی تھی جبکہ ابھی آپ کو وحی کے نزول کی شدت برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی، اس بنا پر بیچ بیچ میں وقفہ دینا ضروری ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ مدثر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اور سورۂ مزّمل حاشیہ ۵ میں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کا کس قدر شدید بار آپ کے اعصاب پر پڑتا تھا۔ بعد میں جب حضورؐ کے اندر اس بار کو برداشت کرنے کا تحمل پیدا ہو گیا تو طویل وقفے دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپ کو

اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔

اس کے بعد آپ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں جن شدید مشکلات سے سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی عطا و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی اُن صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت کہیں دُور دُور بھی اِس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے اُسے اِتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہو گئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنایا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شاملِ حال ہے۔ اس مقام پر سورۂ طٰہٰ آیات ۳۷ تا ۴۲ کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جہاں حضرت موسیٰ کو فرعون جیسے جبّار کے مقابلہ میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی پریشانی دور کرنے کے لیے انہیں بتایا ہے کہ کس طرح تمہاری پیدائش کے وقت سے ہماری مہربانیاں تمہارے شاملِ حال رہی ہیں، اس لیے تم اطمینان رکھو کہ اِس خوفناک مہم میں تم اکیلے نہ ہو گے بلکہ ہمارا فضل تمہارے ساتھ ہو گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ جو احسانات ہم نے تم پر کیے ہیں ان کے جواب میں خلقِ خدا کے ساتھ تمہارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اور ہماری نعمتوں کا شکر تمہیں کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ

نام پہلے ہی فقرے کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون سورۂ ضحیٰ سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے اور ایک جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مکہ معظمہ میں والضحیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا مقصود و مدعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلّی دینا ہے۔ نبوّت سے پہلے حضورؐ کو کبھی اُن حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جن کا سامنا نبوت کے بعد دعوتِ اسلامی کا آغاز کرتے ہی یکایک آپ کو کرنا پڑا۔ یہ خود آپ کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم تھا جس کا کوئی اندازہ آپ کو قبل نبوت کی زندگی میں نہ تھا۔ اسلام کی تبلیغ آپ نے کیا شروع کی کہ دیکھتے دیکھتے وہی معاشرہ آپ کا دشمن ہو گیا جس میں آپ پہلے بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہی رشتہ دار، دوست، اہلِ قبیلہ اور اہلِ محلہ آپ کو گالیاں دینے لگے جو پہلے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مکّہ میں کوئی آپ کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ راہ چلتے آپ پر آوازے کسے جانے لگے۔ قدم قدم پر آپ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ آپ کو اِن حالات، بلکہ اِن سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی، لیکن ابتدائی زمانہ آپ کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ اسی بنا پر آپ کو تسلّی دینے کے لیے پہلے سورۂ ضحیٰ نازل کی گئی اور پھر اس سورت کا نزول ہوا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپ کو تین بہت بڑی

نعمتیں عطا کی ہیں جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں۔ ایک شرح صدر کی نعمت دوسری یہ نعمت کہ آپ کے اوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو نبوت سے پہلے آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ تیسری رفعِ ذکر کی نعمت جو آپ سے بڑھ کر تو در کنار آپ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔ آگے چل کر ہم نے اپنے حواشی میں وضاحت کر دی ہے کہ اِن تینوں نعمتوں سے مراد کیا ہے اور یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

اِس کے بعد ربِّ کائنات اپنے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور، جس سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، کوئی بہت لمبا دور نہیں ہے بلکہ اِس تنگی کے ساتھ ہی ساتھ فراخی کا دور بھی لگا چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ ضحیٰ میں اِس طرح فرمائی گئی تھی کہ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا اور عنقریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

آخر میں حضورؐ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ابتدائی دور کی اِن سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپ فارغ ہوں تو عبادت کی مشقت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لو لگائیں۔ یہ وہی ہدایت ہے جو زیادہ تفصیل کے ساتھ حضورؐ کو سورۂ مزمل آیات ۱ تا ۹ میں دی گئی ہے۔

التِّین

نام

پہلے ہی لفظ اَلتِّین کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

قتادہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں ایک یہ کہ یہ مکّی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور علماء اسے مکّی ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے مکّی ہونے کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ اس میں شہر مکّہ کے لیے هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (یہ پرامن شہر) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا نزول مدینہ میں ہوا ہوتا تو مکہ کے لیے "یہ شہر" کہنا صحیح نہیں ہو سکتا تھا۔ علاوہ بریں سورت کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظّمہ کے بھی ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں کا ہے، کیونکہ اس میں کوئی نشان اس امر کا نہیں پایا جاتا کہ اس کے نزول کے وقت کفر و اسلام کی کشمکش برپا ہو چکی تھی، اور اس کے اندر مکّی دور کی ابتدائی سورتوں کا وہی انداز بیان پایا جاتا ہے جس میں نہایت مختصر اور دلنشین طریقہ سے لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا ضروری اور سراسر معقول ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع ہے جزا و سزا کا اثبات۔ اِس غرض کے لیے سب سے پہلے جلیل القدر انبیاءؑ کے مقاماتِ ظہور کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً کہیں فرمایا کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا (البقرہ، ۳۰-۳۴۔ الانعام، ۱۶۵۔ الاعراف، ۱۱۔ الحجر، ۲۸-۲۹۔ النمل، ۶۲۔ صٓ ۷۱ تا ۷۳) کہیں فرمایا کہ انسان اُس امانتِ الٰہی کا حامل ہوا ہے جسے اٹھانے کی طاقت زمین و آسمان اور پہاڑوں میں بھی نہ تھی (الاحزاب، ۷۲) کہیں فرمایا کہ

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی (بنی اسرائیل ۷۰) لیکن یہاں خاص طور پر انبیاء کے مقاماتِ ظہور کی قسم کھا کر یہ فرمانا کہ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اتنی بہتر ساخت عطا کی گئی کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے جس سے اونچا منصب خدا کی کسی دوسری مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جو اس بہترین ساخت پر پیدا ہونے کے بعد بُرائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اُس انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن سے زیادہ نیچ کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی، دوسرے وہ جو ایمان و عمل صالح کا راستہ اختیار کر کے اس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں اور اُس مقامِ بلند پر قائم رہتے ہیں جو ان کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نوعِ انسانی میں دونوں قسموں کے لوگوں کا پایا جانا ایک ایسا امرِ واقعی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا مشاہدہ انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

آخر میں اِس امرِ واقعی سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب انسانوں میں یہ دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں تو پھر جزائے اعمال کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے! اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی اجر نہ ملے، اور انجام کار دونوں کا یکساں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کوئی انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت اور انسان کی عقلِ عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے۔ پھر یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ اللہ، جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ انصاف نہیں کرے گا۔

العلق

نام دوسری آیت کے لفظِ عَلَق کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اِس سورۃ کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصہ اِقْرَاْ سے شروع ہو کر پانچویں آیت کے الفاظ مَالَمْ یَعْلَمْ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصہ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی سے شروع ہو کر آخر سورۃ تک چلتا ہے۔ پہلے حصے کے متعلق علمائے امّت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی۔ اِس معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جسے امام احمدؒ، بخاری، مسلم اور دوسرے محدّثین نے متعدد سندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے، اور اس میں حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر آغازِ وحی کا پورا قصہ بیان کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ابن عباسؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور صحابہ کی ایک جماعت سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیات جو حضورؐ پر نازل ہوئیں وہ یہی تھیں۔ دوسرا حصہ بعد میں اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابو جہل نے آپ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کوشش کی۔

آغازِ وحی محدّثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچّے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے (حضرت عائشہؓ نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہری نے تعبّد سے کی ہے۔

یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا) آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جبکہ آپ غارِ حراء میں تھے، یکایک آپ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ اس کے بعد حضرت عائشہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر کھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا) یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے فرمایا "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔" پھر سارا قصہ آپ نے ان کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" انہوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے، خدا کی قسم آپ کو خدا کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔" پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیے۔ وَرَقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے

موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی جوان ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے"؟ وَرَقہ نے کہا "ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اِس چیز کا طالب یا مُتوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تأثّر آپ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثے کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکّہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر اُن میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصّے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوّت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اِس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حراء میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تامّل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح وَرَقہ بن نوفل بھی مکّہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ

انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

دوسرے حصّہ کی شانِ نزول

اس سورہ کا دوسرا حصّہ اس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں اسلامی طریقہ پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اِس سے روکنا چاہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اِس کے کہ حضورؐ اسلام کی علانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپ نے حَرَم میں اُس طریقے پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائی تھی، اور یہی وہ چیز تھی جس سے قریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگ تو اِسے حیرت ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابوجہل کی رگِ جاہلیت اِس پر پھڑک اٹھی اور اُس نے آپ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اِس طریقے پر حرم میں عبادت نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں جن میں ابوجہل کی اِن بیہودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں"؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا "لات اور عُزّیٰ کی قسم، اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور اُن کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا"۔ پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تاکہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا میرے اور اُن کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پَر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اُس کے چیتھڑے اڑا دیتے (احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردُویہ، ابونعیم، اصفہانی، بیہقی)

ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ ابوجہل نے کہا اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ علانیہ اُسے آ پکڑیں گے (بخاری، ترمذی،

نسائی، ابن جریر، عبدالرزاق، عبدبن حُمَید، ابن المُنذِر، ابن مَردُویہ)

ابن عباس رضؓ کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے ابوجہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو اُس نے کہا اے محمدؐ، کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ اور اس نے آپ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اِس پر اس نے کہا اے محمدؐ تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم، اِس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن المُنذِر، طبرانی، ابن مَردُویہ)

اِنہی واقعات پر اس سورہ کا وہ حصہ نازل ہوا جو كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰیٓ سے شروع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اس حصے کا مقام وہی ہونا چاہیے تھا جو قرآن کی اِس سورۃ میں رکھا گیا ہے کیونکہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد اسلام کا اوّلین اظہار حضورؐ نے نماز ہی سے کیا تھا، اور کفار سے آپ کی مڈبھیڑ کا آغاز بھی اِسی واقعہ سے ہوا تھا۔

القدر

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقَدْر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابوحیان نے البحر المحیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ علی بن احمد الواحدی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورۃ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بخلاف اس کے الماوَرْدی کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مکی ہے، اور یہی بات امام سیوطی نے اِتقان میں لکھی ہے۔ ابن مَرْدُوْیہ نے ابن عباس، ابن الزبیر اور حضرت عائشہؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورۃ کے مضمون پر غور کرنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کو مکہ ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب میں اِسے سورۂ عَلَق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتاب پاک کے نزول کا آغاز سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا اُسی کے متعلق اِس سورہ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ کس تقدیر ساز رات میں نازل ہوئی ہے، کیسی جلیل القدر کتاب ہے اور اس کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔

سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اِسے نازل کیا ہے۔ یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اِس کا نزول ہماری طرف سے شبِ قدر میں ہوا ہے۔ شبِ قدر کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ وہ رات ہے جس میں تقدیروں کے

فیصلے کر دیے جاتے ہیں، یا بالفاظ دیگر یہ کوئی معمولی رات عام راتوں جیسی نہیں ہے، بلکہ یہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کی رات ہے اس میں اِس کتاب کا نزول محض ایک کتاب کا نزول نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو نہ صرف قریش، نہ صرف عرب، بلکہ دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا۔ یہی بات سورۂ دُخان میں بھی فرمائی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ دُخان کا دیباچہ اور حاشیہ ۳)

دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ بڑی قدر و منزلت اور عظمت و شرف رکھنے والی رات ہے، اور آگے اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس سے کفارِ مکہ کو گویا متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی نادانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اِس کتاب کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہو اور کوس رہے ہو کہ یہ کیا بلا ہم پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ جس رات کو اِس کے نزول کا فیصلہ صادر کیا گیا وہ اتنی خیر و برکت کی رات تھی کہ کبھی انسانی تاریخ کے ہزار مہینوں میں بھی انسان کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا تھا جو اس رات میں کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سورۂ دُخان آیت ۳ میں ایک دوسرے طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اُس سورہ کے دیباچے میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اِس رات کو فرشتے اور جبریل اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر نازل ہوتے ہیں (جسے سورۂ دُخان آیت ۴ میں امرِ حکیم کہا گیا ہے) اور وہ شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے، یعنی اس میں کسی شر کا دخل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے بالآخر بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں کوئی بُرائی مقصود نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو خیر کے لیے ہوتا ہے نہ کہ شر کے لیے۔

البیّنۃ

نام پہلی آیت کے لفظ البیّنۃ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے بھی مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ مکی ہے اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک مدنی ہے۔ ابن الزُّبیر اور عطاء بن یسار کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے، دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ حضرت عائشہ اسے مکی قرار دیتی ہیں۔ ابو حیان صاحبِ بحر المحیط اور عبد المنعم ابن الفرس صاحبِ احکام القرآن اِس کے مکی ہونے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک اِس کے مضمون کا تعلق ہے اُس میں کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جو اِس کے مکی یا مدنی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

موضوع اور مضمون قرآن مجید کی ترتیب میں اِس کو سورۂ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ عَلَق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی اور اِس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اِس کتابِ پاک کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

سب سے پہلے رسول بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے اُس سے اُن کا نکلنا اِسکے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیلِ روشن ہو، اور وہ لوگوں کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی اُن تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے پچھلی کتبِ آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے اور بالکل راست اور درست

تعلیمات پر مشتمل ہو۔

اس کے بعد اہلِ کتاب کی گمراہیوں کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ اُن کے اِن مختلف راستوں میں بھٹکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، بلکہ وہ اِس کے بعد بھٹکے کہ راہ راست کا بیانِ واضح اُن کے پاس آچکا تھا۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی گمراہیوں کے وہ خود ذمہ دار ہیں، اور اب پھر اللہ کے اِس رسول کے ذریعہ سے بیانِ واضح آجانے کے بعد بھی اگر وہ بھٹکتے ہی رہیں گے تو اُن کی ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

اِسی سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاءؑ بھی آئے تھے۔ اور جو کتابیں بھی بھیجی گئی تھیں، اُنہوں نے اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے، کسی اور کی عبادت و بندگی اور اطاعت و پرستش کو اس کے ساتھ شامل نہ کیا جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی ہمیشہ سے ایک صحیح دین رہا ہے۔ اِس سے بھی یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب نے اِس اصل دین سے ہٹ کر اپنے مذہبوں میں جن نئی نئی باتوں کا اضافہ کر لیا ہے وہ سب باطل ہیں، اور اللہ کا یہ رسول۔ جو اب آیا ہے اُسی اصل دین کی طرف پلٹنے کی اُنہیں دعوت دے رہا ہے۔

آخر میں صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور مشرکین اِس رسول کو ماننے سے انکار کریں گے وہ بد ترین خلائق ہیں، اُن کی سزا ابدی جہنّم ہے، اور جو لوگ ایمان لا کر عملِ صالح کا طریقہ اختیار کر لیں گے اور دُنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے وہ۔ بہترین خلائق ہیں، اُن کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جنّت میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

الزِّلزَالُ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ زِلْزَالَھَا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابن مسعودؓ، عطاءؒ، جابرؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ یہ مکّی ہے اور ابن عباسؓ کا بھی ایک قول اس کی تائید کرتا ہے۔ بخلاف اس کے قتادہؒ اور مقاتلؒ کہتے ہیں کہ یہ مدنی ہے اور ابن عباسؓ سے بھی دوسرا قول اس کے مدنی ہونے کی تائید میں نقل ہوا ہے۔ اس کے مدنی ہونے پر حضرت ابوسعید خُدریؓ کی اُس روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو ابن ابی حاتم نے اُن سے نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا یہ بڑے گناہ؟ آپ نے جواب دیا ہاں۔ میں نے عرض کیا اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ اس پر میں نے کہا پھر تو میں مارا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا خوش ہو جاؤ اے ابوسعید، کیونکہ ہر نیکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ اس حدیث سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر استدلال کی بنا یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خُدری مدینے کے رہنے والے تھے اور غزوۂ اُحد کے بعد سنِ بلوغ کو پہنچے۔ اس لیے اگر یہ سورۃ اُن کی موجودگی میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ ان کے بیان سے ظاہر ہے، تو اسے مدنی ہونا چاہیے۔ لیکن صحابہ اور تابعین کا جو طریقہ آیات اور سورتوں کی شانِ نزول کے بارے میں تھا اس کی تشریح اس سے پہلے ہم سورۂ دہر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اس لیے کسی صحابی کا یہ کہنا کہ یہ آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی، اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس کا نزول اُسی وقت ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت

ابو سعید نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سورۃ سنی ہو اس وقت اِس کے آخری حصے سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے حضورؐ سے وہ سوالات کیے ہوں جو اوپر درج کیے گئے ہیں، اور اس واقعہ کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہو کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضورؐ سے یہ عرض کیا۔ اگر یہ روایت سامنے نہ ہو تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ یہ مکی سورۃ ہے، بلکہ اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے تو اس کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ مکّے کے بھی اس ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہو گی جب نہایت مختصر اور انتہائی دل نشین طریقہ سے اسلام کے بنیادی عقائد لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع ہے موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں اُن سب اعمال کا پورا کچا چٹھا انسان کے سامنے آجانا جو اُس دنیا میں کیے تھے سب سے پہلے تین مختصر فقروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور انسان کے لیے کیسی حیران کُن ہو گی۔ پھر دو فقروں میں بتایا گیا ہے کہ یہی زمین جس پر رہ کر انسان نے بے فکری کے ساتھ ہر طرح کے اعمال کیے ہیں، اور جس کے متعلق کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ بے جان چیز کس وقت اُس کے افعال کی گواہی دے گی، اس روز اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے گی اور ایک ایک انسان کے متعلق یہ بیان کر دے گی کہ کس وقت کہاں اس نے کیا کام کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اُس دن زمین کے گوشے گوشے سے انسان گروہ در گروہ اپنے مرقدوں سے نکل نکل کر آئیں گے تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں، اور اعمال کی یہ پیشی ایسی مکمل اور مفصل ہو گی کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو سامنے نہ آجائے۔

العٰدِیٰت

نام پہلے ہی لفظ اَلْعٰدِیٰت کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جابر، حسن بصری، عکرمہ اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ حضرت انس بن مالک اور قتادہ کہتے ہیں کہ مدنی ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سورۃ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے لیکن سورۃ کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے، بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا مقصود لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اُس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ لوگوں کو اس بات سے خبردار بھی کرنا ہے کہ آخرت میں صرف اُن کے ظاہری افعال ہی کی نہیں بلکہ اُن کے دلوں میں چھپے ہوئے اَسرار تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔

اس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اُس عام بدامنی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کشت و خون برپا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چین سے نہیں گزار سکتا تھا کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ

بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ اِس صورت حال کی طرف اشارہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں خدا کے حضور جواب سے ناواقف ہو کر انسان اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو ظلم وستم اور غارت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ مال و دولت کی محبّت میں اندھا ہو کر ہر طریقے سے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور گھناؤنا طریقہ ہو، اور اس کی حالت خود اِس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کر کے اس کی ناشکری کر رہا ہے۔ اُس کی یہ روش ہرگز نہ ہوتی اگر وہ اُس وقت کو جانتا ہوتا جب قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا، اور جب وہ ارادے اور وہ اغراض ومقاصد تک دلوں سے نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے جن کی تحریک سے اُس نے دنیا میں طرح طرح کے کام کیے تھے۔ اُس وقت انسانوں کے رب کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا کرکے آیا ہے، اور کس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

القارعة

نام پہلے لفظ اَلْقَارِعَۃ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اسکے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں سارا ذکر قیامت ہی کا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع ہے قیامت اور آخرت۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ کہہ کر چونکا دیا گیا ہے کہ عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ اس طرح سامعین کو کسی ہولناک واقعہ کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کرنے کے بعد دو فقروں میں ان کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیا ہے کہ اُس روز لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح ہر طرف بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے اُکھڑ جائیں گے، ان کی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ دُھنکے ہوئے اون کی طرح ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب لوگوں کا حساب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی تو اُس میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ کس شخص کے نیک اعمال برے اعمال سے زیادہ وزنی ہیں، اور کس کے نیک اعمال کا وزن اس کے برے اعمال کی بہ نسبت ہلکا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ عیش نصیب ہوگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اُس گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

التّکاثُر

نام پہلی آیت کے لفظ اَلتَّکاثُر کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابو حیّان اور شوکانی کہتے ہیں کہ یہ تمام مفسّرین کے نزدیک مکّی ہے۔ اور امام سیوطی کا قول ہے کہ مشہور ترین بات یہی ہے کہ یہ مکّی ہے، لیکن بعض روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر اسے مدنی کہا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں۔

ابن ابی حاتم نے ابو بُریدہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورۃ انصار کے دو قبیلوں، بنی حارثہ اور بنی الحرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کے مفاخر بیان کیے، پھر قبرستان جا کر اپنے مرے ہوئے لوگوں کے مفاخر پیش کیے۔ اس پر یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ۔ لیکن شانِ نزول کے بارے میں صحابہ و تابعین کا جو طریقہ تھا، اس کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو یہ روایت اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ سورۂ تکاثر اسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اِن دونوں قبیلوں کے اِس فعل پر یہ سورۃ چسپاں ہوتی ہے۔

امام بخاری اور ابن جریر نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کو کہ لو ان لابن اٰدم وادیین من مال لتمنیٰ وادیًا ثالثا ولا یملاءُ جوف ابن اٰدم الا التراب (اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنا کرے گا، ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا) قرآن میں سے سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی۔" اس حدیث کو سورۂ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ حضرت اُبیؓ مدینے میں مسلمان ہوئے تھے۔ مگر حضرت اُبیؓ کے اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحابہ کرام کس معنی میں حضورؐ کے اس ارشاد کو قرآن میں سے سمجھتے تھے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اسے قرآن کی ایک آیت سمجھتے تھے تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ صحابہ کی عظیم اکثریت اُن

اصحاب پر مشتمل تھی جو قرآن کے حرف حرف سے واقف تھے، ان کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہوسکتی تھی کہ یہ حدیث قرآن کی ایک آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں سے ہونے کا مطلب قرآن سے ماخوذ ہونا لیا جائے تو اس روایت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جو اصحاب داخلِ اسلام ہوئے تھے انہوں نے جب پہلی مرتبہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سورۃ سنی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے، اور پھر حضورؐ کے مذکورہ بالا ارشاد کے متعلق اُن کو یہ خیال ہوا کہ وہ اِسی سورۃ سے ماخوذ ہے۔

ابن جریر، ترمذی اور ابن المنذر وغیرہ محدثین نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم عذابِ قبر کے بارے میں برابر شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی"۔ اِس کو سورۂ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ عذابِ قبر کا ذکر مدینے ہی میں ہوا تھا مکّے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ قرآن کی مکّی سورتوں میں بکثرت مقامات پر قبر کے عذاب کا ایسے صریح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الانعام، آیت ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ المومنون ۹۹-۱۰۰ المومن ۴۵-۴۶۔ یہ سب مکّی سورتوں ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ کے ارشاد سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا مکّی سورتوں کے نزول سے پہلے سورۂ تکاثُر نازل ہو چکی تھی، اور اُس کے نزول نے عذابِ قبر کے بارے میں صحابہ کے شک کو دُور کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان روایات کے باوجود مفسّرین کی عظیم اکثریت اس کے مکّی ہونے پر متفق ہے ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ مکّی سورۃ ہے، بلکہ اس کا مضمون اور انداز بیان بتا رہا ہے کہ یہ مکّے کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

اِس میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت، اور دنیوی فائدے اور لذتیں اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اور اِنہی چیزوں کے حصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور اس ایک فکر نے اُن کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انہیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اِس کے برے انجام پر متنبہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمہاری آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جواب دہی کرنی ہوگی۔

العَصر

نام پہلی آیت کے لفظ العصر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ مجاہد، قتادہ اور مُقاتِل نے اسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ اُن کو سن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون یہ سورۃ جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اِس کے اندر چند چچے تُلے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بالکل دو ٹوک طریقہ سے بتادیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اِس سورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابہ کرام کی نگاہ میں اِس کی اہمیت کیا تھی، اُس کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حِصْن الدّارمی ابو مَدِینہ کی روایت کے مطابق اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سُنا لیتے (طبرانی)۔

الھُمَزَة

نام پہلی آیت کے لفظ ھُمَزَۃ کو اس سورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکّی ہونے پر تمام مفسّرین کا اتفاق ہے۔ اور اس کے مضمون اور انداز بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی مکّہ کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اِس میں چند ایسی اخلاقی برائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں زر پرست مالداروں کے اندر پائی جاتی تھیں، جنہیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ بُرائیاں فی الواقع اس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور جن کو سب ہی برا برسمجھتے تھے، کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اِس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن لوگوں کا کیا انجام ہوگا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک طرف یہ کردار اور دوسری طرف آخرت میں اُس کا یہ انجام) ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اِس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے، اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہی نظر آتے ہیں، اس لیے آخرت کا برپا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔

اِس سورۃ کو اگر اُن سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورۂ زلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اُس کی اخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زِلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا

اور کوئی ذرّہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اُس کے سامنے نہ آجائے۔
سورۂ عادیات میں اُس لوٹ مار، کشت و خون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عرب میں ہر طرف برپا
تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اُس کی بہت بڑی ناشکری ہے،
لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمہارے
افعال ہی کی نہیں، تمہاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس
سلوک کا مستحق ہے۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان
کے اچھے یا برے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اُس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اُس
مادّہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں
اور عیش و آرام اور جاہ و منزلت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی
کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اِس غفلت کے برے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی
خوانِ یغما نہیں ہے کہ اُس پر تم جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمہیں مل
رہی ہے اُس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا، اور حاصل کر کے اس کو
کس طرح استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتایا گیا کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد،
ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم حتیٰ کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے اگر اُس کے افراد میں
ایمان و عملِ صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اس کے
متّا بعد سورۂ ھُمزہ آتی ہے جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے
گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو۔

الفِیل

نام ۔ پہلی ہی آیت کے لفظ اَصْحٰبُ الْفِیْلِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے۔ اور اس کے تاریخی پس منظر کو اگر نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکہ معظمہ کے بھی ابتدائی دور میں ہوا ہوگا۔

تاریخی پس منظر اس سے پہلے تفہیم سورۃ بروج حاشیہ ۴ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذُونُواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر ظلم کیا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حِمیَری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی حکومت اور حبش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اُسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آرہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ اُس کے منافع پورے کے پورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اس مقصد کے لیے ۲۴ یا ۲۵ قبلِ مسیح

میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیس گالوس Aelius Galius
کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اتار دی تھی تاکہ وہ اُس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو
جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ (اس شاہراہ کا نقشہ ہم نے تفہیم القرآن، جلد دوم میں
صفحہ ۱۲۲ پر درج کیا ہے)۔ لیکن عرب کے شدید جغرافی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد
رومی اپنا جنگی بیڑا بحر احمر میں لے آئے اور انہوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر
کے راستے کرتے تھے، اور صرف برّی راستہ اُن کے لیے باقی رہ گیا۔ اِسی برّی راستے کو قبضے میں لینے
کے لیے انہوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو
یمن پر قابض کرا دیا۔

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے متعلق عرب مورخین کے بیانات ہیں، حافظ
ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط، دوسرا اَبرہہ۔ اور محمد بن اسحاق
کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اریاط تھا، اور ابرہہ اُس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اِس بات پر متفق
ہیں کہ ابرہہ اور اریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اریاط مارا گیا، ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا اور
پھر اُس نے شاہِ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اِس کے
برعکس یونانی اور سُریانی مورخین کا بیان ہے کہ فتح یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے
یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو اُن میں سے ایک سردار السُّمَیْفِع اَشْوَع
(جسے یونانی مورخین Esymphaeus لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے
اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہِ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی
فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور ابرہہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ
ادولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں
بڑا اثر و رسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے
مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخر کار شاہِ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین
نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا۔ (یونانی مورخین اُس کا نام ابرامس Abrames
اور سُریانی مورخین ابراھام Abraham لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اسی کا حبشی تلفظ ہے،

کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفظ ابراہیم ہے)

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مُفوّض الملک (نائبِ شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اُس کا اندازہ اِس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سدِّ مارب کی مرمت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہ حیرہ اور شاہِ غسّان کے سُفرا شریک ہوئے۔ اِس کا مفصل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سدِّ مارب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر Glaser نے اس کو نقل کیا ہے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۳۷)

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اِس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

ابرہہ نے اِس مقصد کے لیے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا ذکر عرب مورخین نے اَلقُلَیس یا اَلقَلِیس یا اَلقُلَّیس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ Ekklesia کا معرّب ہے اور اردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اِس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا[1]۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اُس نے یمن میں

---

[1] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم تفسیر سورۂ بروج حاشیہ ۴ میں کر چکے ہیں۔

علی الاعلان اپنے اِس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرادی۔ اُس کی اِس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو مکہ پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اِس اعلان پر غضب ناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھس کر رفع حاجت کر ڈالی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ اِن میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانا مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کرلے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب ابرہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو نہ ڈھا دوں۔

اِس کے بعد وہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُو نفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ پھر خَثْعَم کے علاقے میں ایک عرب سردار نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ اور اُس نے اپنی جان بچانے کے لیے بدرقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اُن کے معبود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر ابرہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا یہ بت کدہ وہ معبد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں، ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابو رِغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین کوس

رہ گیا تو المغمّس دیا المغمس نامی مقام پر پہونچ کر ابو رغال مرگیا، اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگباری کرتے رہے۔ بنی ثقیف کو بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ انہوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المغمس سے ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجبش کو آگے بڑھایا اور وہ اہل تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبد المطلب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر ابرہہ کا پیغام پہنچایا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچائے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ اُن کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا، مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اس کا ایک رب ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبد المطلب نے کہا آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اُس نے اُن کے اونٹ واپس کر دیے۔

ابن عباس رضؓ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اُس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حُمید، ابن المنذر، ابن مَردُوْیَہ، حاکم، ابو نعیم اور بیہقی نے اُن سے جو روایات نقل کی ہیں اُن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابرہہ الصِّفاح کے مقام پر پہنچا جو عَرَفات اور طائف کے

پہاڑوں کے درمیان حدودِ حرم کے قریب واقع ہے)، تو عبدالمطلب خود اس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؛ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر مسلّط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکّہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ احزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کے ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے۔ وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کی لشکرگاہ سے واپس آ کر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈہ پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بُت موجود تھے، مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ اُن کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابن ہشام نے سیرت میں عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

لاھُمَّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حِلالک

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

لا یغلبن صلیبہم ومحالهم عدوًا محالك

کل اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے

ان کنت تارکہم وقبلتنا فامر ما بدا لك

اگر تو ان کو اور ہمارے قبیلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تو چاہے کر

سہیلی نے روض الانف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

وانصرنا علیٰ آل الصّلیب وعابدیہ الیوم آلك

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما

ابنِ جریر نے عبدالمطّلب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے انہوں نے پڑھے تھے:

یا ربّ لا ارجو لہم سواکا یا ربّ فامنع منہم حماکا

اے میرے رب تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر

ان عدوّ البیت من عاداکا امنعہم ان یخربوا فراکا

اِس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز ابرہہ مکّے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اُس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیلے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکّے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر اُن سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عِکرِمہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھجاتے کھجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابن عباسؓ کی دوسری

روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا ہے اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں اِن لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خثعمی کو، جسے یہ لوگ بدرقہ بنا کر بلادِ خثعم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انہوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفرّ والالٰہ الطالب والاشرم المغلوب لیس الغالبُ

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ خدا تعاقب کر رہا ہے اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے غالب نہیں ہے

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اُسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرہہ بھی بلادِ خثعم پہنچ کر مرا۔[1]

یہ واقعہ مُزدَلِفہ اور مِنٰی کے درمیان وادی مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نَوَوی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اِسی جگہ پیش آیا تھا، اس لیے سنّت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ موطّأ میں امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مزدلفہ پورا کا پورا ٹھیرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ فیل کے بعد یمن میں اُن کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی، جگہ جگہ یمنی سردار علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذی یزن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی صرف ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

نہ ٹھیرا جائے۔ نُفیل بن حبیب کے جو اشعار ابن اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اِس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

رُدَینۃُ لو رأیتِ ولا ترَیہ لدٰی جنب المحصّب ما رأینا

اے رُدینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادی محصّب کے قریب دیکھا

حمدتُ اللّٰہ اذ ابصرت طیرًا وخفت حجارۃ تلقی علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آپڑیں۔

وکلّ القوم یسأل عن نُفیل کأنّ علیّ للحبشان دَینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی اور اس پر بہت سے شعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں اُن بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِّبَعرٰی کہتا ہے۔

ستون الفا لم یئوبوا ارضہم ولم یعش بعد الایاب سقیمہا

۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جاسکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا

کانت بہا عاد وجرہم قبلہم واللّٰہ من فوق العباد یقیمہا

یہاں ان سے پہلے عاد اور جُرہُم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ابو قیس بن اَسلَت کہتا ہے:

فقوموا فصلّوا ربکم وتمسّحوا بارکان ھٰذا البیت بین الاخاشب

اٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکّہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو۔

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردهم   جنود الملیک بین ساف وحاصب

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمِّ ہانی اور حضرت زُبیر بن العوّام کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش نے ۱۰ سال (اور بروایتِ بعض سات سال) تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُم ھانی کی روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی، حاکم، ابن مَرْدُویہ اور بیہقی نے اپنی کتب حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زبیر کا بیان طبرانی اور ابن مردُویہ اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی تائیدِ مزید حضرت سعید بن المُسَیّب کی اُس مُرسل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اُسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اُسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضور کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

مقصودِ کلام جو تاریخی تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اِس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کردینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہل عرب اِس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے اِس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں اور چند سال تک قریش کے لوگ اِس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں اِن تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تا کہ قریش کے لوگ خصوصاً، اور اہل عرب عموماً، اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام دوسرے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے اُنہوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔

قُرَیش

نام پہلی ہی آیت کے لفظ قریش کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ ضحاک اور کلبی نے اس کو مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، اور اس کے مکی ہونے کی کھلی شہادت خود اس سورہ کے الفاظ رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (اس گھر کے رب) میں موجود ہے۔ اگر یہ مدینہ میں نازل ہوتی تو خانۂ کعبہ کے لیے "اس گھر" کے الفاظ کیسے موزوں ہو سکتے تھے؟ بلکہ اس کے مضمون کا سورۂ فیل کے مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ غالباً اس کا نزول اُس کے متصلاً بعد ہی ہوا ہوگا۔ دونوں سورتوں کے درمیان اسی مناسبت کی بنا پر سلف میں سے بعض بزرگ اس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی سورۃ ہیں۔ اس خیال کو تقویت اِن روایات کی بنا پر ملی ہے کہ حضرت اُبیّ بن کعب کے مُصحف میں یہ دونوں ایک ساتھ لکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں بسم اللہ مرقوم نہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی فصل کے بغیر اِن دونوں کو ملا کر نماز میں پڑھا تھا۔ لیکن یہ رائے اس وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے کہ صحابۂ کرام کی عظیم تعداد کے تعاون سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلادِ اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے ان میں دونوں کے درمیان بسم اللہ درج تھی، اور اُس وقت سے آج تک تمام دنیا کے مصاحف میں یہ الگ الگ سورتوں کی حیثیت ہی سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ مزید برآں دونوں سورتوں کا اندازِ بیان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ علانیہ دو الگ سورتیں نظر آتی ہیں۔

تاریخی پس منظر اس سورۃ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اِس کے مضمون اور سورۂ فیل کے

کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ قصیّ بن کِلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قصیّ نے اُس کو مکّے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تَولِیَت اِس قبیلے کے ہاتھ میں آگئی۔ اِسی بنا پر قصیّ کو "مُجمّع" (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ اِس شخص نے اپنے اعلیٰ درجہ کے تدبُّر سے مکّہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی اور جملہ اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قصی کے بعد اس کے بیٹوں عبد مناف اور عبد الدّار کے درمیان مکّہ کی ریاست کے مناصب تقسیم ہو گئے۔ مگر دونوں میں سے عبد مناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اُس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، عبدِ شمس، مُطّلب اور نوفل۔ اِن میں سے ہاشم عبد المطّلب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلُّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اُٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خدّام ہونے کی حیثیت سے اُن کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنہیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں اُن کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہگذر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اسکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو شامل

کیا۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبدِ شمس نے، یمنی امراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اِسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتجّرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہوگئے، اور جو روابط انہوں نے گردو پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر اِن کو اَصحابُ الایلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی "اُلفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہوگئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مُسند احمد، مرویات عمرؓو بن العاص) اور حضرت علیؓ کی روایت بیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کان ھٰذا الامر فی حِمْیَر فنزعہ اللہ منہم وجعلہ فی قریش "پہلے عرب کی سرداری قبیلہ حِمیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے وہ ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی"۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھانے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں، خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے

اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اِس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر گر کر مرتے چلے گئے تو کعبے کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا، اور اُس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ اِن لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ اُنہیں چھیڑنا تو در کنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریش بھی ہوتا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

مقصودِ کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں یہ حالات چونکہ سب ہی کو معلوم تھے، اِس لیے اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس سورۃ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اِتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم خود اس گھر (خانۂ کعبہ) کو بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر مانتے ہو، اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اِس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارتوں کو یہ فروغ بخشا، اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب فرمائی، تو تمہیں اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

الماعون

نام آخری آیت کے آخری لفظ الماعون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابن مُردُوَیَہ نے ابن عباس اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکی ہے، اور یہی قول عطاء اور جابر کا بھی ہے۔ لیکن ابوحیان نے البحر المحیط میں ابن عباس اور قتادہ اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک خود اس سورہ کے اندر ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جو اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اِس میں اُن نماز پڑھنے والوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ منافقین کی یہ قسم مدینے ہی میں پائی جاتی تھی کیونکہ وہیں اسلام اور اہلِ اسلام کو یہ قوت حاصل ہوئی تھی کہ بہت سے لوگوں کو مصلحتہً ایمان لانا پڑا تھا اور وہ مجبوراً مسجد میں آتے تھے، جماعت میں شریک ہوتے تھے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھتے تھے، تاکہ اُنہیں مسلمانوں میں شمار کیا جائے۔ اس کے برعکس مکے میں ایسے حالات سرے سے موجود ہی نہ تھے کہ وہاں کسی کو دکھاوے کی نماز پڑھنی پڑتی۔ وہاں تو اہلِ ایمان کے لیے نماز باجماعت کا اہتمام بھی مشکل تھا۔ اُن کو چھپ چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی تھی اور کوئی علانیہ پڑھتا تھا تو جان پر کھیل کر پڑھتا تھا۔ منافقین کی جو قسم وہاں پائی جاتی تھی وہ ریاکارانہ ایمان لانے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ اُن لوگوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برسرِ حق ہونے کو جان اور مان گئے تھے، مگر اُن میں سے کوئی اپنی ریاست و وجاہت اور مشیخت کو برقرار رکھنے کی خاطر اسلام قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا اور کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان ہو کر

اُن مصائب میں مبتلا ہو جائے جن میں وہ ایمان لانے والوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مبتلا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مکی دور کے منافقین کی یہ حالت سورۂ عنکبوت، آیات ۱۰-۱۱ میں بیان کی گئی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، العنکبوت، حواشی ۱۳ تا ۱۶)

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع یہ بتانا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیت ۲ اور ۳ میں اُن کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جو علانیہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں اُن منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں، مگر دل میں آخرت اور اُس کی جزا و سزا اور اس کے ثواب و عقاب کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دونوں قسم کے گروہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ انسان کے اندر ایک مضبوط اور مستحکم پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

اَلْکَوْثَر

نام اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ اَلْکَوْثَرَ کے لفظ الکوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے، کلبی اور مقاتل بھی اسے مکی کہتے ہیں، اور جمہور مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن حضرت حسن بصری، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کو مدنی قرار دیتے ہیں، امام سیوطی نے اتقان میں اسی قول کو صحیح ٹھیرایا ہے اور امام نووی نے شرح مسلم میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ اس کی وہ روایت ہے جو امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن مردویہ اور بیہقی وغیرہ محدثین نے حضرت انس بن مالک سے نقل کی ہے کہ حضورؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ اتنے میں آپ پر کچھ اونگھ سی طاری ہوئی، پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر مبارک اٹھایا۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا آپ کس بات پر تبسم فرما رہے ہیں؟ اور بعض میں ہے کہ آپ نے خود لوگوں سے فرمایا اس وقت میرے اوپر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر آپ نے سورۂ کوثر پڑھی۔ اس کے بعد آپ نے پوچھا جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا وہ ایک نہر ہے جو میرے رب نے مجھے جنت میں عطا کی ہے (اس کی تفصیل آگے "کوثر" کی تشریح میں آ رہی ہے)۔ اس روایت سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر اس وجہ سے استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت انس رضؓ مکہ میں نہیں بلکہ مدینے میں تھے، اور اُن کا یہ کہنا کہ ہماری موجودگی میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مدنی ہے۔

مگر اول تو انہی حضرت انس سے امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن جریر نے

یہ روایات نقل کی ہے کہ جنت کی یہ نہر (کوثر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں دکھائی جا چکی تھی، اور سب کو معلوم ہے کہ معراج ہجرت سے پہلے مکّہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے، جب معراج میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے اِس عطیہ کی نہ صرف خبر دی جا چکی تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضور کو اُس کی خوشخبری دینے کے لیے مدینہ طیّبہ میں سورۂ کوثر نازل کی جاتی۔ تیسرے، اگر صحابہ کے ایک مجمع میں حضورؐ نے خود سورۂ کوثر کے نزول کی وہ خبر دی ہوتی جو حضرت انس رضؓ کی مذکورۂ بالا روایت میں بیان ہوئی ہے اور اُس کا مطلب یہ ہوتا کہ پہلی مرتبہ یہ سورۃ اِسی وقت نازل ہوئی ہے، تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے باخبر صحابہ اِس سورۃ کو مکّی قرار دیتے اور جمہور مفسّرین اس کے مکّی ہونے کے قائل ہو جاتے؟ اس معاملہ پر غور کیا جائے تو حضرت انس کی روایت میں یہ خلا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اُس میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے کہ جس مجلس میں حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی اُس میں پہلے سے کیا گفتگو چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضورؐ کسی مسئلے پر کچھ ارشاد فرما رہے ہوں، اُس کے دوران میں وحی کے ذریعہ سے آپ کو مطلع کیا گیا ہو کہ اِس مسئلے پر سورۂ کوثر سے روشنی پڑتی ہے، اور آپ نے اسی بات کا ذکر یوں فرمایا ہو کہ مجھ پر یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ اِس قسم کے واقعات متعدد مواقع پر پیش آئے ہیں جن کی بنا پر مفسّرین نے بعض آیات کے متعلق کہا ہے کہ وہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ اس دوسرے نزول کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ آیت تو پہلے نازل ہو چکی تھی، مگر دوسری بار کسی موقع پر حضورؐ کو بذریعۂ وحی اُسی آیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ایسی روایات میں کسی آیت کے نزول کا ذکر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا کہ وہ مکّی ہے یا مدنی، اور اس کا اصل نزول فی الواقع کس زمانے میں ہوا تھا۔

حضرت انس رضؓ کی یہ روایت اگر شک پیدا کرنے کی موجب نہ ہو تو سورۂ کوثر کا پورا مضمون بجائے خود اِس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ مکّۂ معظمہ میں نازل ہوئی تھی جب حضورؐ کو انتہائی دل شکن حالات سے سابقہ درپیش تھا۔

تاریخی پس منظر

اِس سے پہلے سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات

سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضورؐ اور آپ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دور دور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپ کو تسلّی دینے اور آپ کی ہمّت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ سورہ ضحیٰ میں فرمایا وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلیٰ ہ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی۔ "اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور (یعنی ہر بعد کا دور) پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔" اور الم نشرح میں فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔ "اور ہم نے تمہارا آوازہ بلند کر دیا" یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے ان کے علی الرّغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے۔ اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" یعنی اِس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورہ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلّی بھی دی اور آپ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور اُن کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نبی بنائے گئے اور آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے بَتِرَ محمدٌ مِنَّا (ابن جریر) یعنی محمدؐ اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور متوقع یہی ہو کہ کچھ مدّت بعد وہ سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکّہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا "اجی چھوڑو انہیں، وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں، ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں، مر جائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہو گا۔" شمر بن عطیہ کا بیان ہے کہ عُقبہ بن ابی مُعیط بھی ایسی ہی باتیں حضورؐ کے متعلق کہا کرتا تھا (ابن جریر)۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا الا تری الی ھذا الصبیّ المنبتر من قومہ یزعم انہ خیر منّا ونحن

اهل الحجیج واهل السدانۃ واهل السقایۃ "بھلا دیکھو تو سہی، اس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے، حالانکہ ہم حج اور سدانت اور سقایت کے منتظم ہیں" (بزار)
اسی واقعہ کے متعلق عکرمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضورؐ کے لیے الصُّنْبُوْرُ الْمُنْبَتِرُ من قومہ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی "کمزور، بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے" (ابن جریر) ابن سعد اور عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں ام کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسم کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی۔ اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی) بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا ان محمداً ابتر لا ابن لہ یقوم مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واسترحتم منہ "محمد ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا" عبد بن حُمید نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہ کی وفات پر ابو جہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی معیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متصل تھا)، دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بَتِرَ مُحَمَّدٌ اللیلۃ۔ "آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی۔"

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپؐ نے علانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چھین لیا گیا تھا اور آپ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی

وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں کہ جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مختصر ترین سورۃ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دنیا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی۔ اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

اَلْکٰفِرُوْنَ

نام پہلی ہی آیت قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کے لفظ الکافرون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حسن بصری اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے، حضرت عبداللہ بن زُبیر کہتے ہیں کہ مدنی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور قتادہ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورۃ ہے، اور اس کا مضمون خود اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

تاریخی پس منظر مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ اُن میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور اُن کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ

آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عُزّیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا، ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے[1]۔ اس پر وحی نازل ہوئی قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ...... اور یہ کہ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ ۝ (الزمر آیت ۶۴) "اِن سے کہو، اے نادانو، کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں"؟ (ابن جریر۔ ابی حاتم۔ طَبَرانی) ابن عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، اگر تم ہمارے معبود بتوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔" اس پر یہ سورت نازل ہوئی (عبد بن حُمید)۔

سعید بن میناءؒ (ابو البَختَری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مُغیرہ، عاص بن وائل، اَسوَد بن المطلب اور اُمَیَّہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ سے کہا "اے محمدؐ، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے،

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنی قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے، بلکہ دراصل یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیجے دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

تو ہم تمہارے ساتھ اُس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصّہ اُس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہوگے اور اس سے اپنا حصّہ پالوگے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ..... (ابن جریر وابی حاتم۔ ابن ہشام نے بھی سیرت میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے)

وہب بن مُنَبِّہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حُمید۔ ابن ابی حاتم)

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اِس قسم کی تجویز پیش کی تھیں اور اِس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے کر اُن کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر اُن سے کوئی مصالحت کریں گے۔

موضوع اور مضمون

اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اِس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفّار کے دین اور اُن کی پوجا پاٹ اور اُن کے معبودوں سے قطعی برارت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور اُنہیں بتا دیا جائے کہ دینِ کفر اور دینِ اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اُن کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے اُن کی تجاویزِ مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ اُنہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دینِ کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے اُن کو اس سے قول اور عمل میں براءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رو رعایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے یہ سورۃ اُس وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مر کھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اِسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اِس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور اُن کے گزر جانے کے صدیوں بعد

آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سورہ کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جا سکتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے بارہا حضورؐ کو فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھتے دیکھا ہے (اس مضمون کی متعدد روایات کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور ابن مردویہ نے ابن عمرؓ سے نقل کی ہیں)

حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹو تو قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو، اور حضورؐ کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپؐ سونے کے لیے لیٹتے تو یہ سورۃ پڑھ لیا کرتے تھے (بزار، طبرانی، ابن مردویہ)

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا "میں تمہیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو" (ابویعلیٰ۔ طبرانی)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ شرک سے برارت ہے (بیہقی فی الشعب)

فروہ بن نوفل اور عبدالرحمان بن نوفل، دونوں کا بیان ہے کہ ان کے والد نوفل بن معاویہؓ الاشجعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجیے جسے میں سوتے وقت پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ آخر تک پڑھ کر سو جایا کرو، کیونکہ یہ شرک سے براءت ہے (مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی فی الشعب) ایسی ہی درخواست حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بھائی حضرت جبلہؓ بن حارثہ نے حضور سے کی تھی اور ان کو بھی آپ نے یہی جواب دیا تھا (مسند احمد، طبرانی)

النَّصْر

نام پہلی آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ کے لفظ نصر کو اِس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت حضورؐ پر نازل نہیں ہوئی[1] (مسلم، نسائی، طبرانی، ابن ابی شیبہ، ابن مردویہ)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط بمقامِ منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد حضورؐ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر

---

[1] مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد بعض آیات نازل ہوئی ہیں لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی وہ آیت کون سی ہے، جو حضور پر سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضرت براءؓ بن عازب کی روایت یہ ہے کہ وہ سورۂ نساء کی آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ ہے۔ امام بخاری نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت ربوٰ یعنی جس آیت میں سود کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ اس کی تائید اُن روایات سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ ابن ماجہ اور ابن مردویہ نے حضرت عمر سے نقل کی ہیں، مگر اُن میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ آخری آیت ہے، بلکہ حضرت عمر کا قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ ابو عبید نے فضائل القرآن میں امام زہری کا اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن المسیب کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ ربوٰ اور آیتِ دین (یعنی سورۂ بقرہ رکوع ۳۸، ۳۹) قرآن میں نازل ہونے والی آخری آیات ہیں۔ نسائی، ابن مردویہ اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس کا ایک دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ

اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا (ترمذی، بزّار، بیہقی، ابن ابی شیبہ، عبد بن حُمَید، ابویعلیٰ، ابن مردویہ) بیہقی نے کتاب الحج میں حضرت سَرّاءؓ بنت نبہان کی روایت سے حضورؐ کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ:

"میں نے حجۃ الوداع میں حضورؐ کو یہ فرماتے سنا کہ لوگو تم جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ ایامِ تشریق کے بیچ کا دن ہے پھر آپ نے پوچھا جانتے ہو یہ کونسا مقام ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ مَشْعَرِ حرام ہے پھر حضورؐ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، شاید اس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ خبردار رہو، تمہارے خون اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مقام حرام ہے، یہاں تک کہ تم اپنے رب کے سامنے حاضر ہو اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے۔ سنو، یہ بات تم میں سے قریب والا دور والے تک پہنچا دے۔ سنو، کیا میں نے تمہیں پہنچا دیا؟ اس کے بعد جب ہم لوگ مدینہ واپس ہوئے تو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔"

ان دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نصر کے نزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیان ۳ مہینے کچھ دن کا فصل تھا، کیونکہ تاریخ کی رو سے حجۃ الوداع اور حضورؐ کے وِصال کے درمیان اتنا ہی زمانہ گزرا تھا۔

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا مجھے میری وفات کی

فِیْہِ۔ (البقرہ، ۲۸۱) قرآن کی آخری آیت ہے۔ الفِریابی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا جو قول نقل کیا ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ آیت حضورؐ کی وفات سے ۸۱ دن پہلے نازل ہوئی تھی اور سعید بن جبیر کا قول جو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ اس میں آیت کے نزول اور حضورؐ کی وفات کے درمیان صرف ۹ دن کا فصل بیان کیا گیا ہے۔ امام احمد کی مُسند اور امام حاکم کی المستدرک میں حضرت اُبی بن کعب کی روایت یہ ہے کہ سورۃ توبہ کی آیات ۱۲۸، ۱۲۹ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پورا ہوا (مسند احمد، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ) دوسری روایات جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کے نزول سے حضورؐ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپؐ کو دنیا سے رُخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے (مسند احمد، ابن جریر، طبرانی، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ)

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا اس سال میرا انتقال ہونے والا ہے۔ یہ بات سُن کر حضرت فاطمہؓ رو دیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا میرے خاندان میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آکر ملو گی۔ یہ سن کر وہ ہنس دیں (ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ) قریب قریب اسی مضمون کی روایت بیہقی نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے بڑے بڑے شیوخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بلاتے تھے۔ یہ بات بعض بزرگوں کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اسی لڑکے جیسے ہیں، اس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ شریکِ مجلس کیا جاتا ہے؟ (امام بخاری اور ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبد الرحمانؓ بن عوف تھے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اِس کا جو مقام ہے وہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک روز انہوں نے شیوخِ بدر کو بلایا اور مجھے بھی اُن کے ساتھ بُلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے یہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے کہ مجھ کو ان کی مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت عمرؓ نے شیوخِ بدرؓ سے پوچھا کہ آپ حضرات اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بعض نے کہا اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آئے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے استغفار کریں۔ بعض نے کہا اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے۔ بعض خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا ابن عباسؓ، کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا، نہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل ہے۔ اس میں حضورؐ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ کا وقت آن پورا ہوا، اِس کے بعد آپ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا میں بھی اس کے سوا کچھ نہیں جانتا جو تم نے کہا ہے۔ ایک روایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے

شیوخِ بدر سے فرمایا آپ لوگ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں جبکہ اس لڑکے کو اِس مجلس میں شریک کرنے کی وجہ آپ نے دیکھ لی (بخاری، مسند احمد، ترمذی، ابن جریر، مردویہ، بغوی، بیہقی، ابن المنذر)

موضوع اور مضمون

جیسا کہ مندرجۂ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتادیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اُس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے، اور اُس سے دعا کریں کہ اِس خدمت کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرمادے۔ اِس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلابِ عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اُٹھا کر اِس قابل بنادیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوامِ عالم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اِس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیسے کلمات ہیں جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ۔

(مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ) اسی سے ملتی جلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ۔ یہ قرآن (یعنی سورہ نصر) کی تاویل تھی جو آپؐ نے فرمائی تھی۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آپ کے آخری زمانۂ حیات میں اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔ میں نے ایک روز پوچھا کہ یارسول اللہ، آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہو؟ فرمایا مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے پھر آپ نے یہ سورۃ پڑھی (ابن جریر)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ (ابن جریر، مسند احمد، ابن ابی حاتم)

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ اِس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے لیے محنت و ریاضت کرنے میں اِس قدر شدت کے ساتھ مشغول ہو گئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ (نسائی، طبرانی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ)

اللّھب

نام

پہلی آیت کے لفظ لَھَب کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

اِس کے مکی ہونے میں تو مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مکی دور کے کس زمانے میں یہ نازل ہوئی تھی۔ البتہ ابولہب کا جو کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ حق کے خلاف تھا اُس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس سورہ کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہوگا جب وہ حضورؐ کی عداوت میں حد سے گزر گیا تھا اور اُس کا رویہ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن رہا تھا۔ بعید نہیں کہ اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا مقاطعہ کر کے قریش کے لوگوں نے اُن کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور تنہا ابولہب ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔

ہمارے اِس قیاس کی بنا یہ ہے کہ ابولہب حضورؐ کا چچا تھا، اور بھتیجے کی زبان سے چچا کی کھلم کھلا مذمت کرانا اُس وقت تک مناسب نہ ہو سکتا تھا جب تک چچا کی حد سے گزری ہوئی زیادتیاں علانیہ سب کے سامنے نہ آ گئی ہوں۔ اِس سے پہلے اگر ابتدا ہی میں یہ سورۃ نازل کر دی گئی ہوتی تو لوگ اس کو اخلاقی حیثیت سے معیوب سمجھتے کہ بھتیجا اپنے چچا کی اِس طرح مذمت کرے۔

پس منظر

قرآنِ مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مذمت کی گئی ہے، حالانکہ مکے میں بھی، اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ابولہب سے

کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے، اور اس میں ابو لہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملکِ عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطعِ رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضورؐ کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور بنی المُطّلب (ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کھلّم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے اِن خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المطلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اِس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اِس اخلاقی اصول کو، جسے زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابو لہب بن عبد المطلب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ حضورؐ کے والد ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خصوصاً جبکہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اِس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں اِن تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابن عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا، یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت) عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اس پر قریش کے تمام خاندان کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا، اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ "ستیاناس جائے تیرا، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا"؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)

ابن زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے دین کو مان لوں گا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا تَبًّا لِهٰذَا الدِّيْنِ تَبًّا أَنْ أَكُوْنَ وَهٰؤُلَاءِ سَوَاءً "ناس جائے اس دین کا جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں"۔ (ابن جریر)

مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ)، عقبہ بن ابی معیط، عدی بن حمراء اور ابن الاصداء الہذلی بھی آپ کے ہمسائے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپ کبھی نماز

بڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپ پر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبدِ مناف، یہ کیسی ہمسایگی ہے؟" ابولہب کی بیوی امِّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپ یا آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے (بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، ابنِ ہشام)

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوتِ دینی شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آ کر اس نے کہا کہ میں النَّجْمِ اِذَا هَوٰى اور اَلَّذِىْ دَنَا فَتَدَلّٰى کا انکار کرتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر اس نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتّے کو مسلط کر دے۔ اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عُتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عتیبہ کو پھاڑ کھایا۔ (الاستیعاب لابن عبد البرّ، الاصابہ لابن حجر، دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی، روض الانف للسُّہیلی۔ روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عُتبہ تھا یا عُتیبہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتحِ مکّہ کے بعد عتبہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عُتیبہ تھا)۔

اس کے خبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ

کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ لو آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام ونشان ہوگئے۔ اُس کی اِس حرکت کا ذکر ہم سورۂ کوثر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپؐ کی بات سننے سے روکتا۔ ربیعہ رضؓ بن عبّاد الدّیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے "لوگو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے۔" اور آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھوٹا ہے، دین آبائی سے پھر گیا ہے۔" میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے، لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد، بیہقی)۔ دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "اے بنی فلاں، میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔" آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عُزّیٰ سے پھیر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔" میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد۔ طبرانی)۔ طارق رضؓ بن عبداللہ المُحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ "لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔" اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپ کو پتھر مار رہا ہے یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہوگئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو۔" میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (ترمذی)

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شِعب ابی طالب میں محصور ہوگئے، تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے

کے بجائے کفارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المطّلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکّہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ بھی ہوگا اسے میں پورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا۔ پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا (ابن سعد و ابن ہشام)

یہ اس شخص کی حرکات تھیں جن کی بنا پر اس سورہ میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ مکّہ سے باہر کے اہل عرب جو حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے، ان کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپ کے پیچھے لگ کر آپ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلاوجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو برا بھلا کہے اور اسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متاثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے۔ مگر جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور ابولہب نے غصّے میں بھر کر اول فول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اس شخص کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے بھتیجے کی دشمنی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ نام لے کر جب آپؐ کے چچا کی مذمت کی گئی تو لوگوں کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کسی کا لحاظ کر کے کوئی مداہنت برت سکتے ہیں۔ جب علی الاعلان رسول کے اپنے چچا کی خبر لے ڈالی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ یہاں کسی لاگ لپیٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے اگر ایمان لے آئے، اور اپنا غیر ہو جاتا ہے اگر کفر کرے۔ اس معاملہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

الاخلاص

نام الاخلاص اس سورہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں تو بالعموم کسی ایسے لفظ کو اُن کا نام قرار دیا گیا ہے جو اُن میں وارد ہوا ہو، لیکن اس سورہ میں لفظ اخلاص کہیں وارد نہیں ہوا ہے۔ اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔

زمانۂ نزول اس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف اُن روایات کی بنا پر ہے جو اس کے سببِ نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیںؔ بتایئے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی (طبرانی)

ؔ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اُنْسُبْہُ لَنَا، اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ اُن کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا نسب کیا ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ آپ کا رب کون ہے اور کیسا ہے تو انہوں نے کہا اُنْسُبْ لَنَا رَبَّکَ، اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے۔

(۲) ابو العالیہ نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی (مسند احمد، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ترمذی، بخاری فی التاریخ، ابن المنذر، حاکم، بیہقی) ترمذی نے اسی مضمون کی ایک روایت ابو العالیہ سے نقل کی ہے جس میں حضرت اُبی بن کعبؓ کا حوالہ نہیں ہے اور اُسے صحیح تر کہا ہے۔

۳۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک اعرابی نے (اور بعض روایات میں ہے لوگوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (ابو یعلیٰ، ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی فی الاوسط، بیہقی، ابو نعیم فی الحِلیہ)

(۴) عِکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں کعب بن اشرف اور حُیَی بن اخطب وغیرہ شامل تھے اور انہوں نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں بتایئے کہ آپ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (ابن ابی حاتم، ابن عدی، بیہقی فی الاسماء والصفات)

ان کے علاوہ مزید چند روایات ابن تیمیہ نے اپنی تفسیر سورۂ اخلاص میں نقل کی ہیں جو یہ ہیں:

۵۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ خیبر کے کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "اے ابو القاسمؐ، اللہ نے ملائکہ کو نورِ حجاب سے، آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے، ابلیس کو آگ کے شعلے سے، آسمان کو دھوئیں سے، اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا، اب ہمیں اپنے رب کے متعلق بتایئے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا اے محمدؐ، ان سے کہیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ.....

۶۔ عامر بن الطُّفیل نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، آپ کس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہیں؟" آپ نے فرمایا اللہ کی طرف، عامر نے کہا، "اچھا تو اُس کی کیفیت مجھے بتایئے۔ وہ سونے سے بنا ہوا ہے یا چاندی سے یا لوہے سے؟" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

(۷) ضحاک اور قتادہ اور مُقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علماء حضورؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا "اے محمدؐ، اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتایئے، شاید کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت توراۃ میں نازل کی ہے۔ آپ بتایئے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟

سونے سے بنا ہے یا تانبے سے، یا پیتل سے، یا لوہے سے، یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھاتا اور پیتا ہے؟ اور کس سے اس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟" اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

۸۔ ابن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد سات پادریوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے حضورؐ سے کہا "ہمیں بتائیے آپ کا رب کیسا ہے، کس چیز سے بنا ہے"؟ آپ نے فرمایا میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے۔ وہ تمام اشیاء سے جدا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس معبود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی تھی جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اور ہر موقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو جواب میں یہی سورت سنائی تھی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے، کبھی عیسائیوں نے، اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضورؐ سے اِسی نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہی سورت آپ اُن کو سنا دیں۔ اِن روایات میں سے ہر ایک میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اِس موقع پر یہ سورت نازل ہوئی تھی، اِس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب روایتیں باہم متضاد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں اگر پہلے سے کوئی آیت یا سورۃ نازل شدہ موجود ہوتی تھی تو بعد میں جب کبھی حضورؐ کے سامنے وہی مسئلہ پیش کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آجاتی تھی کہ اِس کا جواب فلاں آیت یا سورۃ میں ہے، یا اِس کے جواب میں وہ آیت یا سورۃ لوگوں کو پڑھ کر سنا دی جائے۔ احادیث کے راوی اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب فلاں معاملہ پیش آیا، یا فلاں سوال کیا گیا تو یہ آیت یا سورۃ نازل ہوئی۔ اِس کو تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک آیت یا سورۃ کا کئی مرتبہ نازل ہونا۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورۃ دراصل مکّی ہے بلکہ اِس کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکّے کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بیان میں قرآن کی مفصّل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت

الی اللہ کو سن کر لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر آپ کا وہ رب کیسا ہے جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ اِس کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ سورت ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مکّہ میں جب حضرتِ بلال کا آقا اُمیّہ بن خلف اُن کو دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بڑا سا پتھر اُن کی چھاتی پر رکھ دیتا تھا تو وہ اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتے تھے۔ یہ لفظ اَحَد اِسی سورۃ سے ماخوذ تھا۔

موضوع اور مضمون

شانِ نزول کے بارے میں جو روایات اوپر درج کی گئی ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اُٹھے تھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے تھے، شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ اُن کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اُس کے اَوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا، اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں روح القدس کو بھی حصّہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفت سے خالی نہ تھا، وہ ٹہلتا تھا۔ انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اپنے کسی بندے سے کُشتی بھی لڑ لیتا تھا۔ اور ایک عدد بیٹے (عُزیر) کا باپ بھی تھا۔ اِن مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی آتش پرست تھے اور صابی ستارہ پرست۔ اِس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت لوگوں کو دی گئی تو اُن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے اِن سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصور پیش کر دیا جو تمام

مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔

فضیلت اور اہمیت

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے، تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور عوام الناس میں اسے پھیلائیں، کیونکہ یہ اسلام کے اولین بنیادی عقیدے (توحید) کو چار ایسے مختصر فقروں میں بیان کر دیتی ہے جو فوراً انسان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں اِس مضمون کی متعدد احادیث ابوسعید خُدری، ابوہریرہ، ابوایوب انصاری، ابوالدرداء، مُعاذ بن جبل، جابر بن عبداللہ، اُبَی بن کعب، ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی مُعیط، ابنِ عمر، ابن مسعود، قتادہ بن النعمان، انس بن مالک اور ابومسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ مفسرین نے حضورؐ کے اِس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآن مجید جس دین کو پیش کرتا ہے اُس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ ایک توحید۔ دوسرے رسالت تیسرے آخرت یہ سورۃ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم اور بعض دوسری کتبِ حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو مُہم پر سردار بنا کر بھیجا اور اس پورے سفر کے دوران میں اُن کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں وہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ پر قرأت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر اُن کے ساتھیوں نے حضورؐ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضورؐ نے یہ بات سُنی تو لوگوں سے فرمایا اخبروہ

ان اللہ تعالیٰ یحبّہ "اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں محبوب رکھتا ہے۔"

اِسی سے ملتا جلتا واقعہ بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب مسجدِ قُبا میں نماز پڑھاتے تھے اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ہر رکعت میں پہلے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھتے، پھر کوئی اور سورت تلاوت کرتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور اُن سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھنے کے بعد اِسے کافی نہ سمجھ کر کوئی اور سورت بھی اُس کے ساتھ ملا لیتے ہو؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یا تو صرف اِسی کو پڑھو، اور یا اِسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھو۔ اُنہوں نے کہا میں اِسے نہیں چھوڑ سکتا، تم چاہو تو میں تمہیں نماز پڑھاؤں ورنہ امامت چھوڑ دوں۔ لیکن لوگ اُن کی جگہ کسی اور کو امام بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر کار معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی جو کچھ چاہتے ہیں اُسے قبول کرنے میں تم کو کیا امر مانع ہے؟ تمہیں ہر رکعت میں یہ سورت پڑھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا مجھے اِس سے بہت محبت ہے۔ آپ نے فرمایا حُبُّكَ اِیَّاھَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ "اِس سورت سے تمہاری محبت نے تمہیں جنّت میں داخل کر دیا۔"

معوّذتین

الفلق ——— النّاس

نام اگرچہ قرآن مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مصحف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن ان کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے، اور ان کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی گہری مناسبت رکھتے ہیں کہ اِن کا ایک مشترک نام "مُعَوِّذَتَیْن" (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بیہقی نے دلائلِ نبوت میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہوئی ہیں، اِسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام موذتین ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مباحث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانۂ نزول حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکّی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر اُن سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک مسلم، ترمذی، نسائی اور مُسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عُقبہ بن عامرؓ کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک روز مجھ سے فرمایا اَلَمْ تَرَ اٰیَاتٍ اُنْزِلَتِ اللیلۃ لَمْ یُرَ مثلھن، اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ "تمہیں کچھ پتہ ہے کہ آج رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئی ہیں؟ یہ بے مثل آیات ہیں۔ اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس۔" یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے

مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عُقبہؓ بن عامر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی نے خود اُن کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں وہ ابن سعد، مُحی السُّنّہ بَغَوی، امام نَسَفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ بدرالدّین عینی، عبد بن حُمید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینے میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضورؐ بیمار ہو گئے تھے اس وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔ اسی بنا پر سُفیان بن عیینہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سورۃ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اُسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورتِ حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی کی طرف دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار حضورؐ کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ معوذتین کا ہے۔ ان کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکّہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضورؐ کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین، یہود اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو حضورؐ کو پھر انہی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عقبہؓ بن عامر کی مندرجۂ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالتِ مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آ کر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اس لیے ہمارے نزدیک اُن مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکّی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اُس کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت (وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ) ہی تعلق رکھتی ہے، سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۂ الناس کا اِس معاملہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون

مکّہ معظمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں

وہ یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جوں جوں آپ کی دعوت پھیلتی گئی، کفارِ قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک اُنہیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے، یا بہلا پھسلا کر آپ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اُس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدّت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضورؐ نے اُن کو اِس طرف سے بالکل مایوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے، اور سورۂ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو اُن کی بندگی کرنے والا میں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اُس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لیے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مردوں یا عورتوں، لڑکیوں یا لڑکوں) نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضور کے خلاف ہر وقت بھٹیاں سُلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپ کو کوسا جا رہا تھا خفیہ مشورے کیے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپ کے خلاف جادو ٹونے کیے جا رہے تھے تاکہ آپ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطینِ جنّ و انس ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپ کے خلاف اور آپ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا، دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر، ابوجہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جا رہا تھا اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ "ہمارا اور بنی عبدِ مناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ اُنہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ اُنہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عطیے دیے تو ہم نے بھی دیے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم جب عزت و شرف میں برابر کی ٹکر ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اس میدان میں

ہم کیسے اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اُس کی تصدیق کریں گے" (ابن ہشام، جلد اول، ص ۲۳۷ - ۲۳۸)

اِن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوعِ صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں کے شر سے، اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی ہر اُس وسوسہ انداز کے شر سے۔ جو بار بار پلٹ کر آتا ہے اور یہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطینِ جن میں سے ہو یا شیاطینِ اِنس میں سے۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰ نے اُس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں اُن کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ (اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ، "میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے ہر اُس متکبر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا" (المومن، ۲۷) (وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ، "اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے اِس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو" (الدخان۔ ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے اِن جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں بڑے سروسامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا دونوں مواقع پر وہ طاقت ور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے۔ درانحالیکہ اُن کے پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ اُن کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور مُعاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ تمہارے مقابلے میں ہم نے ربّ کائنات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اُس رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اُس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا" تم جو چاہو کر لو مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں تمہارے اور اپنے اور ساری کائنات کے

رب کی پناہ لے چکا ہوں۔

معوذتین کی قرآنیت

اِن دونوں سورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لیے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو اوپر کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اِن کے متعلق تین ایسے مباحث آ گئے ہیں جو لوگوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُن کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

اِن میں سے اولین قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا اِن دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ یہ سوال اِس لیے پیدا ہوا کہ حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ اِن دونوں سورتوں کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مُصحف سے اُنہوں نے اِن کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بزّار، طبرانی، ابن مردویہ، ابو یعلیٰ، عبداللہ بن احمد حنبل، حمیدی، ابو نعیم، ابنِ حبّان، وغیرہ محدثین نے مختلف سندوں سے، اور اکثر و بیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابن مسعود سے نقل کی ہے۔ اِن روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ اِن سورتوں کو مُصحف سے ساقط کر دیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے "قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اِن الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں۔" بعض روایات میں اِس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

اِن روایات کی بنا پر مخالفینِ اسلام کو قرآن کے بارے میں یہ شبہات اُبھارنے کا موقع مل گیا کہ معاذ اللہ یہ کتاب تحریف سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اس میں جب یہ دو سورتیں ابن مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق اِلحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف و اضافے اِس کے اندر ہوئے ہوں گے۔ اِس طعن سے پیچھا چھڑانے کے لیے قاضی ابو بکر الباقلّانی اور قاضی عیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابن مسعودؓ معوذتین کی قرآنیت کے منکر نہ تھے بلکہ صرف ان کو مُصحف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک مصحف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہیے تھی جس کے ثبت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو اور ابن مسعودؓ

تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضورؐ نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے قرآنی سورتیں ہونے کا انکار کیا ہے۔ کچھ دوسرے بزرگوں، مثلاً امام نووی، امام ابن حزم اور امام فخر الدین رازی نے سرے سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی ان روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے اس کا صحیح رد کیا ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں:۔

۱۔ حافظ بزّار نے اپنی مسند میں ابن مسعودؓ کی یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اس رائے میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی اُن کے اس قول کی تائید نہیں کی ہے۔

۲۔ تمام صحابہ کے اتفاق سے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو نسخے مرتّب کروائے تھے اور خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے جن کو دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا تھا، اُن میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا جس مُصحَف پر اجماع ہے اُس میں یہ دونوں سورتیں درج ہیں۔ تنہا عبداللہؓ بن مسعود کی رائے، اُن کی جلالتِ قدر کے باوجود، اس عظیم اجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپ نے ان سورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے، اور قرآن کی سورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو ان کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں:

مسلم، احمد، ترمذی اور نسائی کے حوالہ سے حضرت عقبہؓ بن عامر کی یہ روایت ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے متعلق اُن سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نسائی کی ایک روایت عُقبہ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ابن حبّان نے

انہی حضرت عُقبہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا "اگر ممکن ہو تو تمہاری نمازوں سے اِن دونوں سورتوں کی قرأت چھوٹنے نہ پائے"۔ سعید بن منصور نے حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی مُسند میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرو۔ مُسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضور نے اُن سے فرمایا "کیا میں دو ایسی سورتیں تمہیں نہ سکھاؤں جو اُن بہترین سورتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں؟" انہوں نے عرض کیا ضرور یارسول اللہ۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہی معوذتین پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے یہی دو سورتیں اس میں پڑھیں۔ اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپ اُن کے پاس سے گزرے تو فرمایا "اے عُقب، کیسا پایا تم نے"؟ اور اس کے بعد اُن کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو ان سورتوں کو پڑھا کرو۔ مُسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں عقبہؓ بن عامر کی ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے ان کو ہر نماز کے بعد معوذات (یعنی قل ہو اللہ احد اور معوّذتین) پڑھنے کی تلقین کی، نسائی ابن مردویہ اور حاکم نے عقبہ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ سواری پر چلے جا رہے تھے اور میں آپ کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا مجھے سورۂ ہود یا سورۂ یوسف سکھا دیجیے۔ فرمایا "اللہ کے نزدیک بندے کے لیے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے"۔ عبداللہ بن عابس الجہنی کی روایت نسائی، بیہقی، بغوی اور ابن سعد نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا "ابن عابس، کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے جتنی چیزوں کے ذریعہ سے اللہ کی پناہ مانگی ہے ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں؟" میں نے عرض کیا ضرور یارسول اللہ فرمایا "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، یہ دونوں سورتیں"۔ ابن مردویہ نے حضرت ام سلمہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو یہ غلط فہمی آخر کیسے

لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآن مجید کی سورتیں نہیں ہیں؟ اِس کا جواب ہمیں دو روایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ ایک یہ روایت کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اِس طرح تعوّذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاری نے صحیح البخاری میں، امام احمد نے اپنی مُسند میں، حافظ ابوبکر الحُمیدی نے اپنی مسند میں، ابونُعیم نے اپنی المُستخرَج میں اور نسائی نے اپنی سُنَن میں زِرّ بن حُبَیش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت اُبَیؓ بن کعب سے، جو علمِ قرآن کے لحاظ سے صحابہؓ کرام میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، نقل کی ہے۔ زِرّ بن جبیش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت اُبَیؓ سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہ بن مسعود ایسا ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا قُل، تو میں نے بھی کہا قُل اس لیے ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ کہتے تھے۔" امام احمد کی روایت میں حضرت اُبَیؓ کے الفاظ یہ ہیں: "میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انہوں نے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا۔ لہٰذا ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا۔" اِن دونوں روایتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو دونوں سورتوں میں لفظ قُل (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے حضورؐ سے اِس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت اُبَیؓ بن کعب کے ذہن میں بھی اِس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انہوں نے حضورؐ سے اِس کو پوچھ لیا۔ حضورؐ نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قُل کہا تھا اس لیے میں بھی قُل کہتا ہوں۔ اِس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں"، تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" بلکہ وہ "کہو" کا لفظ ساقط کر کے "میں پناہ مانگتا ہوں" کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بالادست حاکم کا پیغام بر

اِن الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" اور یہ پیغام اُسے اپنے تک رکھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دیا جائے تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جوں کا توں پہنچائے گا، اُس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ پس اِن دونوں سورتوں کی ابتدا لفظ قُل سے ہونا اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلام وحی ہے جسے حضورؐ اُنہی الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپ کو ملا تھا۔ اِس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اِن دو سورتوں کے علاوہ ۳۳۰ آیتیں ایسی ہیں جو لفظ قل (کہو) سے شروع ہوئی ہیں۔ ان سب میں قُل کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے جسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا حضورؐ کے ذمہ فرض تھا جن الفاظ میں یہ آپ پر نازل کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر جگہ قُل اگر ایک حکم ہوتا تو حضورؐ اس لفظ کو ساقط کرکے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا، اور اُسے قرآن میں درج نہ کیا جاتا بلکہ حضورؐ صرف اس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا۔

اس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ صحابۂ کرام کو بے خطا سمجھنا اور اُن کی کسی بات کے لیے غلط کا لفظ سُنتے ہی توہینِ صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بے جا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چوک ہوگئی۔ ایسی چوک اگر اتنے عظیم مرتبہ کے صحابی سے ہوسکتی ہے تو دوسروں سے بھی کوئی چوک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لیے اُس کی چھان بین بھی کرسکتے ہیں، اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انہیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہوگا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر اُن پر زبانِ طعن دراز کرے۔ اِنہی معوّذتین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابن مسعودؓ کی رائے کو غلط کہا ہے، مگر کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کرکے معاذاللہ وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضورؐ پر جادو کا اثر ہونا

دوسرا مسئلہ جو اِن سورتوں کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی رو سے حضورؐ پر جادو کیا گیا تھا، اور اس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے تھے، اور اس اثر کو دور کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے آکر

آپ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اِس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مشتبہ ہو جاتی ہے کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا، اور ان روایات کی رو سے ہو گیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوایا اور کروا لیا ہو، اور اُس کی دی ہوئی تعلیم میں کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیر اثر۔ یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جادو ہی کے ذریعہ سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اُس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ اُن کا استدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور، یعنی سحر زدہ آدمی ہے (يَقُولُ الظّٰلِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا۔ بنی اسرائیل ۴۷) مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اِس مسئلے کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مستند تاریخی روایات کی رو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کیے گئے ہیں؟

قرونِ اولیٰ کے مسلمان علماء کی یہ انتہائی راستبازی تھی کہ انہوں نے اپنے خیالات اور مزعومات کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جوں کا توں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ اِن حقائق سے اگر کوئی اُلٹے نتائج نکالنے پر اتر آئے تو اُن کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اُس کے کام آ سکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مستند اور کثیر تاریخی ذرائع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحبِ علم کے لیے نہ تو یہ درست ہے کہ وہ اِس بنا پر تاریخ کا انکار کر دے کہ اُس کو مان لینے سے اُس کے نزدیک فلاں فلاں قباحتیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ یہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے اس کو قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اُس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے اُس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو

تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اُس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے اور علمی تنقید سے اُس کو اگر غلط ثابت کیا جا سکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسے حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ارقمؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، امام احمدؒ، عبدالرزاق، حمیدی، بیہقی، طبرانی، ابن سعد، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ، حاکم، عبد بن حُمید وغیرہ محدثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اُس کا نفس مضمون تواتر کی حد کو پہنچا ہوا ہے، اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خبرِ واحد ہے۔ اِس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انہیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مرتب کر کے ایک مربوط واقعہ کی صورت میں یہاں درج کرتے ہیں۔

صلح حُدَیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لَبید بن اعْصَم سے ملا جو انصار کے قبیلہ بنی زُرَیق سے تعلق رکھتا تھا[۱] ان لوگوں نے اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے اُن پر جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو، لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کر دو۔ اس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اُس سے ساز باز کر کے اِن لوگوں نے حضورؐ کی

---

[۱] بعض راویوں نے اُسے یہودی کہا ہے، اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زُرَیق میں سے تھا، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ بنی زُرَیق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خَزْرج میں سے انصار کا ایک قبیلہ تھا۔ اس لیے یا تو وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اہل مدینہ میں سے یہودی ہو گئے تھے، یا یہود کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کر لیا۔ تاہم اس کے لیے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا، بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال اِن دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف[1] میں رکھ کر لبید نے بنی زُرَیق کے کنوئیں ذَرْوان یا ذی اَرْوان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیرِ مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے، اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے، حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اُس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اُس زمانے میں آپ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپ نے غلط پڑھ ڈالی ہو، یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو، یا کوئی ایسا کلام آپ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملکِ عرب اس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کر سکی تھی اُسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپ کی حیثیتِ نبوت اِس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی

---

[1] ابتدا میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر ہوتا ہے۔ اور نر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور اس کی بو انسان کے مادۂ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

میں آپ اپنی جگہ محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آگئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتادی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لبید بن اعصم نے۔ پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زریق کے کنوئیں ذی اروان (یا ذروان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کے لیے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کنوئیں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اُس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت زبیر کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جُبیرؓ بن ایاس الزُرقی اور قیسؓ بن محصن الزُرقی (یعنی بنی زُریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کر لیا گیا۔ اُس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپ معوّذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں، ساری سوئیاں نکل گئیں، اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپ نے لَبید کو بلا کر بازپرس کی۔ اُس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا، کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اِس معاملہ کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

یہ ہے سارا قصہ اِس جادو کا۔ اِس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپ کے منصبِ نبوّت

میں قادح ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ کو زخمی کیا جا سکتا تھا جیسا کہ جنگِ احد میں ہوا، اگر آپ گھوڑے سے گر کر چوٹ کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپ کو بچھو کاٹ سکتا تھا، جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، یہ بات تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انہوں نے ہزارہا آدمیوں کے اُس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا (سَحَرُوٓا اَعْیُنَ النَّاسِ۔ آیت ۱۱۶) اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اُن کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں اور اس سے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو تم ہی غالب رہو گے، ذرا اپنا عصا پھینکو (فَاِذَا حِبَالُھُمْ وَعِصِیُّھُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ اَنَّھَا تَسْعٰی ہ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ہ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ہ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ آیات ۶۶ تا ۶۹) رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفارِ مکہ کے اُس الزام کی تصدیق ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے کہ آپ کسی جادوگر کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اِس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے معاذاللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اِسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملہ پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمدؐ پر ہوا تھا، نبوتِ محمدؐ اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ جادو کو محض اوہام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں اُن کی یہ رائے صرف اِس وجہ سے ہے کہ جادو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، مگر سائنٹفک

طریقہ سے یہ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیسے رونما ہوتی ہیں۔ اِس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اُسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، مگر انسان کا نفس اور اُس کے حواس اُس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے حضرت موسیٰ کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں، لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انہیں سانپ ہی محسوس کیا، اور حضرت موسیٰ تک کے حواس جادو کی اِس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِسی طرح قرآن (البقرہ، آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابِل میں ھاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اِس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا موثر ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزارہا سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہے اس کے وجود کو جھٹلا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

تیسرا مسئلہ اِن سورتوں کے معاملہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود موثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اسلیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ ہر رات کو سوتے وقت، اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں معوّذتین یا بعض روایات کے مطابق معوّذات (یعنی قل ہو اللہ اور معوّذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انھیں

پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہ رضؓ نے یہ سورتیں (بطورِ خود یا حضورؐ کے حکم سے) پڑھیں اور آپ کے دستِ مبارک کی برکت کے خیال سے آپ ہی کے ہاتھ لے کر آپ کے جسم پر پھیرے۔ اس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، مؤطا امام مالک میں خود حضرت عائشہ سے مروی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضورؐ کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اِس معاملہ میں پہلے مسئلۂ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہ لوگ بلاحساب جنّت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں، بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (مسلم) حضرت مغیرہ رضؓ بن شُعبہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکّل سے بے تعلق ہو گیا (ترمذی)، حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوّذتین یا معوّذات کے (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن حبان، حاکم)، بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا، لیکن بعد میں اِس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے، اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلۂ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طبرانی نے صغیر میں حضرت علی رضؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ، قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ

بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے جاتے تھے۔

ابن عباس کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے اُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ "میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظرِ بد سے" (بخاری، مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ)

عثمان بن ابی العاص الثقفی کے متعلق مسلم، مؤطا، طبرانی اور حاکم میں تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھ جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ، "میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اُس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے۔" مؤطا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مُسند احمد اور طحاوی میں طلقؓ بن علی کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا، حضورؐ نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریلؑ نے آکر پوچھا "اے محمدؐ، کیا آپ بیمار ہو گئے؟" آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے کہا بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِاسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ "میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں ہر اُس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپ کو شفا دے، میں اُس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں۔" اسی سے ملتی جلتی روایت مُسند احمد میں حضرت عُبادہ بن صامت سے منقول ہے کہ حضورؐ بیمار تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو آپ کو سخت تکلیف میں پایا، شام کو گیا تو آپ بالکل تندرست تھے، میں نے اس قدر جلدی تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو

فرمایا کہ جبریلؑ آئے تھے اور انہوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سُنائے جو اوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے بھی مسلم اور مُسند احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں حضرت حفصہؓ ام المومنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شفاؓ[1] نامی بیٹھی تھیں جو نملہ (ذُباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا حفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شفاؓ بنت عبداللہ کی یہ روایت امام احمدؒ، ابوداوٗد اور نسائی نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے نملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عوفؓ بن مالک اشجعی کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملہ میں حضورؐ کی رائے کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مضائقہ نہیں ہے جب تک اُس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مُسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کاٹے کو جھاڑتے تھے۔ مگر آپ نے اِس کام سے منع فرما دیا ہے۔ پھر انہوں نے وہ چیز آپ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔ آپ نے فرمایا "اِس میں تو کوئی مضائقہ میں نہیں پاتا، تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے۔" جابر بن عبداللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضورؐ نے ان کو اس کی اجازت دیدی۔

---

[1] ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شفاؓ بنت عبداللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عدی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اِس طرح یہ حضرت حفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

اس کی تائید مسلم، مسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضورؐ نے انصار کے ایک خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مسند احمد اور ترمذی اور مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حضورؐ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذباب کے مرض اور نظرِ بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عمیرؓ مولیٰ ابی اللحم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا فلاں فلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مؤطاء میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ اُن کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر توراۃ یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تو تب بھی یہ جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ حضورؐ نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبی معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسمائے حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے، یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبی امداد میسر نہ ہو اللہ ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے کلام اور اسماء و صفات سے استعانت کی جائے تو یہ مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے[1] البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو،

---

[1] مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رجوع الی اللہ مریضوں کی

(باقی صفحہ آئندہ پر)

جہاں وہ میسر ہو، جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مطب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنالیں۔

اس معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابوسعید رضؓ خدری کی اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی، مُسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابن عباس رضؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابوسعید رضؓ خدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستے میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھیرے اور انہوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھّو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ ان مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابوسعید نے کہا ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعید نے جا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
شفایابی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مثانے میں آ کر اڑ گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو ہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور ۲۰ برس تک ہٹی رہی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب سنہ ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کئی مہینے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دُعا کی جو سنہ ۱۹۴۸ء میں کی تھی اور کسی علاج اور دوا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہو گئیں۔ آج تک پھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لعابِ دہن اس پر ملتے گئے۔[1] آخر کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں مگر ان حضرات نے آپس میں کہا اِن بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آسکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصہ بھی لگاؤ۔"

لیکن اِس حدیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابو سعید خدری نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصہ بھی لگاؤ، تا کہ اس کے جواز و عدمِ جواز کے معاملہ میں اِن اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دوکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورد و نوش خرید سکے۔ اِن حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اِس سے انکار کے معنی بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اِس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اِسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تو ان کے سردار کا علاج کرنے سے انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کا کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کا بھروسے پر سورۂ فاتحہ اُس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہو گیا تو طے شدہ اجرت قبیلے

---

[1] اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابو سعید تھے۔ بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ ابو سعید خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

والوں نے لا کر دے دی اور حضورؐ نے اس اجرت کے لینے کو حلال و طیب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی جو روایت ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللهِ یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمہارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حق تبلیغ بھی ادا ہو گیا کہ انہیں اس کلام کی برکت معلوم ہو گئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس واقعہ کو اُن لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جا سکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انہوں نے وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمہ سلف کے ہاں نہیں ملتی۔

سورۂ فاتحہ اور ان سورتوں کی مناسبت

آخری چیز جو معوذتین کے بارے میں قابلِ توجہ ہے وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآن مجید ترتیبِ نزول پر مرتب نہیں کیا گیا ہے، مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خود نہیں بلکہ اُن کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مرتب فرمایا جس میں اب ہم اس کو پاتے ہیں۔ اس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوذتین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آغاز میں اللہ رب العالمین، رحمان و رحیم اور مالک یوم الدین کی حمد و ثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو رب الفلق، ربّ النّاس، مَلِكُ النّاس اور اِلٰہُ النّاس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خصوصیت کے ساتھ شیاطینِ جن و انس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہِ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔